قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

مارچ 2013، قیمت-/15

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

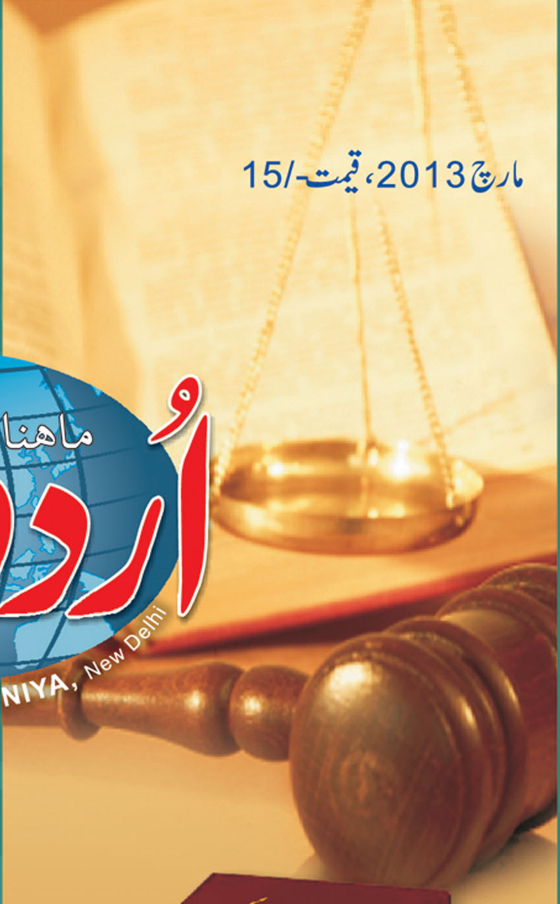

ہندوستانی آئین اور اردو

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
جلد:15 ،شمارہ:03 ، مارچ 2013

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر: نصرت ظہیر
ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا
انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: منظر سبحانی
قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے
■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت: 49539009)
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194- 040

اداریہ
ہماری بات 2

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3

انٹرویو
ستیہ پال آنند — مناظر عاشق ہرگانوی 7

خراجِ عقیدت
حنیف نقوی کی جاسوسیاں — شمس الرحمٰن فاروقی 10

کور اسٹوری
ہندوستان کے آئین میں اردو کی حیثیت — انوار الیقین 14
جمہوری ہندوستان میں اردو کا منظر نامہ — خواجہ عبدالمنتقم 17
دستورِ ہند کے دائرے میں اردو ... — محمد عبدالقدیر 23

زبان و تعلیم
اردو میں دوسری زبانوں سے ترجمے ... — قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی 25
مغربی بنگال میں اردو زبان — محمد زاہد 27

ادبی مباحث
علی گڑھ تحریک اور اردو تنقید — ستار ساحر 29
احمد فراز کی غزل میں انسانی قدریں — محمد مسعود اطہر خاں 31
روہیل کھنڈ کی ادبی و شعری روایت — فرقان سنبھلی 33
اقبال فلسفہ سے مذہب تک — کوثر رسول 37

مشاہیر ادب/نظم
مومن کی شخصیت — ظفر اللہ انصاری 40
انتخاب کلام مومن 43

مشاہیر ادب/نثر
شفیق الرحمٰن — ادارہ 46
ریویو — شفیق الرحمٰن 47

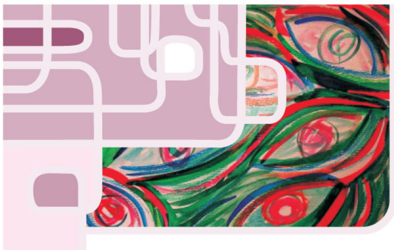

ہم نے جنھیں بھلا دیا
بہزاد لکھنوی — ترجمہ: شاہد اختر 52

ہماری مطبوعات
لوک گیتوں کی زبان اور مضامین — اطہر علی فاروقی 54

تہذیب و ثقافت
پیغام سرمدی کی جولانگاہ: سرزمین پنجاب — اختر الواسع 58

تاریخ کی تعریف اور ... — ریحانہ سلطانہ 60

کیریئر گائڈ
نئی نسل کے کیریئر کا مسئلہ ... — راغب اختر 63

دوسری زبانوں سے
ماں اور موبائل (ہندی کہانی) — سدرشن وشسٹ
مترجم: رشدہ خاتون 65

ماحولیات
ماحول کا تحفظ اور طلبا کی ذمے داریاں — جاوید احمد کامٹوی 69

سنیما
ہندوستانی سنیما اور ڈاکیومنٹری فلمیں — خالد جاوید 71

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 74

اردو کیمپس
یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں — ادارہ 82

عالمی اردو نامہ — ادارہ 84

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 85

ہماری بات

ہندوستانی آئین میں اردو زبان کو وہی حقوق حاصل ہیں جو قومی حیثیت رکھنے والی، اس ملک کی دیگر علاقائی زبانوں کو دیے گئے ہیں۔ نہ ان سے کم نہ ان سے زیادہ۔ چنانچہ کئی لوگ اسے اردو کی حق تلفی مانتے ہیں۔ ان کی دلیل ہے کہ اردو کا لسانی علاقہ کوئی ایک صوبہ یا ریاست نہیں ہے، اس کے بولنے والے کم و بیش پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ کئی ماہرین لسانیات اسے ملک میں قومی رابطے کی زبان یعنی لنگوا فرانکا بھی مانتے ہیں۔ لہٰذا وہ اردو کو اس کا بھی مستحق سمجھتے ہیں کہ اسے، بنگالی، آسامی، مراٹھی، پنجابی، ملیالم، تمل، تیلگو اور اڑیہ وغیرہ جیسی ان زبانوں کے زمرے سے الگ جگہ ملنی چاہیے جو زیادہ تر اپنے ہی علاقوں میں بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہیں۔ اس دلیل میں وزن اور جواز بھی ہے۔ کئی صوبوں کی حکومتیں اردو کو اپنے علاقے کی خاص زبان نہ مان کر نظر انداز کر دیتی ہیں اور مرکز میں کئی شعبے اسے علاقائی زبان کہہ کر قومی نوعیت کی مراعات سے محروم کر دیتے ہیں۔ اس طرح اردو کو نہ یہاں پوری مراعات ملتی ہیں نہ وہاں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کئی حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ بھی اٹھنے لگا ہے کہ اردو کو ہندی کے بعد ان ہی خطوط پر دوسری قومی زبان کا درجہ دیا جانا چاہیے جن پر چل کر ملک کی نصف درجن سے زائد ریاستوں نے اسے دوسری ریاستی اور سرکاری زبان کا درجہ دے رکھا ہے۔ اس سے اردو کو واقعتاً کوئی فائدہ پہنچے گا یا نہیں، یہ امر بحث طلب ہے۔

تاہم تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ ہندوستانی آئین نے بے شک اردو کو علاقائی زبان کا درجہ دیا ہے لیکن گزشتہ ساٹھ سے زائد برسوں میں ہندوستانی آئین کی گود میں جس جمہوری نظام نے پرورش پائی ہے، اس کے تحت اردو آج عملی طور پر علاقائی زبان کے درجے سے اوپر اٹھ چکی ہے۔ اس کی ایک قومی یونی ورسٹی موجود ہے۔ اس کی تعلیم و تدریس کا دائرہ کسی قدر سست رفتار سے ہی سہی لیکن مجموعی طور سے پورے ملک میں وسیع ہو رہا ہے۔ ہندوستانی سنیما، مشاعرے اور نیم کلاسیکی موسیقی کی محفلیں اور غزلوں کے ریکارڈ و البم اردو کے لہجے اور لفظیات کو پورے ملک میں قابل فہم اور قابل قبول بنا رہے ہیں۔ ورنہ ایک زمانہ تھا جب پرسار بھارتی کے اکابرین دیگر علاقائی زبانوں کے ٹی وی چینلوں کی طرح چوبیس گھنٹوں کا اردو چینل چلانے کی تجویز یہ کہہ کر مسترد کر دیا کرتے تھے کہ اردو کسی علاقے کی زبان نہیں ہے۔ لیکن جمہوری نظام کے جمہوری تقاضوں نے بالآخر انھیں قائل کیا اور آج ڈی ڈی اردو، دوردرشن کا ایک مقبول ٹی وی چینل بن کر ابھر رہا ہے۔ اسی جمہوری نظام نے ملک بھر میں فروغ اردو کے سب سے بڑے قومی اردو ادارے، قومی اردو کونسل کے بجٹ اور اس کی سرگرمیوں میں اضافے کو بھی ممکن بنایا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت تو اردو کے لیے اپنی سطح پر کچھ نہ کچھ کر ہی رہی ہے، ہم اردو والے اپنی سطح پر اپنی زبان کی ترویج کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ کیا ہم اسکولوں میں اپنے بچوں کو اردو پڑھانے پر زور دیتے ہیں۔ کیا ہم اپنے گھروں میں اردو کے اخبار لازمی طور پر منگاتے ہیں۔ کیا ہم اردو کتابیں اور رسائل خرید کر پڑھتے ہیں۔ کیا ہم اپنی دوکانوں اور عبادت گاہوں کے سائن بورڈ اور اطلاع نامے اردو میں تحریر کراتے ہیں۔ کیا ہم اپنے کیبل ٹی وی آپریٹر سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے چینلوں میں ڈی ڈی اردو ضرور دکھائے، جس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں قانوناً اس کے خلاف مقامی تھانے میں ایف آئی آر درج کرائی جا سکتی ہے اور وہ گرفتار ہو سکتا ہے۔ کیا ہم شادی بیاہ کے دعوت نامے اردو میں لازماً چھپواتے ہیں۔ یعنی کل ملا کر یہ کہ کیا ہم نے اردو کو واقعی اپنی روزمرہ زندگی سے جوڑ رکھا ہے۔ یہ سوال ہمیں اپنے آپ سے ہر روز کرتے رہنا چاہیے اور تب تک کرتے رہنا چاہیے جب تک ہم سربلندی کے ساتھ کوئی جواب دینے کے لائق نہ بن جائیں۔ ورنہ دوستو! حقیقت یہ ہے کہ کئی علاقوں میں اب قبرستانوں سے بھی اردو غائب ہوتی جا رہی ہے۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

کرشن بھاوک
گورونانک نگر، گلی نمبر K-18، کوٹھی نمبر A-201، پٹیالہ

'اُردو دنیا' فروری کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ یہ جس آب و تاب کے ساتھ درخشاں شکل و صورت میں شائع ہوا ہے اس کے لیے آپ بحیثیت مدیر گرامی بذات خود اور آپ کے معاون کارکن کی محنت و مشقت کاملاً جا بہ جا منہ سے بول رہی ہے۔ اس شمارے میں ویسے تو تمام مضمون جاندار و شاندار ہیں، لیکن نصرت ظہیر کی، ہمہ سمت شخصیت کے مالک فنکار و دیدہ ور شاعر جناب گلزار کے ساتھ ملاقات میں تمام معلوماتی سوالات اور موضوع کے بموجب ان کے معقول جوابات بھی اردو سے ان کی بے پناہ محبت کے مظہر ہونے کے علاوہ فقط انھیں کا حصہ ہوسکتے ہیں۔ دستاویزی حیثیت کے اس شمارے میں مجھے چھوڑ کر تمام علما و فضلا کے فکرانگیز مضامین فلمی صنعت کو مزید مہمیز کرنے والے بھی ثابت ہوتے ہیں۔ اگرچہ مجلّے کے تمام کارکن کی رات دن کی پس پردہ ہوئی محنت و مشقت اور تگ و دو شمارے کے سبھی مضامین میں ہمہ جا منعکس ہوتی ہے، تاہم اس میں چند باتوں کا رہ جانا عین ممکن اور قدرتی ہی ہے۔ مثلاً 'اسکرپٹ اور ڈائیلاگ رائٹر' کے مختصر تعارف کنندہ مضمون میں مکالمہ نویس راجیندر سنگھ بیدی، اختر الایمان، خواجہ احمد عباس، سعادت حسن منٹو (فلم 'کسان کنیا') کی مکالمہ نویسی کی بابت بھی چند سطور درکار تھیں۔ اسی طرح ''ہم فلم والے اردو زبان کو جیتے ہیں'' جیسا تاریخی و دستاویزی حیثیت کا بیان دینے والے اور ہر ایک فلم میں 'بھارت' موسوم اور مو بہ مو حب الوطنی کے جذبات میں شرابور اداکار و ہدایت کار شری منوج کمار کی تصویر کہیں بھی شائع ہونے سے نادانستہ رہ گئی ہے۔ البتہ ہندی کے موقر مجلّہ 'سمیانتر' سے ماخوذ مضمون کے اصل مصنف جواری مل پارکھ مترجم ڈاکٹر محمد ہادی رہبر دونوں کے مقالے سے واقعی 'ہندوستانی سینما کا ارتقا' تفصیل سے نشان زد ہوگیا ہے۔ ہند میں مروجہ لفظ 'متھک' اور انگریزی لفظ Myth کے معنی میں نیا لفظ 'دیومالائی' نہایت ہی خوبصورت ہونے کے موجب پسند آیا۔ ہندوستانی فلموں سے متعلق متعدد کتابیں لکھ کر مقبولِ عام مصنف انیس امروہوی کا مضمون تو بلاشک قابلِ مدح ہے۔ ان کے ہمراہ کثرت میں یگانگت کے مظہر اس ملک میں بقول سرشار سیلانی ''چمن میں اختلافِ رنگ و بو سے بات بنتی ہے''، باقی مضامین میں بھی بہتات میں یکسانیت کی نشان دہی کرنے والے جناب سہیل اختر خان، شہباز حسیبی اور

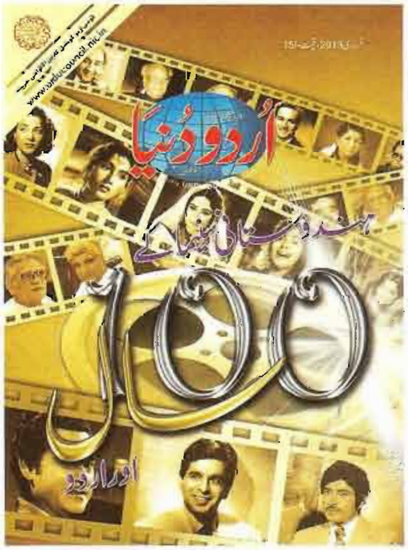

مظہر حسنین کے مضامین بھی قابلِ ستائش ہونے کے موجب بارہا مبارک باد کے ہی مستحق ٹھہرتے ہیں۔ اگر فقط تین الفاظ میں ہی اس شمارے کی حصولیابیوں کو مقید کرنا ہو تو مجھے بغیر کسی استثنا کے یہ کہنے میں کوئی دریغ نہیں ہے کہ یہ شمارہ 'سینما کا سمندر' ہے!

سید معین الدین علوی (علیگ)
A-4/597 میڈیکل کالج روڈ، علی گڑھ

'اردو دنیا' فروری 2013 کا شمارہ جو کہ 'ہندوستانی سینما کے سو سال اور اردو' پر مشتمل ہے، نظر نواز ہوا۔ یوں تو اس میں شامل تمام مضامین نہایت معلوماتی، دلچسپ اور حقیقت سے قریب ہیں لیکن پھر بھی کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ اُن پر بہت زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ نتیجتاً تشنگی برقرار رہتی ہے۔ میرا اشارہ اس وقت خاص طور پر موسیقار اعظم، نوشاد پر لکھے گئے مضمون کے ساتھ ساتھ پیش کیے گئے باقی موسیقاروں کے سوانحی کوائف کی طرف ہے جنھیں آپ کے ادارتی شعبے نے ترتیب دیا ہے (صفحہ 48 سے 53 تک) بڑی حیرت کی بات ہے کہ اُس زمانے کے عظیم موسیقار کھیم چند پرکاش، جنھوں نے لتا منگیشکر کی آواز میں لازوال گیت 'آئے گا آنے والا' کی دھن ترتیب دی، کی فلموں کے نام نہیں شائع کیے گئے۔ اس کے علاوہ انل بسواس کو، جن کی فلمیں جیسے کہ آرزو، لاجواب، ہمدرد، ترانہ اور وارث ہیں کو بھی نظرانداز کر دیا گیا۔ وسنت ڈیسائی جن کی جھنک جھنک پایل باجے، دو آنکھیں بارہ ہاتھ، گونج اٹھی شہنائی، آشیرواد، گڈی اور اچانک وغیرہ داد حاصل کر چکی ہیں، کا ذکر بھی ندارد۔ موسیقار روی کی گمراہ، کاجل، ہمراز، نکاح، آنکھیں، وقت اور چودھویں کا چاند کا بھی کہیں ذکر نہیں ہے۔ قوالی کے عظیم خالق روشن کی برسات کی رات، آرتی، نوبہار، انہونی، شیشم، دل ہی تو ہے، تاج محل، ممتا اور نور جہاں کے متعلق بھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ جے دیو اور او پی نیر کا ذکر نہیں۔ مدن موہن، خیام، ایس ڈی برمن، سی رام چندر، ہیمنت کمار، شنکر جے کشن وغیرہ کا ذکر ہے تو ان کی کئی اہم فلموں کے نام چھوڑ دیے گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ محض خانہ پری کے لیے حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔ اگر تھوڑی سی کوشش اور کی جاتی تو یہ معلومات دستاویزی شکل اختیار کر سکتی تھی۔

مراسلہ نگار نے صرف موسیقی کے شعبے کا ذکر کیا ہے جب کہ اس خاص نمبر میں سینما کے دوسرے پہلوؤں کو شامل کرنا اور ان سے متعلق نمائندہ شخصیتوں کا ذکر بھی مقصود

تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض چیزیں اس نمبر میں چھوٹ گئی ہیں لیکن بہت کچھ دیا بھی گیا ہے۔ مراسلے میں مذکور کئی نام اور فلمیں دیگر مضامین میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔ بلکہ مراسلے میں بھی موسیقی کی کئی شخصیتوں کا ذکر چھوٹ گیا ہے۔ ہم نے 'ہندوستانی سنیما کے سو سال اور اردو' کے بنیادی موضوع پر یہ نمبر ترتیب دیا ہے۔ فلموں کی انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنا ہمارا مقصد نہیں تھا۔ مراسلہ نگار نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ (ادارہ)

ک۔ ملک العزیز

چینئی

فروری 2013 کا 'اردو دنیا' نظر نواز ہوا۔ جس عرق ریزی کے ساتھ آپ نے مضامین جمع کیے ہیں، وہ قابلِ صد تحسین ہیں۔ خود اردو والوں کی نوجوان نسل فلمی صنعت میں اردو کے کردار سے ناواقف ہے۔ اردو کے زاویہ سے فلمی دنیا کی ایک مبسوط دستاویز تیار ہوگئی ہے۔ نصرت ظہیر، شمع زیدی، انیس امروہی، رضوان الحق، سہیل اختر خان، کرشن بھاوک کے مضامین فلمی صنعت میں اردو شاعری و ادب کی بنیادوں کو واضح کیا ہے جب کہ ساحر لدھیانوی پر ثمینہ پروین، نوشاد علی پر محمد نثار، لتا منگیشکر پر قاسم انصاری، دلیپ کمار پر زبیر رضوی اور مغل اعظم پر نصرت ظہیر کے مضامین معلومات سے بھرپور ہیں، بلکہ ان کے بہت سارے کوائف 1960 اور 1970 کی دہائیوں کے دوران نوجوان رہی نسلوں کے لیے بھی دلچسپ معلومات فراہم کراتے ہیں۔ لتا منگیشکر کا اردو سیکھنا بھی ایک خوشگوار واقعہ ہے۔ بہت پہلے ایک انگریزی روزنامہ میں لتا جی کا انٹرویو پڑھا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ نوشاد صاحب جب اپنے گانوں کی ریکارڈنگ کے لیے لتا جی کو بلایا تو کافی دیر تک تحت اللفظ میں لتا جی سے گیت پڑھواتے تھے اور تلفظ کی اصلاح کے بعد دُھن سناتے تھے۔ آخر میں بس اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ فلمی دنیا کی اردو دنیا ہمارے ماضی کا ایک رنگین باب ہے، حال میں تھوڑی بہت مایوسی سہی، ایک بہترین مستقبل کی تعمیر کے لیے اردو کا ہر ادنیٰ سپاہی اس مہم میں جٹ جائے اور پوری اردو قوم کو اردو رسم الخط سے آشنا کرادے۔

ہے جب ہندوستانی فلموں کو ہندی فلم کا نام دیا جاتا ہے یا کوئی جب کہتا ہے کہ فلاں ہندی فلم بہت اچھی ہے، اس عمل سے واقعی تعصب کی بو آتی ہے، مگر اردو ایک ایسی ہمہ جہت زبان ہے جو اپنی ترقی میں کسی کی محتاج نہیں ہے، اس نے ابتدا سے ہی اپنے بل بوتے پر ترقی کے منازل طے کیے ہیں اور آئندہ بھی اردو کی ترقی کی راہ خود بخود ہموار ہوتی رہے گی۔ 5 فروری 2013 کو 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی جس کو میں لفظوں میں نہیں بیان کرسکتا ہوں، کیونکہ نہ صرف اس میں فلموں پر بحث کی گئی ہے بلکہ اردو ادب سے بالی ووڈ فلموں کا جو تعلق ہے اس کے سارے گوشے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے، یہ رسالہ نہ صرف اس وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ فلمی دنیا کی معلومات سے پر ہے بلکہ اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اردو کا فلمی دنیا کے ساتھ قدیم رشتہ رہا ہے وہ صد فیصد یقین میں تبدیل ہوجاتا ہے اور مستقبل میں بھی یہی امید رہے گی۔ اردو کے بڑے فکشن نگاروں کے افسانوں پر بھی فلمیں بنائی گئی ہیں، جن میں منشی پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور منٹو کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، اس طرح ہندوستانی سنیما اور اردو ادب کا گہرا رشتہ ہے، جس کے بغیر بالی ووڈ فلم کا سفر جاری رکھنا ناممکن ہے، اور اس کے ساتھ ہی ہندوستانی فلموں کے گانوں کو اردو کے شیریں اور مترنم الفاظ سے بقا و دوام بھی ملی اور اکثر ناظرین فلمی گانوں کو گنگناتے بھی ہیں، جب ہم بالی ووڈ فلم پر نظریں ڈالتے ہیں تو اس میں اردو شعرا اور ادیبوں کی ایک لمبی فہرست ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے، اس کے بعد ہر وہ شخص جو عقل سلیم رکھتا ہے اس بات پر حیرت اور تعجب کرے گا کہ آخر ایسی کون سی چیز ہے جو اس کو ہندی فلم کہنے پر مجبور کرتی ہے جب کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے، جو بھی گانے اور مکالمے ان فلموں میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ سب اردو کی فلم ہونے کی بہترین مثال ہیں۔ اسی طرح 'ہیر رانجھا'' کیفی اعظمی کی نظم ہے جس کو توڑ کر قافیہ دار مکالمہ بنا گیا ہے، اگر اس کے باوجود اردو فلم کے بجائے ہندی فلم کا نام دیا جائے تو افسوس کی بات ہے، جب کہ گلزار کے مطابق فلمی زبان 90 فیصد اردو ہے۔

نے حوصلہ افزائی کی۔ اس کے لیے بہت بہت شکریہ!
ماہنامہ 'اردو دنیا' فروری 2013 کے سرورق پر لکھا ہوا 'ہندوستانی سنیما کے 100 سال اور اردو' نیز ہندوستانی سنیما کے متعلقین کی چھپی خوبصورت تصویروں کے ساتھ شمارہ نظر نواز ہوا۔ ہماری بات کے موضوع پر مدیر صاحب کا کہنا روز روشن کی طرح عیاں ہے ''کہ آج اگر قوم ہندوستانی سنیما کی پہلی صدی مکمل ہونے کا جشن منا رہی ہے تو یہ اردو کی بھی ایک اور صدی کا جشن ہے''۔ ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور اردو زبان سے ہندوستانی سنیما کا کتنا گہرا تعلق رہا ہے اس شمارے کے تمام مضامین میں اس کی جھلک موجود ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو قلم کاروں کی کاوشوں اور محنتوں سے ہندوستانی سنیما کی ترقی ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کی بھی ترقی ہوئی۔ آج اردو ہندوستانی سنیما کا ایسا جز بن چکی ہے جسے جدا کرنا ناممکن ہے۔ ابتدائی دور میں جس طرح سے ہندوستانی سنیما کو اردو کی ضرورت تھی اسی طرح آج بھی بنی ہوئی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج ہمارے ملک کے مخلوط معاشرے میں جو زبان اردو کے نام سے بولی جارہی ہے اس کو باقی رکھنے میں ہندوستانی سنیما کا بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ شمع زیدی کا مضمون 'ہندوستانی سنیما اور مسلمان' میں بالی ووڈ فلموں کے متعلق جو لکھا گیا ہے وہ بجا ہے کہ زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے کچھ بالی ووڈ فلم سازوں نے خیالی مسلم کرداروں کے تئیں ایسا نظریہ اپنایا ہے جیسے مسلمان ملک کا دشمن ہے۔ کرداروں میں تبدیلی کی جھلک ایسی ہوگئی ہے جیسے اسلام کا مطلب جہاد اور مسلمان کا مطلب دہشت گرد یہ تشویش ناک امر ہے۔ اگر ہم غور کریں تو پہلے ایسا نہیں تھا۔ ہندوستانی سنیما کے سبھی کردار سیکولر اور انسان دوستی کا پیغام دینے والے تھے اور ان سے محبت اور اخوت کا درس ملتا تھا۔ نصرت ظہیر کا گلزار صاحب سے لیا گیا انٹرویو بہت ہی دلچسپ ہے۔ انیس امروہی کا مضمون 'ہندوستانی سنیما اور اردو ادب' زین شمسی کا مضمون 'ہندوستانی سنیما اور قومی سیاست' بہت خوب لکھا گیا ہے۔ دیگر تمام مضامین بھی بہت خوب اور بہترین انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ عالمی اردو نامہ میں ڈاکٹر محمد جہانگیر وارثی سے عبدالحی کی خصوصی گفتگو اچھی لگی۔

شاداب اختر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اردو ادب اور ہندوستانی فلمی سنیما کا دیرینہ تعلق رہا ہے اور مستقبل میں بھی رہے گا، مگر افسوس اس وقت ہوتا

الحاج شفیق احمد

استاد مدرسہ انوار العلوم، رامنگر، ضلع بارہ بنکی (یو پی)

ماہنامہ 'اردو دنیا' فروری 2013 کے شمارے میں احقر کے خط کو آپ کی بات میں شامل کرتے ہوئے آپ

محمد صغیر

پرائمری اسکول، اشوک پور چاچو سرائے، ضلع بارہ بنکی

ماہ نامہ 'اردو دنیا' فروری 2013 کا شمارہ آپ نے بڑے ہی خوب صورت انداز میں شائع کیا ہے۔ پورے

شمارے کا خاص موضوع ہی ہندوستانی سنیما کے سو سال اور اردو ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اردو کسی مذہب کی زبان نہیں یہ تو ہم وطنوں کی مادری زبان ہے جسے ہندوستانی زبان کہتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ

عرب سے جو آئی زباں میں نہیں ہوں
فقط اک زبانِ مسلماں نہیں ہوں
کوئی جاکے میرے عدو سے یہ کہہ دے
یہ میرا مکاں ہے میں مہماں نہیں ہوں

اردو سنیما کے سو برس مکمل ہونے پر جس طرح سے فلمی دنیا میں ایک جشن ہے اسی طرح سے اردو کا بھی ایک اور صد سالہ جشن ہے۔ کیونکہ اردو نے ابتدا سے آج تک ہندوستانی سنیما میں اپنی موجودگی کو بنائے رکھا ہے اور روز بروز ترقی کی راہ پر گامزن رہی ہے۔ گلزار صاحب کا یہ کہنا کہ فلمی زبان 90 فیصد اردو ہے پوری طرح سچ ہے۔ اردو زبان نے ہی ہندوستانی سنیما کو بلندیوں تک پہنچایا ہے۔ اس شمارے کے تمام مضامین کا انتخاب بہت اچھے انداز میں کیا گیا ہے۔ خاص طور سے شمع زیدی کا مضمون ہندوستانی سنیما اور مسلمان، ومظہر حسنین کا مضمون مشترکہ تہذیب اور اردو معاشرہ بہت اچھا لکھا گیا ہے۔ ثمینہ پروین کا مضمون فلمی نغموں کا جادوگر ساحر لدھیانوی اور شبنم پروین کا مضمون گلوکاری میں اداکاری کا حرف اول محمد رفیع پڑھا بہت اچھا لگا۔ ہندوستانی سنیما کی عظیم گلوکارہ لتا منگیشکر اور اردو پر قاسم انصاری کا مضمون بھی بہت اچھا لکھا ہوا ہے۔

ڈاکٹر معصوم شرقی

63/2، بارہ پاڑہ، پوسٹ آفس آر ایل بی لین
24 پرگنہ (این) مغربی بنگال

طویل خاموشی کے بعد مخاطب ہوں۔ طبیعت خراب چل رہی ہے۔ ایک حضرت سالک لکھنوی کی وفات کا صدمہ دوسرے موسم کے اثرات! ایک ساتھ کئی بیماریاں آئی ہیں۔ 'اردو دنیا' میں انٹرویو کی اشاعت کا بہت بہت شکریہ۔ انتقال سے تین روز قبل میں نے سالک لکھنوی کو آخری بار دیکھا۔ انٹرویو دیکھ کر انھوں نے پلکیں گرا کے شکریہ ادا کیا اور ان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ حکومت ہند نے 64 ویں یوم جمہوریہ کے موقعے پر سالک لکھنوی کو بعد مرگ 'پدم شری' اعزاز سے سرفراز کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کاش! یہ اعزاز مرحوم کو ان کی حیات میں ملا ہوتا۔

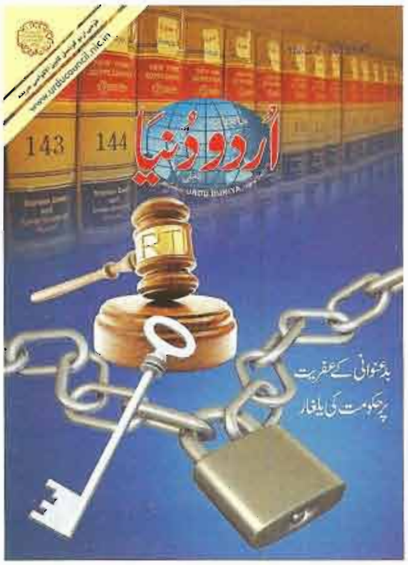

الحاج ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد

'اردو دنیا' جنوری 2013 کا شمارہ اپنے اندر متنوع و ہمہ جہت مواد ومضامین لیے ہوئے ہے۔ ہماری بات میں مدیر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب نے حق معلومات اور کرپشن پر دانش ورانہ اظہار کیا کہ قومی زندگی میں کرپشن کے انسداد و تدارک سے شفافیت پیدا ہوگی۔ آر ٹی آئی سے سچ سامنے آجائے گا۔ اس ایکٹ سے اقوام کو فیض حاصل ہو رہا ہے۔ بدعنوانی و کرپشن کے لیے ملک میں اخلاقی انقلاب و اصلاح کی ضرورت ہے اور تعلیمی نظام میں ethics اور اخلاقی قدروں کو متعارف کروانے سے کرپشن دور ہوگا۔ برقی میڈیا اور پرنٹ میڈیا میں اردو کا مستقبل تابناک ہے۔ اردو پڑھنے والوں کے حوصلے بلند ہوئے ہیں کیونکہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اردو سرحدوں کو پار کر کے نئی بستیاں بسا رہی ہے۔ سید فیصل علی کا انٹرویو بھی بصیرت افروز اور آج کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ شکیل حسن شمسی نے صحیح کہا ہے کہ صحافت عوام تک سچائی پہنچانے کا نام ہے۔ اطہر فاروقی یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اردو جب تک تعلیمی نظام کا ذریعہ نہیں بنے گی کیسے پھیلے گی۔ ابتدا سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک اردو کو وسیلہ و ذریعہ بنایا جائے تاکہ اس کی ترویج و اشاعت کا پھیلاؤ ہو سکے۔ 'لاشعور میں مادری زبان کی عمل داری' اچھا مضمون ہے۔ کم سے کم اب تو اردو والے ہوشیار ہو جائیں کہ مادری زبان ہی انسان کے شعور، لاشعور، تحت الشعور میں موجزن ہوتی ہے۔ صادق صاحب کا مضمون 'اردو کی اولین نثری نظم اور منٹو' میں منٹو کو نثری نظم کا تخلیق کار بتلایا گیا ہے اس تحقیقی نکتے پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ کشمیر کی پہلی اردو نثری تصنیف 'گلدستہ کشمیر' بھی تحقیقی مضمون ہے اس طرح کے مضامین سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ گیان چند جین کی تحقیقی خدمات پر مضمون معلومات سے پر ہے جس میں ان کی تحقیقی وتنقیدی تصانیف کا جائزہ لیا گیا۔ 'علامہ راشد الخیری کی نظم نگاری' نیا پن لیے ہوئے ہے۔ 'اردو دنیا' کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ہر شمارہ ایک کتاب سے کم نہیں۔

احسان عالم

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جنوری 2013 کا شمارہ 'اردو دنیا' موصول ہوا۔ گزشتہ رسالے کی طرح اس رسالے میں بھی کافی عمدہ مضامین ہیں۔ خاص طور پر نفیس بانو کا مضمون 'پریم چند کے افسانوں میں احتجاجی رویہ' امان اللہ کا مضمون 'اردو سند یافتہ نوجوانوں کے روزگار کے مسائل' عمدہ اور قابل تحسین ہیں۔ پڑھنے کے بعد ناامیدی، بے روزگاری، احساس کمتری، اردو سے متعلق رونما ہونے والے مسائل اور بہت ساری غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کے علاوہ قاری کے اندر پختہ یقین، مستقبل میں اردو کے روشن امکانات ہمت افزائی کے ساتھ ساتھ احساسات وجذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد جوش اور امنگ جیسی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح کے مضامین اردو میں شائع کر کے اردو قارئین کی حوصلہ افزائی کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ اس کے علاوہ نصرت ظہیر، سہیل انجم، فاروق ارگلی، عبدالحی وغیرہ کے انٹرویو بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین کا اداریہ معلومات میں اضافے کے لیے بہترین ذریعہ ہے۔ اس طرح کے مضامین سے صرف اردو پڑھنے والے کو ہی فائدہ نہیں بلکہ اردو کے فروغ کے لیے بہترین عمل ہے۔

محمد عرفان جونپوری

محلہ میر مست جونپور، یوپی

اردو دنیا کا تازہ شمارہ بابت جنوری وقت پر دستیاب ہوا۔ جب روایت مضامین کے انتخاب میں تنوع ہے۔ محترم نصرت ظہیر کے انٹرویوز اور صحافی حضرات کے جوابات سے بہر حال یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اپنی تمام تر مشکلوں اور مصائب اور فرقہ پرستی کے باوجود اردو کا مستقبل دشوار ہوسکتا ہے مگر مایوس کن نہیں ہے۔ محمد شجاعت علی کا تحریر کردہ (اسلامی فنون کی مختلف شکلیں فن موسیقی)

دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ مگر اس مضمون میں ایک کمی کا شدت سے احساس ہوا کہ شیراز ہند جونپور کے سلطان حسین شاہ شرقی کے ایجاد کردہ مشہور راگ 'خیال یا جونپوری راگ' کا تذکرہ نہیں ہے۔ قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں کہ ''حسین شرقی کو جب بھی دلی کے سلطان بہلول اور سلطان سکندر سے جنگ کرنے سے فرصت ملتی وہ اپنا طنبورہ لے کر بیٹھ جاتا۔ راگوں کی دنیا کی نئی نئی سیاحتیں کرنا یا قدیم نسخوں کی ورق گردانی میں مصروف رہتا۔'' (آگ کا دریا، ص122) ''معدن الموسیقی اور تحفۃ الہند میں ہے کہ حسین شاہ نے بارہ سام ایجاد کیے۔ مُدہ سام پہلے سے اہل ہند کا ایجاد کردہ تھا۔'' (تاریخ سلاطین شرقی اور صوفیائے جونپور، ص85)

حفیظ الرحمن بن مجیب الرحمن

پوسٹ بہادر گنج ضلع غازی پور (یوپی)

ماہنامہ 'اردو دنیا' جنوری 2013 کے سرورق پر 'بدعنوانی کے عفریت پر حکومت کی یلغار' دیکھ کر کافی خوشی محسوس ہوئی۔ میں نے چند دنوں پہلے یہ اردو ادب کا بہترین شاہکار و دلکش ماہنامہ ایک انسٹی ٹیوٹ میں دیکھا مجھے لگا کہ ایسے حالات میں اتنا عمدہ و ستا رسالہ ملنا ناممکن تو نہیں مگر مشکل ضرور ہے۔ میں اس حسین رسالہ کے لیے آپ لوگوں کا دل کی عمیق گہرائی سے مبارک باد دیتا ہوں اور دست بدعا ہوں!

جمال قدوسی

جمال ٹریڈرس، بڑھنی روڈ، اٹوا بازار، سدھارتھ نگر

جنوری 2013 کا شمارہ موصول ہوا۔ تمام مضامین اچھے ہیں۔ آنجہانی اندر کمار گجرال پر سہیل انجم کا مضمون نصرت ظہیر کا راجیش رینا، سید فیصل علی، شکیل حسن شمسی و اطہر فاروقی صاحبان سے لیے گئے انٹرویو پسند آئے۔ بلاشک 'اردو دنیا' اردو کا ایک اہم رسالہ ہے جو اپنے اندر بہت کچھ سموئے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر ایم ایس آئی عثمانی

C-565، جی ٹی بی نگر، کریلی، الہ آباد

مکرمی موجودہ تعلیمی نصاب سے متعلق چند باتیں جو ضروری سمجھتا ہوں لکھ رہا ہوں۔ کل اپنے ایک convent educated مریض سے جس کا نام مجتبیٰ تھا، پوچھا مجتبیٰ کے کیا معنی ہیں؟ اُسے اپنے نام کے معنی معلوم نہیں تھے! میرے دادا، والد، والدہ کی اور خود میری خریدی ہوئی اردو کی کتابیں جو میری نگاہوں میں بہت بڑا سرمایہ ہیں رکھی ہوئی ہیں اور صرف میں ہی انھیں پڑھتا ہوں کیونکہ گھر میں صرف میں اردو جانتا ہوں۔ اگر مجھے اسکول میں میری مادری زبان نہ پڑھائی جاتی تو میں یہ خط آپ کو نہ لکھ پاتا۔ پطرس، کرشن چندر، بیدی، اقبال، غالب، کنہیالال کپور سب موجود ہیں۔ ایک اردو کے پروفیسر کہتے ہیں لائبریری میں دے دو۔ وہاں بھی کوئی اردو جاننے والا ہوگا تبھی تو پڑھے گا! نئی نئی کتابیں، رسالے شائع ہو رہے ہیں لیکن اردو کی تعلیم اسکول میں نہ ہونے کی وجہ سے ان کا وہی حال ہے جو میری کتابوں کا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ پہلے اسکول میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہو بعد میں اردو ٹیچر کا appointment ہو پھر نئی کتابیں اور نئے رسالے شائع ہوں اور پھر اردو کی ترقی کے لیے نئے نئے ادارے قائم ہوں! میں نے دسویں تک اسکول میں اپنی مادری زبان اردو پڑھی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے B.Sc پھر King George Medical College, Lucknow سے MBBS اور Medical Colege, Agra سے Skin میں Post Graudation کیا۔ 12 سال ملک سے باہر بھی کام کیا لیکن اردو (مادری زبان) کا دامن نہیں چھوٹا۔ یونس دہلوی کا 'آئینہ' بھی پڑھا اور ظ انصاری کا بھی۔ لیکن اب چونکہ اسکول میں اردو نہیں پڑھائی جاتی تو کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کس کے لیے؟ کیا آپ عوام کو، بزنس مین کو، پروفیشنلز کو اور سیاست دانوں کو اس سلسلے میں اپنی رائے دیں گے یا میری کتابوں کو دیمک کھا جائے گی۔

میں اردو کی کتابیں اور رسالے خریدتا ہوں اور پڑھتا ہوں لیکن ان کتابوں کو میرے گھر میں صرف میں پڑھوں گا اور میری عمر ہے ستر برس۔ میرے شہر میں Book Fair لگا تھا، میں اکلوتے اردو کے اسٹال پر گیا، وہاں کچھ سفید بالوں والے کتابیں الٹ پلٹ رہے تھے۔ میں نے 'الفاروق' خریدی۔ وہاں موجود لوگوں سے میں نے کہا ''اسے گھر میں صرف میں پڑھوں گا'' وہ بولے کہ آپ کو اپنے بچوں کو گھر پر اردو پڑھانی چاہیے تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا انڈیا یا دنیا میں ڈاکٹر، انجینئر، آرکی ٹیکٹ، ایڈووکیٹ، سائنٹسٹ اپنے بچوں کو گھر پر مادری زبان پڑھاتے ہیں جو میں پڑھاؤں، کیا یہ ممکن ہے؟ اگر ممکن ہے تو گنتی کے چند لوگوں کے لیے۔ کیا ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام صاحب کو ان کی مادری زبان تمل پڑھنا اور لکھنا ان کے والد صاحب نے گھر پر سکھایا تھا؟ میرے کزن انجینئر ہیں۔ عمر 75 سال۔ لڑکی امریکہ میں۔ ایک لڑکا آئرلینڈ میں دوسرا مسقط میں اور دو بچے الہ آباد میں۔ اُن کی مرحومہ wife ڈگری کالج میں اردو کی ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ تھیں۔ میں وہاں گیا تو اردو کی بہترین کتابیں الماری میں قرینے سے سجی تھیں۔ میں نے پوچھا انھیں کون پڑھتا ہے؟ کہنے لگے کوئی نہیں۔ میرے گھر میں اب میرے سوا کوئی اردو نہیں جانتا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں NRI تھا تو ایئر پورٹ پر 'رابطہ' نامی رسالہ تلاش کرتا تھا۔ میں پوچھتا ہوں یہ نئے نئے ادارے، یہ نئی نئی کتابیں کس کے لیے؟ یہ مشاعرے کس کے لیے؟ مشاعروں میں زبان نہ جاننے کے سبب سامعین میں وہ سمجھ اور کشش بھی باقی نہ رہی۔ فراق صاحب کہتے ہیں'' جب کوئی نئی کتاب شائع ہوتی ہے تو میں اپنی پرانی کتاب اٹھا لیتا ہوں'' یہاں پرانی کتابیں اٹھانے والا کون باقی رہ جائے گا؟ لوگ کہتے ہیں انڈیا میں کروڑوں لوگ اردو بولتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کتنے لوگ اردو پڑھنا اور لکھنا جانتے ہیں؟

Script is the soul of the language

ایک رٹائرڈ آئی اے ایس جن کی مادری زبان اردو ہے اور جن کے پاس اردو کتابوں کا خزانہ ہے مجھ سے کہنے لگے کہ میں سوچتا ہوں کہ میرے بعد ان کتابوں کو کون پڑھے گا؟ انھوں نے مجھے 'زرگزشت' (مشتاق احمد یوسفی) پڑھنے کو دی۔ میں پڑھ کر خوش ہوگیا کہ کسی نے اسے پڑھا تو! اگر اردو کی ترقی کے لیے کچھ کرنا ہے تو بچوں کو اردو پڑھنا، لکھنا سکھانا ہوگا، اور یہ گھر پر ناممکن ہے۔ اسے اسکول میں ہی سیکھنا ہوگا جس کے لیے اردو ٹیچر appoint کیے جاتے ہیں۔ سنا ہے اردو کی نئی بستیاں بس گئی ہیں۔ سمندر پار امریکہ، کناڈا اور یورپ میں اردو پھل پھول رہی ہے۔ میرے عزیز جو کئی بار امریکہ جا چکے ہیں ایک سفید بالوں والے رشتہ دار سے ملنے گئے۔ اردو رسالے اور اخبار بھرے پڑے تھے۔ ان کے کئی بچے ہیں۔ پوچھا گھر پہ ان کو آپ کے علاوہ کون پڑھتا ہے؟ بتایا صرف میں۔ انھوں نے کہا میرے بچے اردو بولتے اور کچھ سمجھتے ہیں لیکن پڑھنا لکھنا نہیں جانتے! جہاں جہاں اردو پڑھی اور لکھی نہیں جائے گی وہاں سمجھ لو اردو کا کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کہتے ہیں ''بالکل اُس بچے کی طرح جو اپنی ماں کے دودھ سے سب سے زیادہ صحت مند اور مضبوط بنتا ہے اگر انسان کی مادری زبان میں اسے تعلیم دی جائے تو اس کا دل و دماغ بھی سب سے زیادہ مضبوط بنے گا۔''

■

▫ مناظر عاشق ہرگانوی

اردو شاعری میں بیک وقت تین صدیاں ساتھ چل رہی ہیں

ستیہ پال آنند

ستیہ پال آنند افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اردو ادب کی خدمت میں انہوں نے طویل عمر گزاری ہے۔ 15 سے 17 نومبر 2012 تک ساھتیہ اکادمی، دھلی کی طرف سے سعادت حسن منٹو پر انٹرنیشنل سیمینار تھا اور 17 سے 19 تک سلویشن کی طرف سے ادبی تھیوری اور شعریات پر اردو کے خصوصی حوالے سے سیمینار میں شرکت کے لیے ستیہ پال آنند بھی امریکہ سے دھلی آئے تھے۔ اس موقعے پر معروف نقاد اور شاعر مناظرعاشق ہرگانوی نے ان سے 'اردو دنیا' کے لیے خصوصی بات چیت کی۔ ان کا کہنا ہے کہ ''ہم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھے۔ دو دن تک صبح سویرے اور رات میں تخلیقی سطح پر میں اور ستیہ پال آنند سمت اور معنویت کی جستجو کرتے رہے اور معنی کے اظہار کو نیا روپ دینے کی کوشش کرتے رہے۔ دراصل تخلیقی عمل ایک بنیادی صورت حال ہے جو لاشعوری کیفیات اور فطری ردعمل سے تشکیل پاتی ہے۔ طریق کار فطری اور لاشعوری وسیلہ رکھتے ہوئے بھی بڑی حد تک افسانہ نگار اور شاعر کی شعوری کاوش ہے جس کے ذریعے وہ تخلیق کو مناسب ہیئت کی طرف مائل کرتا ہے۔ مواد کے انجذاب اور عمل سے جو نئی تشکیل سامنے آتی ہے اسے بیانیہ کے ذریعے لفظوں کی کاریگری، اتصال اور بنت میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ جسے جاننے کے لیے میں نے ستیہ پال آنند کے روبرو کئی سوال رکھے۔'' پیش خدمت ہیں، فکشن میں کامیابی کے بعد شاعری میں خود کو تسلیم کرانے والے ڈاکٹر ستیہ پال آنند سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباس: (ادارہ)

مناظر عاشق ہرگانوی: رسمی سا سوال۔ آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

ستیہ پال آنند: 1931 میں۔ 24 اپریل کا دن تھا۔ کوٹ سارنگ، ضلع چکوال، پاکستان۔

م ع ہ: اپنی تعلیم کی تفصیل بتائیں؟

آنند: پرائمری گاؤں میں، مڈل نوشہرہ ضلع پشاور سے اور میٹرک راولپنڈی سے 1947 میں کیا۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے ادیب فاضل بھی ہوئی۔ اسی یونیورسٹی سے فلاسفی میں بی اے آنرز کیا۔ پھر انگریزی میں ایم اے کی

ڈگری لی۔ پی ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ سے کی۔ لیکن دوسری پی ایچ ڈی Trinty یونیورسٹی، امریکہ سے فلاسفی میں کی۔

م ع ہ: لاہور سے چنڈی گڑھ کیسے آئے؟

آنند: ملک کے بٹوارے کے بعد فسادات شروع ہوگئے تھے۔ 1947 میں فساد کے دنوں میں اس ٹرین پر بھی حملہ ہوا جس پر میں سوار تھا۔ میرے والد صاحب کا قتل میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ کسی طرح لدھیانہ پہنچے۔

م ع ہ: آپ نے اردو میں لکھنا کب شروع کیا؟

آنند: میں تب چھوٹا سا تھا۔ ماں اور تین بہنوں کی ذمے داری مجھ پر آن پڑی تھی۔ مجھے پہلا کام روزنامہ 'صداقت' لدھیانہ میں پینتالیس روپے ماہوار پر ملا۔ چھوٹی موٹی دوسری نوکریاں بھی کیں۔ 'صداقت' میں کام کرتے ہوئے لکھنا آ گیا۔ میں نے افسانے لکھے اور 'شمع' اور 'بیسویں صدی' میں ہی چھپنے کے لیے بھیجتا رہا۔ اس لیے کہ وہاں سے معاوضہ ملتا تھا۔ اسی دوران ہندی کی طرف مراجعت کی۔ خاطر خواہ معاوضے کی خاطر۔ تب میری عمر اٹھارہ سال کی تھی۔

م ع ہ: آپ نے افسانے سے ہی شروعات کیوں کی؟

آنند: روپے کے لیے۔ غزل اور نظم کے لیے معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ ممکن ہے فراق صاحب (فراق گورکھپوری) کو ملتا ہو۔

م ع ہ: اُس وقت ترقی پسند تحریک کی شروعات تھی۔ کیا آپ اس تحریک سے متاثر یا وابستہ تھے؟

آنند: ابتدا میں متاثر ہوا۔ پھر اس تحریک میں شامل ہوگیا۔ اُس وقت پنجابی اور گورمکھی کے ادبا پیش پیش تھے۔ ہم سب پیروکار بنے۔

م ع ہ: کیا فائدہ کیا نقصان ہوا؟

آنند: بہت نقصان ہوا۔ میرا پہلا ناول 'چوک گھنٹہ گھر' ہندی میں چھپا جسے پنجاب سرکار نے ضبط کرلیا۔ تب میرے اندر زہر کا پودا پروان چڑھ رہا تھا۔ اس لیے کہ پاکستانیوں نے میرے باپ کو مار ڈالا تھا۔ جس وقت ناول ضبط ہوا پرتاپ سنگھ کیروں چیف منسٹر تھے۔ پولیس میرے پیچھے لگ گئی۔ میں پناہ کی تلاش میں کنور مہندر سنگھ بیدی کے پاس پہنچا۔ 1956 کی بات ہے۔ بیدی صاحب سنگرور میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ انھوں نے اپنی کوٹھی میں مجھے چھپالیا۔ پھر وہاں سے جالندھر گیا جہاں لیش ڈپٹی چیف منسٹر تھے۔ انھوں نے معاملے کو رفع دفع کرایا۔ جالندھر سے چنڈی گڑھ چلا گیا۔ بعد میں ترقی پسند تحریک کے پنجاب برانچ کا سکریٹری بنا۔ دہلی کانفرنس، بھیمڑی کانفرنس اور دوسری جگہوں کی کانفرنس میں شرکت کرتا رہا۔ تعلقات وسیع ہوئے۔ ایک دوسرا فائدہ بھی ہوا۔ اندر کے زہر کے پودے کو اکھاڑ پھینکا اور تب سے خود کو مسلمان محسوس کرتا ہوں۔ قرآن کئی بار پڑھ چکا ہوں۔

م ع ہ: جہاں تک مجھے یاد آتا ہے آپ کی پہلی کتاب 'جینے کے لیے' تھی؟

آنند: ہاں، 1952 میں ادارہ بیسویں صدی نے شائع کی تھی۔ اس کتاب میں تیرہ کہانیاں شامل ہیں۔ ابھی میں نے ناول کی بات کی تھی کہ پہلا ناول ہندی میں چھپا تھا۔

م ع ہ: پھر آپ شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابتدا میں غزلیں کہیں لیکن آج آپ نظم کے ہوکر رہ گئے ہیں۔ ایسا کیوں؟

آنند: انگریزی میں ایم اے کرنے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ فرانسیسی ادب اور انگریزی ادب میں نظم کی فراوانی ہے۔ انیسویں صدی میں انگریزی میں سانٹ اور اوڈ کی بہتات تھی۔ لیکن صنعتی انقلاب کے بعد محدود ہوگئی بلکہ اس طرح کی شاعری مرجھا گئی۔ ایزرا پاؤنڈ اور ٹی ایس ایلیٹ نے جدید شاعری کی نئی لہر دی۔ اس تختہ پلٹ سے نظم کا بول بالا ہوگیا۔ اس کے مقابلے میں اور تجربے کے نئے سرمائے میں اردو غزل کہیں پر نہیں ٹھہرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غزل کا طوقِ غلامی ایک فرسودہ سمندری پرندہ ہے۔ اگر اردو کو مغربی ادب کے شانہ بہ شانہ چلنا ہے تو ترجمے کی اہمیت کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور غزل کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ نظم معریٰ اور آزاد نظم اردو میں ہے اور وافر سرمایہ ہے۔ اسی لیے میں نے مشورہ دیا تھا کہ نظم کا نام بدل کر ن ث م (نَثم) کردیں۔ کچھ تو اختراعی ذہن سے کام لینا ہوگا۔ امریکہ والے اردو کو زبان نہیں مانتے تھے۔ لشکر کی زبان کہتے تھے۔ ڈکشنری بنانے والے بھی نہیں مانتے تھے۔ ٹیگور کی وجہ سے بنگالی زبان کو مانتے تھے۔ اردو کی پہچان کے لیے آج ترجمے کی سخت ضرورت ہے اور غزل اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔

م ع ہ: آپ نے نظموں میں کئی طرح کے تجربے کیے ہیں۔ اس کی تفصیل بتائیں؟

آنند: متھ کا استعمال کیا ہے۔ میٹا متھ کو برتا ہے۔ ماقبل اساطیر، فیبل اور پیریبل کو اظہار میں شامل کیا ہے۔ میری نظموں میں تلمیحات بہت ملیں گی۔ صبر ایوبی، رام کا بن باس وغیرہ مذاہب سے تعلقات رکھتے ہیں۔ کربلا کا استعارہ بھی ہے اور تاریخی آفاقیت کو بھی نظم کا حصہ بنایا ہے۔ میرے دو اشعار سنیے:

سکندروں کے قبیلے سے میں نہیں تھا مگر
مجھے بھی خضر نے رستے میں لا کے چھوڑ دیا

———

پیاس نے کیسا چمتکار کیا
کربلا کو بھی ہری دوار

م ع ہ: یہ تو غزل کے اشعار ہیں:

آنند: ابتدا میں غزلیں کہی تھیں۔ مذہب سے تجاوز کرکے اشعار میں کہانی پن لاتا تھا۔ ہندی کے غزل گو دُشینت میرے ساتھی تھے۔ میں نے ان کی غزلوں پر اصلاح دی تھی۔ جن غزلوں پر میں نے نظر نہیں ڈالی تھی ان میں عروضی غلطیاں ہیں۔

م ع ہ: ابھی آپ نے پیریبل لفظ کا استعمال کیا ہے، اس کی وضاحت کردیں؟

آنند: پیریبل میں مثالی کہانیاں خود گڑھی جاتی ہیں۔ ایلیٹ کے یہاں اس کی مثال بہت ملتی ہے۔ میں نے ایلیٹ کی ایسی آٹھ طویل نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ ان میں متھ، گریک کی کہانیاں، ہندوی اور اصحاب کہف کا قصہ بھی موجود ہے۔ پیرا متھ کے ذریعے بھی میں نے اپنی نظموں کی شان بڑھائی ہے۔ شق قمر کا واقعہ بھی میری نظموں میں ملے گا۔ دراصل یہ سب لاشعور کا حصہ ہے۔ اسی لیے فیبل اور پیریبل کے چوکھٹے میں رکھ کر دیکھنے کی اور نظم بند کرنے کی کوشش کی ہے؟

م ع ہ: آپ امریکہ کب گئے؟

آنند: آج سے چالیس سال قبل۔ اس کی تفصیل دلچسپ ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں لکچرر ہونے کے بعد پہلی وزیٹنگ اسکالرشپ کے تحت برٹش اوپن یونیورسٹی Miltonkeynes شہر میں دو برسوں کے لیے گیا۔ وہاں تین بڑی شخصیتوں سے شناسائی ہوئی۔ فیض احمد فیض، ن م راشد اور ساقی فاروقی۔ ساتھ ہی ملک راج آنند سے متعارف ہوا۔ یہ سب جب بھی آتے میری رہائش گاہ پہنچ جاتے۔ میرے ہی یہاں ٹھہرتے۔ وزیٹنگ پروفیسر کا یہ سلسلہ ہر تیسرے چوتھے برس چلتا رہا۔ ایک، دو اور تین برسوں کے لیے میرا جانا لگا رہتا۔ یونیورسٹی میں میرا انک نیم اے نور پروفیسر پڑ گیا تھا۔ چھ چکر کے بعد میں وہیں کا ہوکر رہ گیا۔ بچے بھی ساتھ چلے آئے۔

م ع ہ: آپ کا شمار اردو کی مالدار شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟

آنند: بالکل سچ ہے۔ مجھے امیر ترین شخصیتوں میں شمار کیجیے۔ دس ہزار ڈالر مہینہ آمدنی ہے۔

م ع ہ: امریکہ میں رہ کر اردو زبان کے لیے آپ نے کیا کچھ کیا ہے؟

آنند: یونیورسٹی میں مستقل طور پر جانے کے بعد میں اردو کو دنیا کی دیگر زبانوں سے متعارف کرانے میں لگ گیا۔ اپنی یونیورسٹی میں بھی اردو پڑھانے کا انتظام کیا— اور تراجم کے ذریعے خود ہی اردو پڑھانے لگا۔ بعد میں بیدار بخت اور شاہین کو پڑھانے کے لیے بلوایا حالانکہ میں انگریزی کا پروفیسر ہوں۔

م ع ہ: اکیسویں صدی کی ایک دہائی گزر چکی۔ آج کا اردو افسانہ کیا وقت کا ساتھ دے رہا ہے؟

آنند: بیانیہ لوٹ آیا ہے اور یہ اچھی علامت ہے۔ جدیدیت کے زمانے میں کردار تحلیل ہوگیا تھا۔ پلاٹ ختم کردیا گیا تھا اور وقت جو ماضی سے حال تک چلتا تھا وہ ختم ہوگیا تھا۔

م ع ہ: اور اردو میں شاعری آج کس معیار کی ہو رہی ہے؟

آنند: میں ہندو پاک دونوں ممالک کو سامنے رکھ کر بات کروں گا۔ ویسے سچ تو یہ ہے کہ میں پاکستان میں زیادہ چھپتا ہوں۔ وہاں کے رسائل زیادہ آتے ہیں۔ کتابیں بھی آتی ہیں لیکن ہندوستان کی شاعری پر بھی نظر ہے۔ میرے خیال میں آج اردو شاعری میں تین صدیاں بیک وقت چل رہی ہیں۔ انیسویں صدی، بیسویں صدی اور اکیسویں صدی۔ غزل انیسویں صدی کے ڈھرے پر چل رہی ہے۔ البتہ نظم بیسویں صدی کے ڈھرے پر ہے۔ اس میں بھی دو دھارائیں ہیں۔ ایک فیض اور دوسری ن م راشد کے تتبع میں ہیں۔ فیض کا آج محاسبہ ہو رہا ہے۔ میں نے پانچ مضامین یہ ثابت کرنے کے لیے لکھے ہیں کہ رومان بدلاؤ کا زائیدہ ہے۔

م ع ہ: آنے والا وقت کن شاعروں کا ہوگا؟

آنند: آنے والی تاریخ ن م راشد اور میراجی کی ہوگی۔ ان ہی دونوں کا نام آگے آئے گا۔ ویسے مجید امجد، اختر الایمان وزیر آغا اور قیوم نظر کا نام بھی آنے والی تاریخ کا حصہ ہے۔ فیض کے تتبع میں احمد فراز سب سے آگے نکل جانا چاہتے تھے لیکن نہ فیض بن سکے اور نہ فراز ہی ہو سکے۔

م ع ہ: نئی تھیوری کی سب سے بڑی یافت زبان و ادب وثقافت کی نوعیت و ماہیت کی وہ آگہی ہے جو معنی کے جبر کو توڑتی ہے اور 'معنی کے طرفوں' کو کھولتی ہے۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

آنند: مجھے اندازہ تھا کہ آپ یہ سوال کریں گے۔ اس کے جواب کے لیے عالمی ادبی تاریخ کو نقطۂ آغاز سے دیکھنا ہوگا۔ آپ نے نئی تھیوری کی بات کی ہے۔ میرے خیال میں ٹیری ایگلٹن کی کتاب کے بعد 1973 میں نئی تھیوری کا آغاز ہوا۔ اُس وقت میں برٹش اوپن یونیورسٹی میں ریزیڈنٹ اسکالر تھا۔ ان ہی دنوں رولاں بارتھ کی کتاب The Pleasure of Text 'دی پلیژر آف ٹکسٹ' چھپی۔ اس میں ایک چیلنج تھا نا قابل تردید حد تک۔ بارتھ نے قیاس کیا تھا کہ تمام تحریریں غیر نوآبادیاتی علاقے سے ہیں جن میں دانشوری کے کارہائے نمایاں دکھائے جاتے ہیں۔ اس میں ایشیا، لاطینی امریکہ اور افریقہ مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کے حالات جداگانہ ہیں۔ ان کے اپنے تناظر میں کہیں کہیں سراغ ملتا ہے۔ کوئی پندرہ سال قبل امریکہ میں ساختیات پر طنز سے بھری ایک کتاب The Mafona Connection چھپی تھی، اس میں جنسی محرکات اور خفی اور جلی اعضا کے مطالعے کو ساختیات اور پس ساختیات کے اصول پر پڑھا گیا تھا۔ اسے پڑھ کر میں نے ایک نظم The body Jumetary Procody لکھی۔ طریقہ میڈونا والا تھا۔ اسے لکھتے وقت لاطینی، سنسکرت اور پنجابی پنگل کو سامنے رکھا۔ اردو میں اس طرح کی نظمیں نہیں لکھی گئی ہیں۔ ادبی تخلیق شعری ونثری، خیالات کے اظہار کا ذریعہ نہیں ہے۔ معاشی یا معاشرتی صورت حال کا انعکاس عمل بھی نہیں ہے۔ میں اسے سماوی تاریخ کی حقیقت کا آلہٗ کار بھی نہیں کہتا۔ ساختیات، پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کے تناظر میں ایک حد تک مادی حقیقت کا ایسا جائزہ لیا جاسکتا ہے جیسے کسی مشین کی بابت اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔

م ع ہ: اردو میں نئی تھیوری کو کس ناقد نے سب سے زیادہ سمجھا اور سمجھایا؟

آنند: گوپی چند نارنگ نے۔ انھوں نے مشرقی شعریات کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس سے نیا باب کھلا ہے۔ امریکہ یا یوروپ میں ان کی کتاب چھپتی تو وہاں کے بڑے عالموں میں ان کا نام لیا جاتا۔

م ع ہ: میر کے حوالے سے اردو میں ایک ترکیب 'شعر شور انگیز' مستعمل ہے۔ اس بارے میں آپ سے وضاحت چاہتا ہوں؟

آنند: اس کے لیے پہلے 'شور و غل' پر غور کرنا ہوگا۔ عربی قاموس میں 'شور' اور 'غل' کے معانی الگ الگ دیے گئے ہیں۔ اردو میں وارد ہوتے ہوتے یہ اصطلاح ایک خاص مجموعی معانی کی حامل ہوگئی ہم جب بھی یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں ان دو الفاظ کے ماخذ اور منبع پر غور کیے بغیر انھیں یکجا کردیتے ہیں۔ 'شور' کا مطلب بلند آہنگی نہیں ہے۔ اونچی آواز میں بولنا نہیں ہے۔ یہ لفظ انسانی آوازوں سے مبرا ہے۔ اس کا مطلب دھڑ دھڑ، دھڑام۔ ڈھول ڈھمکے کی آوازیں، غیر انسانی آوازیں وغیرہ ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ یعنی جن سے کوئی مطلب اخذ نہیں کیا جاسکتا— 'غل' البتہ انسانی آوازوں پر مشتمل اس بلند آہنگی کو ظاہر کرتا ہے جو بہت سے اشخاص مل جل کر معرضِ وجود میں لا رہے ہوں:

یا دل ہے مرا یا ترا نقشِ کفِ پا ہے
غل ہے کہ اک آئینہ سرِ راہ پڑا ہے

یہاں 'غل' انسانی آوازوں کے پے در پے سنائی دینے کی غرض سے استعمال کیا گیا ہے۔ 'شعر شور انگیز' کے خالق نے خدا جانے میر تقی میر کی شاعری کے تناظر میں اس اصطلاح کو کیسے استعمال کیا ہے۔ اگر شور کا مطلب دھوم دھڑکا، بغیر مطلب کی اونچی آوازوں، غیر انسانی یا مشینی شور کا ہے تو میر تقی میر کے سیاق و سباق میں اس لفظ کا اطلاق ناموزوں ہے۔ مزید برآں 'شور انگیز' کو 'شعر' کے لاحقہ کے طور پر استعمال کرکے اس کی شکل بگاڑ دی گئی ہے۔

م ع ہ: انگریزی میں آپ کی کون سی کتابیں شائع ہوئی ہیں؟

آنند: (1) Good bye India & other poems (2) On Man and God (3) Figures of Fantasy (4) A Premise Kept (5) The Dream Weaver (6) A Vagrant Mirror (7) One Hundred Buddhas (8) If Winter Comes (9) The Sunset Strands.

م ع ہ: اور اردو میں آپ کی کون کون سی کتابیں منظر عام پر آئیں؟

آنند: افسانوی مجموعے (1) جینے کے لیے، 1953 (2) اپنے مرکز کی طرف، 1955 (3) آخری چٹان تک، 1978 ناول: (1) چوک گھنٹہ گھر، 1957 (2) آہٹ، 1959، (3) موت عشق اور زندگی، 1961 (4) شہر کا ایک دن، 1965 شعری مجموعے: اشاعت کا سنہ یاد نہیں ہے لیکن ترتیب اس طرح ہے: (1) دست برگ (2) وقت لاوقت (3) لہو بولتا ہے (4) میرے اندر ایک سمندر (5) مجھے نہ کر وداع (6) مستقبل آ مجھ سے مل (7) بیاض عمر (8) آنے والی سحر بند کھڑکی ہے (9) میری منتخب نظمیں (10) رسالتیں جوا سیر ہیں۔

□

Dr. Manazir Ashiq Harganvi, Kohsaar' Bhikanpur-3, Bhagalpur- 812001 (Bihar)

شمس الرحمٰن فاروقی

حنیف نقوی کی جاسوسیاں

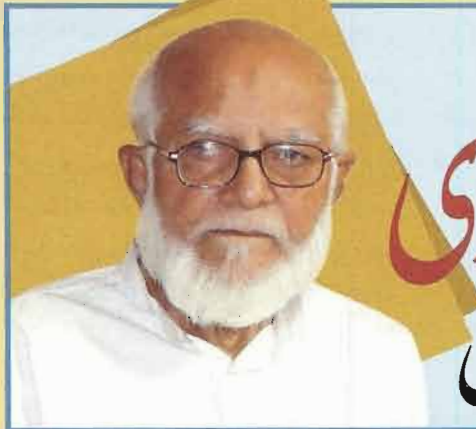

جناب شمس الرحمن فاروقی نے حنیف نقوی صاحب کے بارے میں یہ مضمون ان کی زندگی میں ہی تحریر کیا تھا۔ فاروقی صاحب نے اگرچہ اس میں حنیف نقوی مرحوم کی شخصیت کا جائزہ نہیں لیا تھا لیکن ان کی گراں قدر تحریر میں جابجا ایسے بلیغ اشارے ملتے ہیں جن سے حنیف صاحب کے ادبی مرتبہ کی نشان دہی بھی ہوتی ہے اور ان کی شخصیت کے بھی کچھ پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ (ادارہ)

یہ عنوان میں نے بہت سوچ کر رکھا ہے اور اس میں حنیف نقوی کی توقیر کم کرنے کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ ادبی محقق کسی نہ کسی پہلو سے جاسوسی نہیں تو سراغ رسانی کا کام ضرور کرتا ہے۔ جاسوسی اس کے فرائض منصبی میں کوئی خاص اہم جگہ نہیں رکھتی لیکن کبھی کبھی محقق کو جاسوسی، یعنی متفرق طرح کی شہادتوں کے تجزیے اور ذیلی شہادتوں سے استنباط کا کام انجام دینا پڑتا ہے۔ یعنی کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ محقق اپنی وسعت علم، قوت حافظہ اور معلومات کی دسترس کی بنا پر کچھ ایسی باتیں ڈھونڈ یا دریافت کر لیتا ہے جو ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل رہتیں۔ اسے ایک طرح کی جاسوسی کہیں تو غلط نہ ہوگا۔

تحقیق صرف اس بات کا نام نہیں کہ مشہور اور اہم باتوں کے بارے میں نئی معلومات دریافت کی جائیں یا پرانی اطلاعات کی غلطیاں ثابت کی جائیں۔ چھوٹی سی بات بھی تحقیق میں کبھی کسی بڑی بات کا پیش خیمہ ہوجاتی ہے یا کوئی چھوٹی سی دریافت کسی چھوٹی سی لیکن الجھن پیدا کرنے والی پرانی گتھی کو حل کر دیتی ہے جس طرح بڑے مورخ کی پہچان صرف یہ نہیں ہوتی کہ وہ تاریخ کے بڑے بڑے واقعات اور بڑے بڑے کرداروں کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے، بلکہ اس کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ان واقعات اور کرداروں کے بارے میں تفصیلات اور معلومات رکھتا ہے جو بڑے واقعات اور بڑے کرداروں کی پشت پر ہوتے ہیں اور بعض اوقات بڑے کرداروں اور بڑے واقعات کے وجود کے لیے ایک خاموش مہمیز کا کام کرتے ہیں۔

حنیف نقوی کو میں ایک مدت سے پڑھتا رہا ہوں اور شاید ہی کوئی تحریر ان کی ایسی ملی ہو جسے پڑھ کر میری معلومات میں اضافہ نہ ہوا ہو، یا میری کوئی غلط فہمی دور نہ ہوئی ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ایک زمانے تک ان کی شہرت کچھ 'شہرت شکن' لوگوں کی سی تھی۔ یعنی وہ بڑے بڑے محققوں کی غلطیاں یا فروگذاشتیں ڈھونڈنے اور بیان کرنے میں ماہر تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کے کام کی بعض ایسی خوبیاں مجھ پر کھلیں جن میں مجھے ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ مثلاً ایک تو یہ کہ اگر کسی لفظ کے بارے میں سوال ہو کہ یہ کب استعمال ہوا اور کن کن پرانے شاعروں کے یہاں یہ لفظ نظر آتا ہے، تو تھوڑے سے تامل یا تھوڑی سی تلاش کے بعد حنیف نقوی آپ کے سوال کا شافی جواب دے دیں گے۔ یا مثلاً اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ کوئی شاعر، اور خاص کر کوئی نسبتاً گمنام شاعر، کس کا شاگرد تھا اور کن تذکروں میں اس کا ذکر ملتا ہے تو، اس کا جواب بھی حنیف نقوی کے یہاں سے فوراً یا تقریباً فوراً مل جائے گا۔

محمود غزنوی کے بارے میں ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک بڑھیا اس کے دربار میں فریاد لے کر حاضر ہوئی کہ تیری سلطنت کے فلاں سرحدی قصبے میں مجھے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ کہا جاتا ہے کہ محمود نے جواب دیا کہ بڑی بی، اتنی دور کی سرحد کے بارے میں میں یہاں سے کیا کہہ یا کر سکتا ہوں؟ بڑھیا نے جواب دیا کہ اگر تو کچھ نہیں کر سکتا تو تو نے سرحد اتنی دور پر بنائی ہی کیوں؟ محمود غزنوی اس جواب پر لاجواب ہو گیا۔ حنیف نقوی مجھے ہمیشہ تحقیق کے میدان یا تحقیق کے ملک کی دور دراز سرحدوں پر بھی اتنے ہی حاوی اور قابض نظر آئے جتنے کہ وہ یا ان کی طرح کا کوئی اعلیٰ درجے کا محقق تحقیق کے مرکزی معاملات پر حاوی اور قابض ہوتا ہے۔

اس کی ایک مثال قاضی عبدالودود کی مرتب کردہ ایک چھوٹی سی کتاب 'مآثر غالب' پر ان کے حواشی اور استدراک سے ملتی ہے۔ یہ رسالہ غالب کے بعض خطوط اور بعض منظومات، اور ان پر قاضی عبدالودود کے حواشی اور تدوین پر مبنی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جانا چاہیے کہ جس کتاب پر قاضی عبدالودود نے حواشی لکھے ہوں اس پر کسی اور کو کچھ کہنے کی گنجائش کیا ہو سکتی ہے؟ یہ کتاب 1949 میں علی گڑھ میگزین میں مختار الدین آرزو صاحب نے ایک طویل مضمون کی شکل میں شائع کی تھی۔ بعد میں خدا بخش لائبریری نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا اور اشاعتِ نو کے لیے حنیف نقوی سے استدراکات اور حواشی لکھوائے۔

حنیف نقوی نے جابجا قاضی صاحب کی عبارات پر اضافے کیے ہیں یا تشنہ عبارتوں کی تکمیل کی مثال ہے۔ مثال کے طور پر، غالب کا قول تھا کہ ملا طغرا نے لفظ 'دریچہ' کو بتحریک سوم یعنی بروزن فاعلن باندھا ہے۔ قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ لیکن حنیف نقوی نے ملا طغرا کا شعر ڈھونڈ کر اپنے حاشیے میں درج کیا:

روز و شب دریچۂ مشرق و مغرب باز است
ورنہ از تنگی این خانہ نفس می گیرد

اسی طرح، قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ فردوسی نے 'شاہنامہ' میں ایک جگہ 'رفت' کا قافیہ 'گرفت' کیا ہے۔ انھوں نے شعر نہیں دیا۔ لیکن حنیف نقوی نے فوراً شعر درج کر دیا:

سر و دل پُر از کینہ کرد و برفت
تو گویی کہ عہدِ فریدون گرفت

ایک جگہ قاضی صاحب نے غالب کے ایک بہت ہی معتوب شخص خواجہ حاجی کا نام مرزا حاجی لکھا تھا اور ایک بار نہیں بلکہ دو بار۔ عام حالات میں اس پر اتنا ہی حاشیہ کافی ہوتا کہ اس شخص کا نام مرزا حاجی نہیں بلکہ خواجہ حاجی تھا۔ لیکن حنیف نقوی نے غالب کا ایک فارسی خط بھی حوالے میں پیش کر دیا جس میں غالب نے احمد بیگ تپاں کے نام لکھا تھا کہ تم نے خواجہ حاجی کو خواجہ حاجی خاں کیسے لکھ دیا؟ نواب احمد بخش مرحوم تو اسے ہمیشہ خواجہ حاجی لکھتے اور کہتے تھے۔ اس ایک بات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ غالب کی تحریروں پر حنیف نقوی کی نظر کتنی گہری ہے۔ غالب کا یہ خط بلا مبالغہ سینکڑوں لوگوں نے پڑھا ہوگا مگر کسے یہ بات یاد رہ گئی ہوگی کہ غالب نے خواجہ حاجی کو خواجہ حاجی خاں کہنے پر بھی اعتراض کیا تھا؟

اسی طرح، غالب کی ایک چھوٹی سی مثنوی کے

بارے میں قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ غالباً خود غالب کی لکھی ہوئی ہے۔ اس پر حنیف نقوی کا بیان ہے کہ نہ صرف یہ کہ یہ مثنوی دراصل غالب کا ایک منظوم خط جواہر سنگھ جوہر کے نام ہے بلکہ یہ ان کی تصنیف 'باغ دودر' میں موجود ہے۔ مزید تفصیل کہاں تک بیان کی جائے؟ خدا بخش لائبریری کی شائع کردہ اس کتاب کی طباعت بہت اچھی نہیں اور اس پر حنیف نقوی کے حواشی بہت ہی باریک قلم سے لکھوائے گئے ہیں۔ میں نے اس کتاب کو مدت ہوئی پڑھا تھا اور اب ضعف بصارت کی بنا پر دوبارہ پڑھنا مشکل ہے، ورنہ میرا خیال ہے کہ تقریباً ہر صفحے پر ایسی بات مل جائے گی جسے حنیف نقوی کی دریافت کہا جاسکے۔

علاء الدین احمد خاں علائی کے نام غالب کا ایک خط ہے جو خلیق انجم کے قیاس کے مطابق 28 جولائی 1865 کے بعد کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں غالب نے لکھا ہے کہ "ایک بار میں نے دکنی کی دشمنی میں گالیاں کھائیں ایک بار بنارسی کی دوستی میں گالیاں کھاؤں گا۔" اس باب میں گیان چند جین نے 'شب خون' شمارہ نمبر 226 بابت ماہ مئی جون 1999 میں ایک مراسلہ لکھا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ قاضی عبدالودود جاننا چاہتے تھے کہ یہ بنارسی کون تھا؟ لیکن خود گیان چند جین صاحب کو بھی یہ بات معلوم نہ تھی۔ اب جب انھوں نے دیکھا کہ میرے افسانے 'غالب افسانہ' میں ملا محمد عمر سابق بنارسی کا ذکر غالب کی زبان سے تعریفی لہجے میں ہوا ہے تو گیان چند جین صاحب نے یہ گمان کیا کہ ممکن ہے کہ یہی سابق بنارسی وہ بنارسی ہوں جن کی دوستی میں غالب کو گالیاں کھانے کا ڈر تھا۔

حنیف نقوی اپنے مضمون 'بنارسی کی دوستی' میں علاء الدین احمد خاں علائی کے نام غالب کے محولہ بالا خط کو نقل کرکے لکھتے ہیں کہ اس خط سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس بنارسی کا ذکر اس خط میں ہے وہ اس وقت دہلی میں موجود تھا اور ظاہر ہے کہ وہ شخص ملا سابق بنارسی نہیں ہوسکتا، کیونکہ ملا سابق بنارسی 1810 میں راہی ملک عدم ہوچکے تھے۔ دوسری بات حنیف نقوی یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ شخص غالب اور علائی کی طرح عقیدے کے اعتبار سے اثنا عشری تھا کیونکہ غالب نے علائی کو یہ لکھا ہے کہ اس شخص کو بازار میں بے حرمت کرنا 'خلاف شیوۂ مومنین' ہے۔ حنیف نقوی تیسری بات یہ دریافت کرتے ہیں کہ یہ بنارسی شخص محلّہ بلی ماراں کا باشندہ تھا کیونکہ غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "تم یوں تصور کرو کہ اس نام کا آدمی اس محلے میں بلکہ اس شہر میں بھی کوئی نہیں۔"

حنیف نقوی نے اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ جب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ جس شخص کا ذکر غالب کررہے ہیں وہ ملا سابق بنارسی نہیں ہوسکتا، بلکہ کم وبیش یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ غالب کا ہم محلّہ اور انھیں کی طرح مائل بہ تشیع تھا، تو "اس خط کے پس منظر میں ہمارا ذہن بار بار جس شخص کی طرف منتقل ہوتا ہے وہ صرف اور صرف مرزا یوسف علی خاں عزیز بنارسی ہیں۔" حنیف نقوی نے جو باتیں مستنبط کی ہیں وہ دل کو لگتی ہیں اور ان کی غیر معمولی زیرکی اور سرعت انتقال ذہن کا ثبوت ہیں۔ صرف اس میں شک ہوسکتا ہے کہ غالب کی طرح علائی بھی تشیع کی طرف مائل تھے کہ نہیں۔ بہر حال، حنیف نقوی اس بات کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں کہ مرزا یوسف علی خاں عزیز بنارسی اور غالب ہم محلّہ تھے۔ حاتم علی مہر کے نام 1860 کے ایک خط میں غالب نے لکھا ہے کہ مرزا یوسف علی خاں نے "میرے مسکن کے پاس ایک مکان کرائے کو لے لیا ہے۔ اس میں رہتے ہیں۔" یہ خط میری طرح ہزاروں لوگوں نے پڑھا ہوگا لیکن شاید ہی کسی کے دھیان میں یہ بات رہی ہو کہ غالب نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ اور یوسف علی خاں عزیز ہم محلّہ تھے۔ یوسف علی خاں عزیز کو غالب بہت عزیز رکھتے تھے، اس باب میں بھی حنیف نقوی نے غالب کے کئی خطوں کے اقتباس پیش کیے ہیں۔ لہٰذا یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ وہ یوسف علی خاں عزیز بنارسی کے بارے میں علائی کو لکھتے کہ تم اس شخص سے درگذر کرو۔

یوسف علی خاں عزیز کے بارے میں اگلی اہم بات جو حنیف نقوی نے غالب کے خطوط سے مستنبط کی ہے وہ یہ ہے کہ یوسف علی خاں عزیز دوسروں پر زبان و بیان سے متعلق اعتراض بھی کرتے تھے۔ ان کے نام ایک خط میں تذکیر و تانیث کے متعلق کچھ باتوں کو درج کرنے کے بعد غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "تم اپنی تکمیل کی فکر میں رہا کرو۔ زنہار کسی پر اعتراض نہ کیا کرو۔" اب حنیف نقوی ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ یوسف علی خاں عزیز کی عادت تھی کہ وہ دوسروں پر نکتہ چینی کرتے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے انیس و دبیر پر بھی اعتراض کیے ہیں، اور یہ بات دوسرے مصادر سے بھی ثابت ہے۔

اس سلسلے میں حنیف نقوی نے عبدالغفور نساخ کے تذکرے 'سخن شعرا' کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن مزید شہادت کے طور پر انھوں نے لالہ سری رام دہلوی کے تذکرہ 'خمخانۂ جاوید' کی جلد پنجم سے ایک طویل اقتباس دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علی خاں عزیز نے ظہیر دہلوی کے ترجمۂ 'قصۂ شہزادہ ممتاز' پر جگہ جگہ اصلاح دی اور غلطیاں نکالیں۔ جب ظہیر دہلوی کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے دہلی کے کئی فصحا کو وہ اصلاحیں دکھائیں جو یوسف علی خاں عزیز بنارسی نے ترجمے پر درج کی تھیں اور پھر کئی لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے بعد کہ اصلاحیں سب غلط ہیں، انھوں نے ارادہ کیا کہ لکھنؤ کے اساتذہ سے بھی اس معاملے میں استصواب کیا جائے۔ (گویا یہ کچھ اسی قسم کا واقعہ ہوا جیسا کہ ایک بار مرزا فاخر مکین کے ساتھ ان کے ایک دوست کا گزر چکا تھا۔ اس معاملے میں سودا نے مرزا فاخر مکین کے اعتراضات کو غلط ثابت کیا تھا۔)

'قصۂ شہزادہ ممتاز' کے اس ترجمے اور اس پر اصلاحوں کا حال حنیف نقوی نے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس تفصیل میں خود یوسف علی خاں عزیز کے بیانات کا بھی اور ان کی مثنوی 'حقیقت حال' کے اشعار کا بھی ذکر انھوں نے کیا ہے اور سچ بات یہ ہے کہ عقل دنگ ہوجاتی ہے کہ اس معمولی سی بات کی تفصیلات یاد تھیں۔ حنیف نقوی کو نہ صرف یہ کہ معلوم تھیں بلکہ انھیں یاد بھی تھیں۔

ظہیر دہلوی کے ترجمے پر عزیز بنارسی کے اعتراضات کی بنا پر جو قضیہ کھڑا ہوا اس نے عزیز بنارسی کی حیثیت (جو پہلے ہی سے بہت کمزور تھی) پر ضرب لگائی۔ حنیف نقوی کا خیال ہے کہ یہی معاملہ یوسف علی خاں عزیز بنارسی اور علائی کے درمیان ناراضگی بلکہ علائی کی طرف سے جارحانہ کارروائی دھمکی کا سبب بنا ہوگا۔ اس سلسلے میں بھی انھوں نے ذیلی شہادتوں کی روشنی میں جو نتیجے برآمد کیے وہ بہت وثوق انگیز ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ظہیر نے دلی کے جن استادوں سے عزیز بنارسی کی اصلاحوں پر رائے لی ہوگی اور ان میں غالب اور علائی یقیناً شامل رہے ہوں گے۔ اس کا امکان ہے کہ غالب نے عزیز بنارسی کا ساتھ دیا ہو، نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ عزیز بنارسی کو بہت دوست رکھتے تھے بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ذوق کے شاگرد ظہیر کے مقابلے میں اپنے شاگرد کی بات کی پچ رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ اب یہاں پر حنیف نقوی یہ قیاس کرتے ہیں کہ علائی نے ظہیر دہلوی کے حق میں رائے دی ہوگی اور ممکن ہے کہ اس کی بنا پر عزیز بنارسی نے حسب عادت ادھر اُدھر ان کے خلاف دو چار جملے بھی کہہ دیے ہوں جن کا ردعمل اس برہمی کی صورت میں ظاہر ہوا ہو جس کی طرف غالب نے اپنے خط میں اشارہ کیا ہے۔

حنیف نقوی کا قیاس بڑی حد تک وثوق انگیز ہے۔ لیکن اس سے یہ بات نہیں کھلتی کہ غالب نے بنارسی کی محبت میں 'گالیاں کھانے' کا ذکر کیوں کیا؟ یہ تو بالکل قرین قیاس نہیں کہ غالب کا مطلب یہ رہا ہوگا کہ میں عزیز بنارسی کی حمایت کروں گا تو علائی کی 'گالیاں کھاؤں گا'۔ یہ بہ ظاہر غیر ممکن ہے کہ علائی سے غالب کو گالیوں کی توقع رہی ہو۔

لیکن مشکل یہ بھی ہے کہ اب تک جو شواہد حنیف نقوی نے دریافت یا مستنبط کیے ہیں ان کی روشنی میں 'بناری' سے مراد یوسف علی خاں عزیز ہی ٹھہرتے ہیں۔ بہر حال، یہاں پر اگلی بات حنیف نقوی نے یہ لکھی ہے کہ علائی کے نام 1865 کے زیر بحث خط میں غالب نے یہ الفاظ لکھے ہیں۔ ''ضمناً ذکر ایک مدبر کا کیا جاتا ہے۔ جو تم نے اس مدبر کے صفات لکھے ہیں، سب سچ ہے۔'' حنیف نقوی ہمیں متوجہ کرتے ہیں کہ یہ لفظ 'مدبر' بروزن 'مشکل' نہ کہ بروزن 'مفکر' ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ''لغت کے مطابق مدبر اس شخص کو کہتے ہیں جسے اقبال مندی پیٹھ دکھا چکی ہو، یعنی جو شخص جاہ وثروت اور عیش وآسائش کے دن دیکھنے کے بعد افلاس وتنگ دستی کی زندگی گزار رہا ہو۔'' بہ الفاظ دیگر، یہ لفظ 'مدبر'، 'ادبار' کا اسم فاعل ہے۔ غالب نے جگہ جگہ یوسف علی خاں عزیز کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ افلاس کے دن گزار رہے تھے۔ حنیف نقوی ان کی مثنوی 'حقیقتِ حال' کا پھر حوالہ دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہاں بھی عزیز نے اپنے کو عالی خاندان بتایا ہے اور کہا ہے کہ میں وہ شخص ہوں جس کا جد صوبے دار تھا اور راج کرتا تھا، آج میں مفلوک الحال ہوں۔

ان باتوں کی روشنی میں یہ نتیجہ برآمد کرنا بالکل فطری ہے کہ یوسف علی خاں عزیز ہی ہیں جنھیں غالب نے 'مدبر' کہا ہے جن کی مزاج کی گرمی اور جھگڑالو پن اور دوسروں پر اعتراض کرنے کی عادت کے نتیجے میں انھیں علائی کی ناراضگی مول لینی پڑی اور علائی نہ صرف ناراض ہوئے بلکہ یہاں تک خفا ہوئے کہ وہ یوسف علی خاں عزیز کو 'بازار میں بے حرمت' کرانا چاہتے تھے۔

حنیف نقوی نے اس مضمون 'بناری کی دوستی' میں اب تک جو کہا ہے اسے اعلیٰ درجے کے محققانہ مزاج اور ذیلی شہادتوں سے تیقن انگیز نتائج نکالنے کی غیر معمولی صلاحیت کا اظہار کہا جانا چاہیے۔ لیکن وہ یہاں پر بس نہیں کرتے۔ خلیق انجم نے اپنے مرتب کردہ 'غالب کے خطوط (جلد اول صفحہ 424) میں اس خط کو ''28 جولائی 1865 کے بعد' کا بتایا ہے لیکن حنیف نقوی کہتے ہیں کہ یہ خط 22 جولائی 1868 کو لکھا گیا ہوگا، اور وہ اس باریک تفصیل کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ غالب کے زیر بحث خط کا پہلا جملہ یہ ہے ''مدعا ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ اگر کل کمیٹی میں گئے ہو تو میرے سوال کے پڑھے جانے کا حال لکھو۔'' حنیف نقوی اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کمیٹی سے غالباً دہلی سوسائٹی مراد ہے اور وہ دہلی سوسائٹی کے ایک جلسے مورخہ 21 جولائی 1868 کی روداد کا ایک پیراگراف نقل کرتے ہیں جس کی رو سے سکریٹری نے کتاب 'مفرط العملہ' کے بارے میں ''کیفیت جناب مرزا نوشہ صاحب ونواب علاء الدین احمد خاں صاحب پڑھ کر سنائی۔'' حنیف نقوی کہتے ہیں کہ غالب نے علائی کے نام زیر بحث خط سوسائٹی کی اس بیٹھک مورخہ 21 جولائی 1868 کے اگلے دن یعنی 22 جولائی 1868 کو لکھا ہوگا۔ اس باریک بینی کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ لیکن ابھی حنیف نقوی ایک اور نکتہ برآمد کرتے ہیں۔ غالب نے اپنے خط میں لکھا تھا ''میرے سوال کے پڑھے جانے کا حال لکھو۔'' حنیف نقوی انکشاف کرتے ہیں کہ ''برطانوی دور میں ہر اس تحریر کو جو کسی حاکم کے حضور میں پیش کی جاتی تھی 'سوال' کہا جاتا تھا۔'' اس طرح غالب کے خط میں 'سوال' کا محل اور وجہ بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

اپنے نتائج کی مزید تصدیق کے لیے حنیف نقوی نے 'قصۂ شہزادہ ممتاز' کی تاریخ طباعت پر بھی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن اپریل 1867 اور جولائی 1868 کے درمیان کسی وقت شائع ہوا تھا۔ اس بنا پر بھی اس نتیجے کو تقویت پہنچتی ہے کہ غالب کے زیر بحث خط میں علائی کی ناراضگی کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کا تعلق 'قصۂ شہزادہ ممتاز' اور لہٰذا یوسف علی خاں عزیز بناری سے ہی ہے۔

میرا خیال ہے حنیف نقوی کے اس مضمون کو اردو میں کسی بھی تحقیقی تحریر سے مشابہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ اپنی جگہ پر بالکل بدیعی اور غیر معمولی تحریر ہے۔ اس ضمن میں صرف ایک انگریزی کتاب ذہن میں آتی ہے۔ امریکی نقاد اور محقق جان لونگسٹن لوز (John Livingston Lowes) نے کولرج کی نظموں میں جا بجا دور از کار اور نامانوس اشیا کے حوالے یا ان کے طرف اشارے دیکھ کر یہ گمان کیا کہ ان کا سرچشمہ وہ کتابیں رہی ہوں گی جو کولرج نے اپنی دو نظمیں Kubla Khan اور The Rime of the Ancient Mariner تحریر کرتے وقت پڑھی ہوں گی۔ یہ ایسی بات تھی جس کی تصدیق تو در کنار، تحقیق بھی بظاہر ناممکن تھی۔ لیکن لونگسٹن لوز نے کئی پرانی کتابوں، پھر کولرج کی اپنی کتابوں پر درج اس کے حاشیوں، اس کی یادداشتوں اور ڈائریوں میں مذکور اشاروں اور عبارتوں کے ذریعے وہ تمام کتابیں اور تمام حوالے ڈھونڈ نکالے جن کا ذکر محولہ بالا ان دو نظموں میں کہیں کہیں براہ راست اور کہیں کہیں اشارتاً آیا ہے۔ اس کی کتاب The Road to Xanadu: A Study in the Ways of the Imagination 1930 میں شائع ہوئی اور آج تک اپنی مثال آپ ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ حنیف نقوی بھی غالب، یا کسی اور شاعر کے حوالے سے لونگسٹن لوز جیسا کام کر ڈالیں۔ ان کا مضمون 'بناری کی دوستی' پڑھ کر مجھے تو یہی توقع ہوتی ہے۔ خدا پورا کرے۔ اپنا مضمون ختم کرنے سے پہلے 'جاسوسی' پر مبنی حنیف نقوی کے ایک اور مضمون کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

غالب کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی خوش نصیب شاعر تھے۔ نہ صرف یہ کہ انھیں بہت باثر اور لائق نقاد اور سوانح نگار ملے، بلکہ یہ بھی کہ ان کے بارے میں طرح طرح کی خبریں، جھوٹی یا سچی، اکثر مشہور ہوتی رہیں۔ مثلاً ان کے مرنے کے کچھ ہی دن بعد آگرے کے ایک اخبار نے ان کی موت کی خبر میں یہ بات بھی لکھی کہ غالب فری میسن تھے۔ ان کلام کے نئے نئے مخطوطے دریافت ہوتے رہے اور پھر پراسرار طور پر غائب بھی ہوتے رہے، اگرچہ غائب ہونے سے پہلے ان پر بہت دیر تک بحث بھی ہوئی اور ایک مخطوطے کے بارے میں یہ بھی سوال اٹھا کہ یہ جعلی ہے کہ اصلی۔ اور اس بحث میں لوگوں نے ایک دوسرے کو نرم وسخت باتیں بھی کہیں۔

اسی طرح، غالب سے منسوب کر کے کئی غزلیں 'دریافت' ہوئیں اور انھیں بڑے بڑے غالب شناسوں نے حقیقی تسلیم کیا۔ بہت دیر بعد، اور کبھی کبھی بہت بحث کے بعد یہ بات کھلی کہ یہ سارا کلام جعلی اور موضوعی ہے۔ غالب کے خطوں کے بارے میں بھی ایسا ہوا کہ کئی لوگوں نے ان کے نئے خط 'دریافت' کیے اور ان خطوں کو بھی ماہرین غالب نے قبول کر لیا۔ اس طرح، غالب کا نام ہمیشہ خبروں میں آتا رہا۔ غالب کے جعلی خطوں کا سب سے زیادہ معروف مجموعہ 1939 میں 'نادر خطوط غالب' کے نام سے ایک صاحب رسا ہمدانی نے شائع کیا۔ اس مجموعے کے کچھ خطوط 1931 میں بعض رسائل میں بھی شائع ہوئے تھے اور اس وقت انھیں غالب ہی کی تصنیف سمجھا گیا تھا۔ لیکن پورے مجموعے کی اشاعت کے بعد مالک رام مرحوم نے 1943 میں اور قاضی عبدالودود صاحب مرحوم نے 1944 میں مبسوط تبصرے لکھے اور ثابت کیا کہ اس مجموعے میں جتنے خطوط ہیں سب جعلی ہیں اور غالب کے بعض مجموعۂ خطوط کے اجزا مربوط کر کے بنا لیے گئے ہیں۔

یہاں تک تو باتیں کم وبیش سب کو معلوم تھیں۔ اب حنیف نقوی نے اپنے مضمون 'غالب سے منسوب تین جعلی تحریریں' میں انکشاف کیا ہے کہ رسا ہمدانی کے بہت پہلے صفدر مرزا پوری نے اسی قسم کی پیوند کاری عمل میں لا کر احمد حسین مینا مرزا پوری کے نام غالب کے دو خط تیار کیے اور انھیں اپنی تصنیف 'مرقع ادب' مطبوعہ 1924 میں شائع کر دیا۔ حنیف نقوی بتاتے ہیں کہ یہ دو خط پہلے تو خلیق انجم کی مرتب کردہ 'غالب کی نادر تحریریں' مطبوعہ 1961

میں نقل ہوئے۔ اور اس کے بعد پھر خلیق انجم ہی نے پانچ جلدوں میں اپنی مرتب کردہ 'خطوطِ غالب' کی جلد دوم مطبوعہ 1985 میں انھیں شائع کیا اور اب تک ان خطوں کے بارے میں کوئی شک نہیں ظاہر کیا گیا کہ یہ اصلی نہیں ہیں۔

یہاں پر حنیف نقوی سہواً یہ لکھنا بھول گئے ہیں کہ خلیق انجم کے پنج جلدی مجموعۂ خطوطِ غالب کے پہلے 1969 میں مولانا غلام رسول مہر انھی زیرِ بحث خطوط کو اپنے مرتب کردہ مجموعے 'خطوطِ غالب' جلد دوم (لاہور 1969) میں شائع کر چکے تھے۔ مگر فرق یہ ہے کہ یہاں مکتوب الیہ کا نام سید احمد حسین تمنا مرزاپوری لکھا گیا ہے اور اس پر کچھ بحث بھی ہے کہ ان کا تخلص 'مینا' نہیں بلکہ 'تمنا' تھا۔

یہ بات درست ہے کہ تمنا مرزاپوری نام کے ایک صاحب تھے جنھوں نے دو مذہبی صوفیانہ کتابیں لکھی ہیں اور اس بنا پر مولانا غلام رسول مہر کو یہ دھوکا ہوا کہ 'مرقع ادب' میں مندرج خطوطِ غالب کے مکتوب الیہ کا نام احمد حسین مینا نہیں (جیسا کہ وہاں درج تھا) بلکہ احمد حسین تمنا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ خلیق انجم نے احمد حسین مینا کے نام مبینہ دو خطوط میں سے پہلا خط وہ درج کیا جس کا آغاز ان لفظوں سے ہوتا ہے ''بندہ پرور کل دوپہر کو آپ کے عنایت نامے کے ساتھ ہی جناب اختر کا مہربانی نامہ پہنچا۔'' اس کے بعد خلیق انجم نے وہ خط درج کیا ہے جس کے آغازی الفاظ ہیں ''جانِ غالب، کل تمھاری دونوں غزلیں بعد اصلاح ٹکٹ دار لفافے کے اندر رکھ کر بھجوا دی ہیں۔'' خلیق انجم کے برخلاف مولانا مہر نے 'جانِ غالب' والا خط پہلے رکھا ہے اور 'بندہ پرور' والا خط بعد میں رکھا ہے۔

غالب کے خطوط کے دو مشہور اور معتبر سمجھے جانے والے مجموعوں میں احمد حسین مینا/تمنا مرزاپوری کے نام ان دو خطوں کے بارے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہوا تھا۔ (میں بھی لفظ 'کسی' میں شامل ہوں)۔ اب حنیف نقوی کے زیرِ نظر مضمون سے پہلی بار یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان خطوں کی تقریباً تمام عبارت غالب کے مطبوعہ خطوں سے فقرے اور جملے نکال کر جوڑ جوڑ کر بنائی گئی ہے۔ فقروں کی تلاش کا یہ عالم ہے کہ مینا مرزاپوری کے نام خط میں فقرہ 'کون شخص مشتاق نہ ہوگا' کو حنیف نقوی نے عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں ڈھونڈ لیا۔ اسی طرح، ایک اور جگہ مینا کے نام خط میں فقرہ ہے ''اب یہاں سے روئے سخن حضرت اخگر کی طرف ہے۔'' علیٰ ہذا القیاس، حنیف نقوی نے کئی کئی جملے مختلف خطوں سے نکال کر ثابت کیا ہے کہ الا ماشاء اللہ چند فقروں کے علاوہ جو صفدر مرزاپوری کی تصنیف معلوم ہوتے ہیں، باقی سب متن خطوطِ غالب کے مختلف خطوں سے کاٹ کر اور جوڑ کر بنایا گیا ہے۔

بقول حنیف نقوی، صفدر مرزاپوری کے اس جعل کا ایک اور نتیجہ نکلا۔ وہ یہ کہ مالک رام مرحوم جیسے محتاط اور جید غالب شناس نے اخگر مرزاپوری اور مینا مرزاپوری کو اپنی کتاب 'تلامذۂ غالب' میں بطور شاگردانِ غالب شامل کر لیا۔

اس طرح، غالب سے منسوب غلط باتوں میں ایک اور بات کا اضافہ ہو گیا اور لوگوں کے لیے غالب کے تعلق سے ایک اور موضوعِ سخن ہاتھ آیا۔ اسی طرح کی، بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑھ کر موضوعِ سخن بننے کے لائق بات حنیف نقوی نے یہ دریافت کی ہے کہ غالب سے منسوب مشہور مثنوی جس کا پہلا شعر ہے:

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی
لے کے دل سر رشتۂ آزادگی

غالب کی ہے ہی نہیں۔ حنیف نقوی کہتے ہیں کہ اس مثنوی کی پہلی روایت کا بیان کنندہ اور کوئی نہیں وہی صفدر مرزاپوری ہیں جن کے جعل کا حال اوپر دیکھ چکے ہیں۔ حنیف نقوی کہتے ہیں کہ اس مثنوی کے کلامِ غالب ہونے کے ثبوت ہمیں جو شواہد صفدر مرزاپوری نے پیش کیے ہیں وہ خود ان کی نظر سے نہیں گزرے تھے بلکہ زاہد سہارنپوری نے اپنے ذاتی کاغذات میں سے نقل کر کے یہ مثنوی انھیں بھیجی تھی۔ حنیف نقوی اس مثنوی کو جعلی اس بنیاد پر کہتے ہیں کہ اس کی مکمل روایت صفدر مرزاپوری کی بیان کردہ ہیں اور صفدر مرزاپوری کی جعل سازی غالب کے خطوط کے سلسلے میں ثابت ہو چکی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ایک بار کسی اہم معاملے میں جھوٹا ثابت ہو جائے تو اس کی روایت کردہ بقیہ باتیں بھی جھوٹی مانی جائیں گی۔

حنیف نقوی لکھتے ہیں کہ مولانا عرشی نے اس مثنوی کو اپنے مرتب کردہ 'دیوانِ غالب' (1958) میں داخلِ دیوان کیا تھا لیکن اسے 'یادگارِ نالہ' یعنی مشکوک کلام کے تحت جگہ دی تھی لیکن یہاں حنیف نقوی سے تھوڑا سا سہو ہوا ہے۔ نسخۂ عرشی کے اوّل ایڈیشن میں مولانا عرشی لکھتے ہیں (صفحہ 73):

''یادگارِ نالہ۔ اس جزو میں وہ کلام رکھا گیا ہے 'جو دیوانِ غالب کے کسی نسخے کے متن میں تو نہ تھا' لیکن بعض نسخوں کے حاشیوں یا خاتمے میں یا مرزا صاحب کے خطوں کے اندر یا ان کے نام سے دوسروں کی بیاضوں میں پایا گیا تھا... اس حصے میں وہ اشعار بھی ہیں جو میری دانست میں معتبر ہیں اور وہ بھی جنھیں میں کلامِ غالب ماننے کو اس وقت تک آمادہ نہیں جب تک کوئی مستند شہادت نہ مل جائے۔''

نسخۂ عرشی طبع دوم (ص 75) میں مولانا نے کم و بیش یہی بات کہی ہے۔ لیکن اس کے بعد مثال میں انھوں نے ان غزلوں کا ذکر کیا ہے جو مولانا آسی نے 'دریافت' کی تھیں اور لکھا ہے کہ انھیں قطعی طور پر کلامِ غالب نہیں کہا جا سکتا، اس لیے انھیں خارج کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ 'یادگارِ نالہ' کے حصۂ غزلیات میں نمبر 7 اور اس کے آگے بعض نمبروں کے تحت جو کلام درج ہیں اس کے کلامِ غالب ہونے میں انھیں تامل ہے۔ اس فہرست میں انھوں نے ایک نمبر 69 بھی درج کیا ہے جو غالباً 59 کی جگہ سہو کتابت ہے لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ مولانا عرشی کی 'مشکوک' فہرست میں 'مثلِ پتنگِ کاغذی' والی مثنوی نہیں شامل ہے۔

اس مثنوی کے اندراج پر جو مفصل حاشیہ مولانا عرشی نے لکھا ہے ('نسخۂ عرشی' طبع دوم، ص 361 تا 363) اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عرشی اس مثنوی کو غالب کی تصنیف سمجھتے تھے اور ان کی رائے کی پہلی بنیاد صفدر مرزاپوری کی روایت نہیں بلکہ حالی کی روایت ہے جو 'یادگارِ غالب' میں مفصل طور پر درج ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ 'یادگارِ غالب' میں اس مثنوی کا آخری شعر نقل کیا گیا ہے لیکن اس کی تفصیل جو بیان کی گئی ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ حالی اور ان کے راوی بہاری لال مشتاق دونوں اس مثنوی کو 'مثلِ پتنگِ کاغذی' والی ہی مثنوی سمجھتے تھے۔ حنیف نقوی نے کالی داس گپتا رضا کا حوالہ دیا ہے کہ انھوں نے اپنے مرتب کردہ 'دیوانِ غالب کامل' میں اس مثنوی کو صفدر مرزاپوری کی سند پر غالب کی تصنیف مانا ہے۔ یہاں بھی حنیف نقوی نے اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ کالی داس گپتا رضا نے بھی اپنی رائے کی اول بنیاد 'یادگارِ غالب' میں حالی اور بہاری لال مشتاق کے بیان کے بنیاد پر رکھی ہے۔

حنیف نقوی کا یہ قول درست ہے کہ ''اگر کوئی راوی صریحاً غلط بیانی یا جعل سازی کا مرتکب پایا جائے تو اس کی کوئی روایت قبول نہیں کی جا سکتی۔'' علمِ حدیث میں تقریباً ہمیشہ اس اصول پر عمل کیا جاتا ہے لیکن ادبی تحقیق کے سلسلے میں اس قدر سختی شاید ہر جگہ مناسب نہ ہو۔ لیکن یہاں بنیادی بات یہ ہے کہ صفدر مرزاپوری مثنوی زیرِ بحث کے نہ اول راوی ہیں اور نہ واحد راوی۔ 'یادگارِ غالب' میں مندرج تفصیلی بیان کو دیکھتے ہوئے اس مثنوی کو غالب کی ملکیت نہ قرار دینا زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ حنیف نقوی کا فیصلہ مزید چھان بین کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ ممکن ہے خود حنیف نقوی اس معاملے میں اگلا قدم اٹھائیں۔ ہم منتظر رہیں گے۔

بشکریہ مجلّہ 'ادراک' گوپال پور، کتاب ہفتم حنیف نقوی نمبر نومبر 2010، مدیر اعزازی: ڈاکٹر سید حسن عباس، زیر اہتمام: مرکز تحقیقاتِ اردو و فارسی گوپال پور، باقر گنج، سیوان (بہار)

■

انوار الیقین

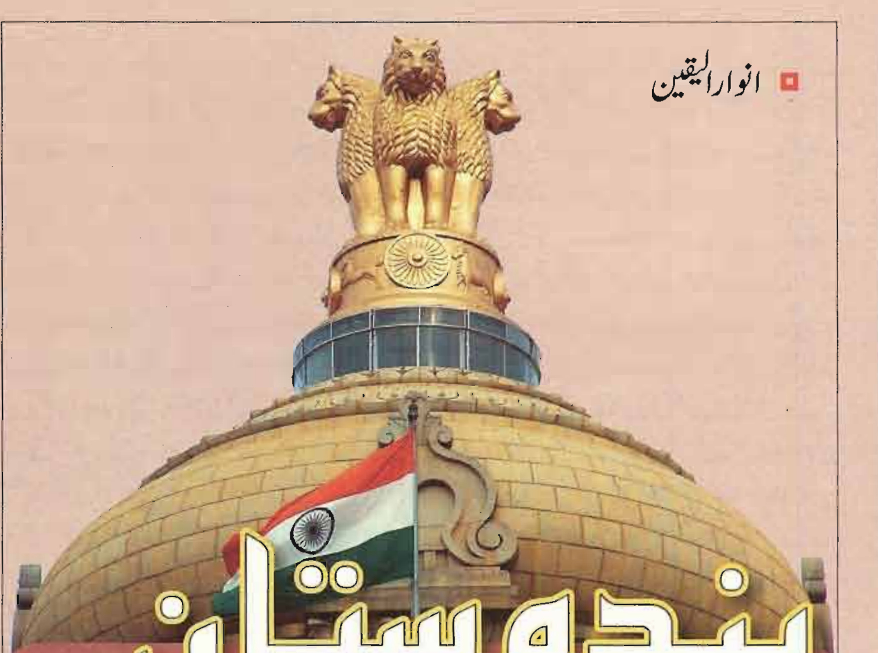

ہندوستان کے آئین میں اردو کی حیثیت

'ہندوستانی آئین اور اردو' کو اس مرتبہ کور اسٹوری کا موضوع بنانے کے پیچھے بنیادی طور پر مقصد کارفرما ہے کہ آئین اور قانون کے ماہرین کی آرا کی روشنی میں اردو کی قومی حیثیت کو بھی سمجھا جاسکے اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے وہ پہلو بھی سامنے آسکیں، جن پر ابھی تک توجہ نہیں دی گئی ہے۔ کور اسٹوری میں شامل مضامین سے یہ سمجھنے میں یقیناً کچھ نہ کچھ مدد ضرور ملے گی کہ آئین کے موجودہ فریم ورک میں ایسا بہت کچھ موجود ہے جس کا فائدہ اٹھا کر اردو سماج، حکومتوں کی عنایات کا منتظر رہے بغیر اپنی جمہوری و آئینی طاقت کے بل پر اپنی زبان کو اور پھیلا سکتا ہے۔ انوار الیقین صاحب نے جہاں اپنے مضمون کو اردو زبان کی آئینی حیثیت کی تفہیم تک محدود رکھا ہے، وہیں خواجہ عبدالمنتقم نے اردو کے مسائل و وسائل پر زیادہ توجہ دی ہے اور محمد عبدالقدیر صاحب نے اردو کے فروغ کی نئی سمتوں کی طرف کچھ اشارے کیے ہیں۔ ان مضامین پر آپ کی آرا کا انتظار رہے گا۔ (ادارہ)

آزادی سے قبل نصف صدی کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو بات یہی نکلتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو ملک کی سب سے بڑی آبادیاں تھیں ایک میل جول اور بھائی چارے کا ماحول رہا تھا۔ اگرچہ کبھی کبھی کہیں کہیں دو فرقوں کے درمیان حالات وقتی طور پر کشیدہ ہوجاتے تھے، لیکن ویسے ایک پرسکون ماحول ان کی سماجی زندگی کا بنیادی پہلو تھا۔ دونوں ایک غیر ملکی حکومت کی رعایا تھا اور ان کے درمیان کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جس کی نوعیت سیاسی ہو، ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر ایک طویل جنگ ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے لڑی تھی۔

آزادی سے چند دہائی قبل یہ طے ہوگیا کہ آزاد ہندوستان میں ایک پارلیمانی جمہوری نظام ہوگا۔ پارلیمانی نظام میں حکومت اُن کی ہوتی ہے جنھیں قانون ساز مجالس میں اکثریت حاصل ہو۔ اس وقت ہندوستان میں ہندوؤں کی تعداد کوئی 85 فیصد تھی اس طرح اکثریت کا مطلب ہندو اکثریت تھا۔ بقیہ آبادی میں مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی اور اینگلو انڈین تھے۔ یہ سیاسی اعتبار سے تسلیم شدہ اقلیتیں تھیں۔ پہلی تین مذہبی اقلیت تھیں، چوتھی مذہبی اور نسلی اور پانچویں نسل، زبان اور مذہب کے اعتبار سے اقلیت تھیں۔ ان کے علاوہ بے شمار ایسی اکائیاں تھیں جن کی اپنی الگ زبان اور ثقافت تھی۔ وہ عام آبادی میں ضم ہوکر اپنا تشخص اور اپنی پہچان کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ تعداد کی کمی کی وجہ سے ان کے ساتھ امتیازی سلوک ہو۔

آزاد ہندوستان کے لیے ایک آئین ساز اسمبلی کی تشکیل 9 دسمبر 1946 کو ہوئی، جس نے آئین کی تکمیل نومبر 1949 میں کی۔ اسمبلی کے قیام کے دوران دو بڑے مسائل زیر بحث رہے۔ ایک یہ کہ جمہوری نظام میں مسلمانوں اور دوسری سیاسی اقلیتوں کو کس طرح کے سیاسی حقوق حاصل ہوں جس کے ذریعے انھیں پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں تعداد کے لحاظ سے نمائندگی حاصل ہو۔ اس مسئلے پر کانگریس یہی چاہتی رہی کہ کوئی ایسا نتیجہ نکلے جو اکثریت اور اقلیتوں دونوں کے لیے قابل قبول ہو۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اقلیتوں کے لیے کچھ ایسے حقوق کی ضمانت دی جائے جن کا تعلق ان کی زبان، تعلیم اور ثقافت سے ہو۔

لیکن جب ملک کا سیاسی پس منظر تیزی سے بدلنے لگا اور یہ طے ہوگیا کہ ہندوستان کو مذہبی بنیاد پر تقسیم ہونا ہے تو اسمبلی کے اندر ماحول بدل گیا۔ تقسیم کے اعلان کے نتیجے میں قتل و غارت گری، ہندوؤں اور مسلمانوں میں آپسی منافرت، پاکستان میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کا اعلان، مہاتما گاندھی کا قتل، اور سماجی افراتفری کے حالات وہ عوامل تھے جنھوں نے اسمبلی کے اندر سارا ماحول ہی بدل دیا۔ اب اسمبلی میں اقلیتوں کے سیاسی حقوق کے تحفظات کی بات کرنے والا کوئی نہ رہا۔

لیکن اسمبلی نے اگرچہ اقلیتوں کو کسی طرح کے سیاسی حقوق دینے سے انکار کردیا، اس نے اپنے اس موقف سے انحراف نہیں کیا کہ اقلیتوں کو غیر سیاسی نوعیت کے حقوق دیے جائیں اور آئین میں اُن کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔ اسمبلی نے آئین میں جن حقوق کی ضمانت دی ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: آرٹیکل (دفعہ) (1) 29 میں تحریر کیا گیا ہے کہ ہندوستانی شہریوں میں اگر کسی طبقے کی اپنی الگ زبان، طرزِ تحریر یا ثقافت ہے تو اُسے ان کے تحفظ کا حق حاصل ہوگا۔

آرٹیکل (2) 29 نے صراحت کی کہ کسی بھی شہری کو کسی ایسے تعلیمی ادارے میں جو سرکاری ہو یا جسے سرکار کی طرف سے مالی امداد ملتی ہو محض مذہب، نسل، ذات یا

زبان کی بنیاد پر داخلہ لینے سے نہیں روکا جائے گا۔ آرٹیکل (1) 30 میں تحریر کیا گیا کہ سبھی اقلیتوں کو، خواہ ان کی بنیاد مذہب ہو یا زبان، یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرسکیں اور ان کو چلا سکیں۔

آرٹیکل A 350 میں تحریر کیا گیا کہ ہر ریاست اور اس کے سبھی صاحب اختیار افراد یا اداروں پر لازم ہوگا کہ وہ اقلیتی طبقوں کے بچوں کی ابتدائی (پرائمری) تعلیم اُن کی اپنی مادری زبان میں ہونے کے لیے مناسب سہولتیں بہم پہنچائیں۔ مزید یہ کہ صدر جمہوریہ کو اختیار ہوگا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے کسی بھی ریاست کو ہدایات جاری کرے۔

آرٹیکل B 350 کے تحت صدر جمہوریہ کو اختیار دیا گیا کہ وہ ایک اسپیشل آفیسر کا تقرر کرے جو ان تحفظات پر عمل درآمد کو یقینی بنائے جو آئین کے تحت لسانی اقلیتوں کو حاصل ہیں اور صدر جمہوریہ کو متعلقہ سبھی امور پر اپنی رپورٹ پیش کرتا رہے۔ یہ بھی تحریر کیا گیا کہ ایسی رپورٹوں کو پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا، اور متعلقہ ریاستی حکومتوں کو بھیجا جائے گا۔

حق کی بات تو یہ ہے کہ ایسے وقت میں جب مذہبی جنون، تعصب اور سیاسی رقابت نے بڑے پیمانے پر انتشار کی کیفیت پیدا کردی تھی، اقلیتوں کے لیے آئین میں کچھ تعلیمی، لسانی اور ثقافتی حقوق کا اندراج اور ان کے تحفظ کی ضمانت دینا آئین بنانے والوں کی فراخ دلی، دور اندیشی اور معقول پسندی کی بہترین مثالیں ہیں۔

جہاں تک اردو زبان کی آئین میں حیثیت کا سوال ہے جو اس مختصر مضمون کا موضوع ہے چند نکات کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ 1950 سے (جب آئین نافذ کیا گیا) اب تک سیکڑوں مقدمات آرٹیکل 29 اور 30 میں مندرج حقوق کو لے کر مختلف ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ کے سامنے آئے ہیں۔ عدالتوں نے اپنے فیصلوں میں ان حقوق کے مختلف پہلوؤں کی تشریح و توضیح کی ہے۔ ان پر نظر ڈالنے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ مختصر درج ذیل ہے:

(1) اردو زبان کی اپنی ایک جداگانہ حیثیت ہے جس کا اپنا مخصوص طرز تحریر ہے اور جو ایک مخصوص تہذیب و ثقافت کا حصہ ہے۔ آرٹیکل (1) 29 کے تحت اردو کو اسی حیثیت میں برقرار رکھنے اور اس کی ترویج و ترقی کی ضمانت حاصل ہے۔

(2) جہاں تک اس کا سوال ہے کہ کیا کسی اقلیت کو اختیار ہے کہ وہ اپنی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا سکے، تو ایسا کوئی حق آئین میں صراحتاً نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن یہ حق آرٹیکل (1) 29 اور (1) 30 میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اُس میں مضمر ہے۔ اگرچہ آرٹیکل (1) 29 میں ایسے 'ذرائع' کا ذکر نہیں ہے جن کو اپنا کر زبان یا رسم الخط کی حفاظت کی جاسکے، عدالتی فیصلوں میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ آرٹیکل (1) 29 میں یہ حق پوشیدہ ہے۔ مزید یہ کہ آرٹیکل (1) 30 میں اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ نے ایسے فیصلوں میں بار بار کہا کہ زبان کی ترقی کے لیے تعلیمی ادارے ایک موثر ذریعہ ہیں۔ ان عدالتوں نے اپنے فیصلوں میں وضاحت کی ہے کہ آرٹیکل 29 اور 30 میں جو طرز تحریر استعمال کی گئی ہے اس میں ذریعہ (medium of instruction) کے انتخاب کا حق مضمر ہے۔

(3) اس سوال پر کہ کیا ایسے تعلیمی ادارے کو حکومت سے تسلیم کرانے کا حق (recognition) ہے جس میں اردو ذریعہ تعلیم ہو تو عدالتی فیصلوں سے اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ یہ حق آرٹیکل (1) 30 میں مضمر ہے اگرچہ اس آرٹیکل میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اس میں اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ عدالتوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ حکومت کسی ادارے کو تسلیم کرنے کے لیے کچھ شرائط عائد کرنے کا حق رکھتی ہے لیکن یہ شرائط ایسی بھی نہیں ہوسکتیں کہ جن سے ادارہ قائم کرنے کا حق ہی ختم ہوجائے۔

(4) اس سوال کا کہ کیا اردو میڈیم ادارے کو کسی یونیورسٹی سے الحاق کا حق ہے، جواب یہ ہے کہ یہ حق بھی حاصل ہے۔ ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ نے اپنے فیصلوں میں الحاق کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اس لیے کہ ڈگری اور سرٹیفکیٹ دینے کا حق تو صرف یونیورسٹی یا انسٹی ٹیوٹ جیسے اداروں کو ہی ہوتا ہے۔ البتہ الحاق کے لیے یہ ادارے شرائط عائد کرسکتے ہیں، بشرطیکہ شرائط مناسب و معقول ہوں۔

(5) جہاں تک سرکاری امداد کا سوال ہے، آرٹیکل (2) 30 نے مملکت پر یہ پابندی عائد کی ہے کہ امداد دیتے وقت کسی تعلیمی ادارے کے ساتھ امتیاز محض اس بنا پر نہیں برتا جاسکتا کہ وہ ادارہ کسی اقلیت کے زیر انتظام ہے۔ فیصلوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امداد حاصل کرنے کا حق آرٹیکل (2) 29 اور (2) 30 میں مضمر ہے۔ عدالتوں کا کہنا ہے کہ محض پرائیویٹ عطیات پر تعلیمی اداروں کو چلانا مشکل بلکہ اکثر صورتوں میں ناممکن ہے۔ اس لیے سرکاری امداد کا حق تعلیمی ادارے قائم کرنے کے حق میں مضمر ہے۔ لیکن مملکت کو معقول شرائط عائد کرنے کا حق ہے۔

(6) ایک سوال یہ ہے کہ کیا اقلیتی تعلیمی اداروں میں شیڈولڈ کاسٹس (درجہ فہرست ذاتوں) اور شیڈولڈ ٹرائبس درج فہرست قبائل) یا او بی سی (دیگر پسماندہ طبقات) کے طلبا کے لیے نشستیں مختص (ریزرو) کی جاسکتی ہیں جواب نفی میں ہے۔ سنہ 2005 میں آئین میں ترمیم کی گئی جس کے ذریعے آرٹیکل (5) 15 میں صراحت کی گئی کہ جہاں تک درج فہرست ذاتوں اور قبائل یا تعلیمی اعتبار سے پسماندہ طبقات کا سوال ہے مملکت کو اختیار ہوگا کہ ان کے لیے تعلیمی اداروں میں داخلوں کا اہتمام کرے خواہ ان اداروں کو سرکاری امداد ملتی ہو یا نہیں۔

لیکن وضاحت کی کہ اس کا اطلاق اقلیتی تعلیمی اداروں پر نہیں ہوگا جنھیں آرٹیکل (1) 30 میں اپنے طور پر تعلیمی ادارے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔

اسی اصول کی مزید وضاحت پارلیمنٹ 2006 میں ایک قانون بنا کر کردی جس کا تعلق مرکزی تعلیمی اداروں میں داخلوں میں ریزرویشن سے ہے۔

جہاں تک اس کا سوال ہے کہ کیا اردو کو وہ حق مل سکا جس کی وہ حقدار تھی تو چند سطور لکھنا ضروری ہے۔ مغل حکمرانوں کے دور میں فارسی سرکاری زبان تھی۔ 1837 میں فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان بن گئی اور اس کا استعمال فارسی رسم الخط میں سرکاری، عدالتی اور تعلیمی امور میں ہونے لگا۔ سنہ 1900 میں انگریزی حکومت کی طرف سے ایک حکم نامے کے ذریعے اردو اور ہندی کو برابر کا درجہ دے دیا گیا اور دونوں کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ لیکن عملاً ہندوستان کے اُن علاقوں میں جو اب مختلف شمال مغربی ریاستوں میں آتے ہیں، اردو کو ترجیحی حیثیت حاصل رہی۔ ہندی کی سرکاری حیثیت محض علامتی تھی۔ اس لیے کہ شمال مغربی صوبوں میں سرکاری کام کاج میں عام طور پر اردو کا ہی استعمال ہوتا رہا۔

آئین ہند میں (جسے 1950 میں اپنایا گیا) اعلان کیا گیا ہندی دیوناگری رسم الخط کے ساتھ مرکزی سرکار کی زبان ہوگی۔ ساتھ میں کہا گیا کہ انگریزی زبان 15 سال یعنی 1965 تک سرکاری زبان رہے گی۔ پارلیمنٹ کو اختیار دیا گیا کہ وہ اس مدت میں توسیع کرسکے۔ لیکن مختلف ریاستوں اور حلقوں سے ہندی کی سرکاری حیثیت کی مخالفت ہوتی رہی۔ اس لیے پارلیمنٹ انگریزی زبان کی مدت بڑھاتی رہی۔ اس طرح انگریزی اب بھی سرکاری زبان کی حیثیت میں استعمال ہوتی ہے اور ہندی کے ساتھ ابھی بھی مرکز اور بعض ریاستوں میں استعمال ہوتی ہے۔ انگریزی کئی ریاستوں میں وہاں کی

مقامی زبان کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔

ریاستی سطح پر ہندی بہار، جھارکھنڈ، اتراکھنڈ مدھیہ پردیش، راجستھان، اترپردیش، چھتیس گڑھ، ہماچل پردیش، ہریانہ اور دہلی کی سرکاری زبان ہے لیکن ان ریاستوں کو اختیار ہے کہ وہ ہندی کے ساتھ کسی دوسری زبان کو بھی سرکاری زبان کا درجہ دے سکتی ہیں۔ مشرقی اور مغربی ہند میں ہر ریاست میں بولی جانے والی زبان وہاں کی سرکاری زبان ہے۔ آئین کے آٹھویں شیڈول میں درج ہے کہ اردو جموں وکشمیر، آندھرا، دہلی، بہار، اترپردیش اور اتراکھنڈ میں بولی جاتی ہے۔ زبان کے معاملے میں پارلیمنٹ اور ریاستی مجالس قانون ساز دونوں کو قانون بنانے کا اختیار ہے۔ ریاستوں میں اردو کی پوزیشن کچھ اس طرح ہے:

1. آندھرا میں سرکاری زبان تیلگو ہے۔ ساتھ ہی اردو کو بھی سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اردو کچھ اضلاع میں مخصوص مقاصد کے لیے استعمال ہوسکتی ہے۔

2. اتراکھنڈ میں ہندی سرکاری زبان ہے۔ ساتھ ہی اردو اور انگریزی کو بھی سرکاری درجہ حاصل ہے۔ لیکن اردو کا استعمال کن مقاصد کے لیے ہوگا اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔

3. بہار میں اردو کو ایک ایڈیشنل سرکاری زبان کی حیثیت سات مخصوص مقاصد کے لیے حاصل ہے۔ یعنی عام شکایات (representation) داخل کرنے کے لیے، سرکار کے پاس دستاویزات داخل کرنے کے لیے، رولس، ریگولیشنز، اور نوٹس وغیرہ جاری کرنے کے لیے، اہم اعلانیے اور حکم نامے جاری کرنے کے لیے گورنمنٹ گزٹ شائع کرنے، اور سرکاری دفاتر اور اہم مقامات پر سائین بورڈ لگوانے کے لیے۔ (بہار کے بارے میں متذکرہ معلومات کمشنر برائے لسانی اقلیات کی 43 ویں رپورٹ مجریہ سنہ 204 پر مشتمل ہیں)

عمر خالدی نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ بہار میں یوپی کے مقابلے میں اردو کی پوزیشن بہتر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بہار میں نسبتاً اردو کی مخالفت سرکاری حلقوں میں کم ہے۔ متذکرہ کمشنر کی رپورٹ کے مطابق اردو پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں بعض جگہوں پر پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ 1980 کے ایک قانون کے ذریعے جگن ناتھ مشرا نے جب وہ چیف منسٹر تھے اور میتھلی زبان بولتے تھے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا تھا۔

4. مغربی بنگال میں 3 فروری سنہ 2012 کو حکومت نے اردو کو دوسری زبان کا درجہ دیا ہے۔ اس کا اطلاق ان علاقوں میں ہوگا جہاں آبادی کے دس فیصدی لوگ اردو بولتے ہیں۔ ابتدائی طور پر ایسے دس علاقوں کی نشاندہی کی گئی۔

5. یوپی میں سرکاری زبان ہندی ہے اور ساتھ میں اردو کو بھی یہ درجہ دیا گیا ہے۔ اردو کی سب سے خراب حیثیت اسی ریاست میں ہے۔

آزادی کے فوراً بعد سبھی بڑی زبانوں کو اُن کا صحیح مقام مل گیا لیکن اردو کو جس کے بولنے، لکھنے اور سمجھنے والوں کی ایک کثیر تعداد ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہے اپنا کوئی ایسا مقام حاصل نہ کرسکی جس میں اس کی ترویج وترقی کی راہیں نکل سکتیں۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہندوستان میں ایسا کوئی جغرافیائی علاقہ نہیں ہے (جیسے تامل ناڈو میں تامل کا) جس میں اردو والوں کی اکثریت ہو۔ اس کے بولنے والے ہر علاقے میں اقلیت میں ہیں۔

1837 میں فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان بن گئی اور اس کا استعمال فارسی رسم الخط میں سرکاری، عدالتی اور تعلیمی امور میں ہونے لگا۔ سنہ 1900 میں انگریزی حکومت کی طرف سے ایک حکم نامے کے ذریعے اردو اور ہندی کو برابر کا درجہ دے دیا گیا اور دونوں کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ لیکن عملاً ہندوستان کے اُن علاقوں میں جو اب مختلف شمال مغربی ریاستوں میں آتے ھیں، اردو کو ترجیحی حیثیت حاصل رہی۔

اس زمانے میں سیکولرزم کو ذہنی طور پر قبول نہ کرنے والے بعض رجعت پسند حلقے یہ کہتے رہے کہ اردو بولنے والوں نے ملک کی تقسیم کروائی ہے اور اردو کی مانگ علاحدگی پسندی کی نشانی ہے۔ اردو ترکوں اور منگولوں کی زبان ہے۔ اردو کوئی الگ زبان نہیں ہے بلکہ وہ تو ہندی کا ہی ایک روپ ہے۔ اردو والوں کو اپنا رسم الخط بدل لینا چاہیے اور اسی طرح لکھنا چاہیے جیسے ہندی لکھی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہی غلطی لکھنؤ یونیورسٹی میں ہمارے اردو کے محبوب استاد اور ملک کے معروف اردو نقاد سید احتشام حسین سے ہوگئی تھی لیکن بعد میں ایک مضمون لکھ کر انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

پنڈت جواہر لعل نہرو اردو بولتے تھے۔ اسے برملا اپنی مادری زبان کہتے تھے اور چاہتے تھے کہ اردو کی بقا کے لیے کچھ اقدامات کیے جائیں۔ وہ یوپی میں اردو کی حالت سے مطمئن نہیں تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وفاقی حدبندیوں کے تحت مرکزی حکومت یوپی کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتی تھی اور جو کرسکتی تھی وہ یہ کہ اردو کی بقا وترقی کے لیے جو رقم ہوسکے مہیا کرائی جائے۔ مسز اندرا گاندھی اردو کی ترقی کے لیے یا اُسے تنزلی سے بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھیں۔ اندرا گاندھی نے گجرال کمیٹی کی تشکیل 1972 میں کروائی، جس نے اپنی رپورٹ 1975 میں دی۔ اس میں اردو کی ترقی کے لیے تفصیلی سفارشات تھیں۔ ایک ذیلی کمیٹی آل احمد سرور کی سربراہی میں قائم ہوئی جس نے اپنی رپورٹ 1983 میں پیش کی۔ پھر علی سردار جعفری کی سربراہی میں ایک اور کمیٹی بنی جس نے 1990 میں اپنی رپورٹ پیش کی۔

آج کی صورت حال یہ ہے کہ اگر چہ ہندوستان میں اردو اتنی ترقی نہ پاسکی جتنی ترقی کی وہ مستحق تھی، لیکن ملک کی اکثریت کے دلوں میں اس نے خاص جگہ حاصل کرلی ہے اور اب اردو کے خلاف ایسی کوئی آواز نہیں اٹھتی جیسی تقسیم وطن کے فوراً بعد سنائی دیا کرتی تھی۔ عالمی سطح پر بھی اس نے اپنا مقام بنایا ہے۔ پاکستان میں وہ ایک سرکاری زبان ہے ہی۔ اس نے انگلستان، امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا اور وسط ایشیا میں ایک معروف زبان کی پہچان بنائی ہے۔ اس لیے کہ ان جگہوں پر ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں کی خاصی تعداد ہے جو اردو استعمال کرتی ہے۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا کے 2 فروری کے اڈیٹوریل میں لکھا ہے کہ ایک سروے کے مطابق برطانیہ میں انگریزی کے علاوہ جو زبانیں استعمال ہوتی ہیں اُن میں پولینڈ کی زبان پوزیشن نمبر ایک پر ہے۔ دوسرے پر پنجابی اور تیسرے نمبر پر اردو ہے۔ لیکن ساتھ میں اڈیٹوریل میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ پنجابی دوسرے نمبر پر ہے لیکن عملاً اردو پولش زبان کے بعد سب سے زیادہ بولنے، لکھنے اور پڑھنے والی زبان ہے۔ مزید یہ کہ انگریزی کے بعد سب سے زیادہ اخبارات ورسائل اردو زبان میں ہی نکلتے ہیں۔

یہ سب اچھی خبریں ہیں اور حضرت داغ کا شعر کہ ''سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے'' آج بھی صادق آتا ہے۔

(مضمون نگار علی گڑھ یونیورسٹی کی قانون کی فیکلٹی میں پروفیسر رہ چکے ہیں۔ 1992 میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کوالالمپور کی قانون کی فیکلٹی میں Professor of Public Law and Jurisprudence کی حیثیت سے جوائن کیا۔ 2008 میں مستقلاً ہندوستان واپس آگئے۔)

■

Professor Anwarul Yaqin, B-304, Stellor Kings Court, F-32, Sector 50 Noida

خواجہ عبدالمنتقم

جمہوری ہندوستان میں اردو کا منظر نامہ

اردو ادب کی شخصیتِ سربہ فلک ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے حیدرآباد میں منعقد ایک یادگاری خطبے میں مغنیٔ تبسم اور پروفیسر شہریار کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اردو کے حوالے سے یہ فرمایا تھا کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے مگر اسے جغرافیائی حدود میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو ہم سب کے دل میں رہتی ہے اور یہی اس کا مسکن ہے۔ موصوف کا یہ قول ایک ادبی مفروضہ ہے لیکن اگر کسی ادبی مفروضے کو قانون کی حمایت حاصل ہوجائے تو وہ مفروضہ، قانونی مفروضہ (Legal Fiction) کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور اگر کہیں اس قانونی مفروضے کو خوش نصیبی سے آئینی تحفظ حاصل ہوجائے تو اس کی بلند مرتبت کو سلام۔ خوش قسمتی سے اردو کو روز اول سے یعنی دستور ہند کی تاریخ نفاذ سے ہی یہ درجہ حاصل ہے۔

ہندوستانی زبانوں کو مردم شماری کے اصولوں کے مطابق سلسلۂ مدارج کے اعتبار سے 4 زمروں میں بانٹا گیا ہے۔ پہلے زمرے میں مرکزی حکومت میں سرکاری زبان ہندی اور انگریزی کو رکھا گیا ہے، دوسرے میں ریاستی سرکاری زبانوں کو، تیسرے میں ان زبانوں کو شامل کیا گیا ہے جنھیں سرکاری زبان کا درجہ حاصل نہیں ہے اور انھیں بہت ہی کم لوگ بولتے ہیں اور چوتھے میں ان زبانوں کو رکھا گیا ہے جنھیں آدی واسی و ملک کے قدیم باشندے بولتے ہیں جیسے ناگا وغیرہ۔ اس سلسلۂ مدارج کے مطابق اردو زمرۂ دوئم میں آتی ہے چونکہ یہ آئین کے 8ویں جدول میں قومی زبانوں کی فہرست میں شامل ہونے کے ساتھ ساتھ ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری زبان بھی ہے اور اتر پردیش، آندھرا پردیش، اتراکھنڈ، بنگال، بہار و دہلی کی، حسب صورت، ثانوی یا اضافی سرکاری زبان بھی۔ اگر اردو کو آئینی درجہ بندی میں یہ مرتبہ نہ دیا گیا ہوتا اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں سہ لسانی فارمولہ نہ اپنایا گیا ہوتا تو اردو ثقافتی وابستگی کی اتنی طاقتور علامت بن کر ہمارے کثیر اللّسان ملک کی لسانی تکثیریت کے افق پر نہ ابھرتی۔ متذکرہ بالا جدول میں درج زبانوں کو معنوی طور پر قومی زبانوں کا درجہ دیا گیا ہے اور ان زبانوں کی نوعیت کے بارے میں کوئی وضاحت یا صراحت نہیں کی گئی ہے مگر اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ سب زبانیں ہمارے ملک کی اپنی زبانیں ہیں اور یہیں پلی بڑھی ہیں۔

فلسفۂ انسانیت کی رو سے خیالات اور احساسات کے اظہار کا سب سے معتبر اور مؤثر ذریعہ زبان ہوتی ہے اور وہ بھی مادری زبان۔ زبان کا استعمال مختلف طریقے سے کیا جاسکتا ہے۔ کوئی اس کا استعمال عبارت کے ذریعے کرتا ہے (یعنی جب خیال تحریری شکل اختیار کرلیتا ہے)، کوئی اشارت کے ذریعے، کوئی صوت خوش کن یا صوت دل خراش کے ذریعے اور کوئی ناز و ادا کے ذریعے۔ اس طرح زبان ہر شکل میں یا کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہتی ہے۔ ان تمام طریقہ ہائے اظہار کو قانونی حیثیت حاصل ہے البتہ اس کے استعمال کے قانونی حدود ضرور مقرر ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی ایسے ملک کا شہری ہے جہاں ملک کے تمام شہریوں کو اپنی جداگانہ زبان، رسم الخط یا ثقافت محفوظ رکھنے کا آئینی حق حاصل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اظہار خیال کی مکمل آزادی بھی، تو اس سے بڑا مقدر کا سکندر کوئی نہیں ہوسکتا۔ ہمارے ملک کا آئین بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ ہمارے آئین کی داغ بیل پنڈت جواہر لعل نہرو کی تحریک پر 13 دسمبر 1946 کو آئین ساز اسمبلی میں پیش کردہ ایک تجویز، جسے عرف عام میں Objectives Resolution کہا جاتا ہے، کی شکل میں پڑی۔ اس تجویز کو آئین ساز اسمبلی نے 22 جنوری 1947 کو اتفاق رائے سے منظوری دے دی۔ اس وقت آئین ساز اسمبلی کے اہم ارکان تھے پنڈت جواہر لعل نہرو، ڈاکٹر امبیڈکر، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد، گووند ولبھ پنت، سردار پٹیل، خان عبدالغفار خان، گوپال سوامی آینگر، ٹی ٹیکر شنچاری، الادی کرشنا سوامی ایّر، ایچ این کنزرو، کے وی شاہ، آچاریہ کرپلانی اور ڈاکٹر رادھا کرشنن وغیرہ۔ یہی تجویز بھارت کے آئین کی تمہید کی

بنیاد بنی اور ڈاکٹر امبیڈکر کی سربراہی میں 19 اگست 1947 کو ایک ڈرافٹنگ کمیٹی وجود میں آئی۔ فروری 1948 کو اس قانون کا مسودہ (ڈرافٹ) شائع کیا گیا۔ 26 جنوری 1949 کو آئین کو منظوری دے دی گئی اور اس کا مکمل اطلاق* 26 جنوری 1950 کو ہوا۔

آیئے اب مختصراً اس بات پر غور کریں کہ آئین میں اردو کو کس حد تک بالواسطہ یا بلاواسطہ تحفظ فراہم کیا گیا ہے اور لسانی و مذہبی مفادات کو کس حد تک ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی جائزہ لیں کہ اردو والوں نے اردو کے لیے کیا کیا اور یہ کہ کیا کسی زبان کی ترقی کے لیے سرکاری سرپرستی ناگزیر ہے۔

کسی بھی قانون کی تمہید میں اصل دفعات اور اس قانون کے نفاذ کی ضرورت اور غرض وغایت بیان کی جاتی ہے۔ بھارت کے آئین کی تمہید پر بھی محض ایک نظر طائرانہ ڈالنے سے ہی یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی جمہوری حکومت کا قیام مقصود ہے جس میں سبھی لوگوں کو مذہبی آزادی، آزادیِ خیال وحق مساوات حاصل ہو اور ان کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں انصاف کیا جائے۔ ایسی صورت میں کم از کم یہ قیاس تو نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ اردو کو آئینی تحفظ فراہم کرنے کے معاملے میں کسی بخل سے کام لیا گیا ہے۔ کسی کثیر اللّسان ملک میں لسانی تکثیریت وہاں کی ثقافتی وابستگی کا مظہر ہوتی ہے اور باہمی میل جول اور یگانگت کی مضبوط علامت۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے آئین میں درج بنیادی فرائض میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ ہر شہری کا یہ فرض ہے کہ وہ آئین پر کاربند رہے اور مذہبی، لسانی، علاقائی وطبقاتی تفرقات سے قطع نظر عوام کے مابین یکجہتی اور عام بھائی چارے کے جذبے کو فروغ دے۔ جہاں تک اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ کا سوال ہے تو آئین کی دفعہ 29 میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ ہندوستان کے کسی بھی حصے میں رہنے والے شہریوں کو اپنی الگ جداگانہ زبان، رسم الخط یا ثقافت کو محفوظ رکھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دفعہ 30 میں یہ توضیح کی گئی ہے کہ تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بنیاد پر ہوں یا زبان کی، اپنے پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا اور حکومت تعلیمی اداروں کو امداد عطا کرنے میں کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بنا پر امتیاز نہ برتے گی کہ وہ

کسی مذہبی یا لسانی اقلیت کے زیر انتظام ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان دونوں دفعات کو بنیادی حقوق کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ کسی بھی ملک کے آئین یا دستور یا قانون اساسی میں بنیادی حقوق کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو جسمانی نظام میں شہ رگ کی اور اگر کسی بھی شخص کے کسی بھی طرح کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو وہ اس کے خلاف ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں رٹ دائر کرسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آئین کی دفعہ 19 میں آزادیِ خیال کا حق بھی عطا کیا گیا ہے اور اس آزادی کا اظہار ہم کسی بھی زبان میں کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آئین میں مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا التزام بھی ہے اور دفعہ 21 الف شامل کرنے کے بعد اس کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے چونکہ اس دفعہ میں حکومت پر اس بات کی ذمے داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ 6 سے 14 سال تک کی عمر کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم مہیا کرائی جائے اور ظاہر بات ہے کہ اس کام کے لیے مادری زبان سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آئین میں ابتدائی درجے میں مادری زبان میں تعلیم دینے کی سہولتیں فراہم کرنے سے متعلق دفعہ 350 الف شامل کی گئی ہے۔ اس دفعہ میں اس بات کی مکمل وضاحت کردی گئی ہے کہ ہر ریاست اور ریاست کے اندر ہر مقامی حاکم کی کوشش ہوگی کہ لسانی اقلیتی زمروں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو تعلیم کے ابتدائی درجے میں مادری زبان میں تعلیم دینے کی کافی سہولتیں مہیا کرے اور ساتھ ساتھ یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اس ضمن میں صدر مملکت بھی ایسی سہولیات مہیا کرانے کے لیے ضروری ہدایات جاری کرسکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ دفعہ 350 ب کے تحت لسانی اقلیتوں کے لیے کمشنر کی تقرری کا بھی انتظام کیا گیا ہے اور اسے اس بات کی ہدایت دی گئی ہے کہ وہ آئین کے تحت لسانی اقلیتوں کو آئین کے ذریعے عطا کردہ تحفظات سے متعلق تمام امور کی تفتیش کرے اور صدر مملکت کو اپنی رپورٹ پیش کرے اور صدر مملکت ایسی تمام رپورٹوں کو پارلیمنٹ میں پیش کرائیں اور متعلقہ ریاستی حکومتوں کو بھجوائیں۔ اس کے علاوہ دفعہ 350 میں ہر شخص کو کسی شکایت کے ازالے کے لیے مرکزی یا ریاستی حاکم کو ان زبانوں میں سے کسی بھی زبان میں جو یونین یا کسی ریاست میں، جیسی کہ صورت ہو، استعمال ہوں، عرضداشت پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔

ہمارا آئین Self-enforcing statute یعنی خودبخود نافذ ہونے والا قانون نہیں ہے۔ اس کا نفاذ ایگزیکیٹو کی مختلف ایجنسیوں اور اداروں کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے سرکاری اداروں وایجنسیوں کے خلاف ایسی شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ کچھ افسران اپنی آئینی پابندیوں پر پوری مستعدی کے ساتھ کاربند نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں کبھی کبھی ایسی شکایات موصول ہوتی ہیں کہ مختلف سرکاری اداروں میں اردو میں بھیجی گئی درخواستوں پر غور نہیں کیا گیا یا وہ قبول نہیں کی گئیں یا بینکوں میں اردو میں دستخط والے چیک قبول نہیں کیے گئے لیکن جب بھی ایسی شکایتیں موصول ہوتی ہیں تو سرکاران پر مناسب کارروائی کرتی ہے اور ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جہاں پر مستعدی نہ برتنے والے یا قصوروار افسران وعہدیداران کے خلاف تادیبی کارروائی بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ عوام مختلف محکموں کے لیے سرکار کے ذریعے مقرر کیے گئے Ombudsmen (محتسب اعلیٰ) سے بھی اس طرح کی شکایتوں کے ازالے کے لیے رجوع کرسکتے ہیں اور ابھی تک کم از کم ان اعلیٰ افسران کے خلاف ایسی شکایتیں تقریباً نا کے برابر وصول ہوئی ہیں کہ انھوں نے شکایت کنندگان کی شکایت پر ضروری کارروائی نہ کی ہو۔ یہ راستہ ہمیشہ کھلا ہے اور اس کے لیے کسی قسم کی رسمی کارروائی کی بھی ضرورت نہیں۔ صرف اردوداں حلقے کو ہی نہیں بلکہ دیگر زبان کے بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کو بھی کبھی کبھی اس قسم کی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ کبھی کبھی علاقائی زبانوں میں بشمول اردو تعلیم نہ دینے، کبھی ان زبانوں میں پرچے نہ بنانے، کبھی بروقت کتابیں مہیا نہ کرانے جیسی شکایات آتی رہتی ہیں اور متعلقہ محکمہ جات اس ضمن میں ضروری کارروائی کرتے ہیں اور اگر وہ نہیں کرتے ہیں تو اس کے لیے متضرر افراد کو آئین کے تحت جانکاری حاصل کرنے کا حق حاصل ہے اور وہ اپنے اس حق کا استعمال کرنے کے لیے حق اطلاعات ایکٹ، جسے عرف عام میں آرٹی آئی کہا جاتا ہے، کے تحت عرضداشت داخل کرسکتے ہیں۔

اگرچہ ہندی ملک کی سرکاری زبان ہے یعنی 'راج بھاشا' لیکن دیگر زبانیں بھی، جنھیں 8ویں جدول میں شامل کیا گیا ہے، ملک کی قومی زبانیں ہیں خواہ انھیں علاقائی زبانیں کہا جائے یا کوئی اور نام دیا جائے۔ البتہ ہندی کو راج بھاشا ہونے کے ساتھ ساتھ 'راشٹر بھاشا' ہونے کا

*یہاں لفظ مکمل کا استعمال اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ آئین کی دفعات 5 تا 9، 60، 324، 366، 367، 379، 380، 388، 391، 392 اور 393 چھبیس نومبر 1949 کو ہی نافذ العمل ہوگئی تھیں جبکہ باقی دفعات کا اطلاق 26 جنوری 1950 کو ہوا۔

بھی درجہ حاصل ہے اوراسی پس منظر کوملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دفعہ 351 میں اگرچہ ہندی زبان کوفروغ دینے کے لیےمخصوص ہدایات دی گئی ہیں لیکن وہاں پر بھی یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ ہندی زبان کی اشاعت کواس طرح فروغ دیا جائے کہ وہ بھارت کی مشترکہ تہذیب کےتمام عناصر کے لیے اظہارخیال کے ذریعہ کےطور پر کام آئے اور اس کے مزاج میں دخل انداز ہوئے بغیر ہندوستانی اور 8ویں جدول میں درج بھارت کی دوسری زبانوں میں استعمال ہونے والی تراکیب، اسلوب اور اصطلاحات کو جذب کرکے جہاں بھی ضروری ہو یا مناسب ہوسنسکرت کےساتھ ساتھ دوسری زبانوں* سے اخذ کرکے اس کو مالا مال کرے۔ یہاں پر بھی واضعین نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ہندی کو علاقائی زبانوں،جنھیں قومی زبان کا درجہ بھی حاصل ہے، کے قریب لایا جائے۔ یہ قربت تبھی ممکن ہے جب علاقائی زبانوں کا وجودخطرے میں نہ پڑے اورانھیں بھی آگے بڑھنے کا موقع ملے ۔آج یہی وجہ ہے کہ اردو جس کے بارے میں لوگوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ وہ ایک ہی فرقے کی زبان ہےابھی تک نہ ختم ہوئی ہے، نہ کسی حکومت کی اسے ختم کرنے کی نیت رہی ہے بلکہ میدان صحافت اورمیڈیا میں اردوکا استعمال روز بروز بڑھتاہی جارہاہے۔اس کے علاوہ اردوصرف اس لیےنہیں کہ کسی مخصوص اقلیتی طبقے کو اس کے فروغ سے زیادہ دلچسپی ہے بلکہ وہ دیگر منطقی وجوہات کی بنا پر بھی کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ایک وہ دورتھا جب مقنّنہ، انتظامیہ اورعدلیہ میں ملک کےمختلف حصوں میں اردوکا بھرپوراستعمال کیا جاتا تھااوراردو پورے ملک میں مقبول عام زبان ہونے کےساتھ ساتھ سرکاری کام کاج کی زبان بھی تھی۔آج بھی پولس اور مالگزاری کے ریکارڈ میں اردو کے الفاظ باقاعدہ استعمال کیے جارہے ہیں جبکہ ہندی کوسرکاری درجہ حاصل ہوچکا ہے۔ پولس ریکارڈ میں فردمقبوضگی، آلہٗ جرم، پارچات خون آلود،فرد جامہ تلاشی جیسے الفاظ دیوناگری رسم الخط میں ہی سہی آج بھی استعمال ہورہے ہیں۔اسی طرح مالگزاری کےریکارڈ میں بیعنامہ، کرایہ نامہ، رہن نامہ، انتقال جائیداد جیسے الفاظ باقاعدہ استعمال ہورہے ہیں اور ہوتے رہیں گے چونکہ اس ریکارڈ کی اس کےتلف ہونے تک اور یہاں تک کہ تلف ہونے کے بعدبھی بغرض شہادت اہمیت باقی رہے گی اوران دستاویزات کوان کے اصل رسم الخط میں ہمیشہ ہمیشہ پیش کیا جاتا رہے گا۔ یہاں اس بات کا ذکر بےمحل نہ ہوگا کہ ابھی تک ہماری عدالتوں میں مغلیہ سلطنت کے دور کےفرمان بطورشہادت پیش کیے جارہے ہیں۔یہی نہیں مرکزی حکومت کی وزارت قانون وانصاف کی آفیشل لینگویجز ونگ بھارت کے آئین اور کئی سو مرکزی قوانین کا اردو ترجمہ کرچکی ہے۔ مرکزی قواعد وضوابط کےتحت ان کی اشاعت ریاستی حکومت کی ذمے داری ہے مگراس کا خرچ مرکزی حکومت اٹھاتی ہے۔اردو کے معاملے میں یہ ذمے داری حکومت جموں وکشمیر، جس کی سرکاری زبان اردو ہے، کوسونپی گئی تھی مگر کچھ انتظامی دشواریوں کے باعث یہ کام وہاں نہیں ہوسکا اوراس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے وزارت قانون کی جانب سےاس کام کوکرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ کونسل بھارت کے آئین کے کئی ایڈیشن شائع کرچکی

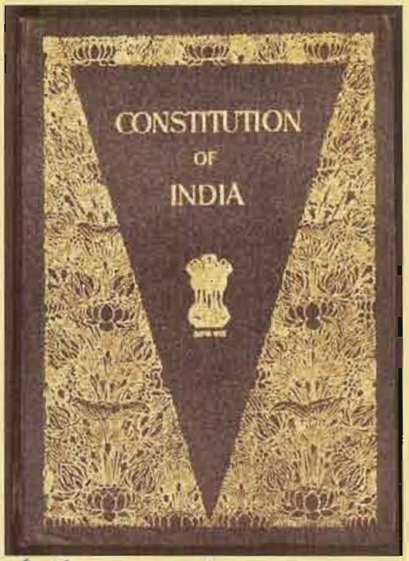

ہے۔ اس کے علاوہ مجموعہ تعزیرات بھارت اور کئی دیگر قوانین کا اردوترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے اور دیگر تراجم زیرطبع ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حکومت ہند نے مستند متن (مرکزی قوانین) ایکٹ،1973 کے ذریعے ان تراجم کووہی قانونی شکل دے دی ہے جو ہندی تراجم کو حاصل ہے۔ اس کے علاوہ وزارت قانون اردومیں قانونی کتب لکھنے وجرائد شائع کرنے جیسے کاموں کے لیے مالی امدادبھی فراہم کرتی ہےمگرافسوس کی بات ہے کہ گزشتہ کئی دہائیوں میں غالباً کسی ایک بھی این جی اویادیگرادارے نے اس اسکیم کا فائدہ نہیں اٹھایا ہےاورنہ ہی ابھی تک کسی بھی ادارے نے کوئی معتبر قانونی رسالہ یا جریدہ شائع کیا ہےجبکہ زندگی کےکسی بھی شعبے میں آگے بڑھنے کے لیے قانون کی جانکاری ہمیشہ کسی نہ کسی طرح مفیدو مددگارثابت ہوتی ہے۔البتہ یہاں اس بات سے بھی انکارنہیں کیا جاسکتا کہ ہرزبان کی ترقی اورفروغ میں کچھ نہ کچھ نشیب وفرازضرور آتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ صرف اردوتک ہی محدودنہیں ہے۔ پنجاب میں پنجابی اور تمل ناڈو میں ہندی سے متعلق بہت سے تنازعات پیدا ہوئے لیکن آہستہ آہستہ ان کاحل نکال لیا گیا۔اردوبھی تقسیم ہند کے بعدایک مشکل دور سے گزری لیکن اب اس کا قافلہ دیگرزبانوں کی طرح تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اورمرکزی حکومت اور ریاستی حکومتیں اس میں کافی دلچسپی لے رہی ہیں۔

اب اردوداں طبقہ خود یہ احتساب کرے کہ اس نے متذکرہ بالا آئینی تحفظات کا کہاں تک فائدہ اٹھایا ہےاور حکومت کے ذریعے فراہم کردہ دیگرسہولیات وقائم کردہ اداروں سے وہ کس حدتک مستفید ہوا ہے۔ یہ مانا کہ ہندی کے ساتھ سرکاری زبان ہونے کے ناطے ترجیحی سلوک کیا گیا، جواس کاحق بھی تھا،اوراس کےفروغ کے لیےزیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچائی گئیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اردوکی ترقی میں بھی حکومت کی طرف سے کوئی روڑے نہیں اٹکائے گئے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو کے فروغ کے لیے بھی بتدریج کچھ نہ کچھ کیا ہی جاتا رہا اور گزشتہ کچھ دہائیوں میں تواس سلسلے میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔مولانا آزاداردو یونیورسٹی کا قیام، جامعہ ہمدرد وجامعہ ملیہ اسلامیہ جہاں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے یا اردو تعلیم کا میڈیم ہےانھیں اقلیتی اداروں کا درجہ عطا کیا جانا، اقلیتوں کےتعلیمی اداروں کے لیےقومی کمیشن کا قیام،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ودیگرتعلیمی اداروں کو جہاں جہاں بھی اردو کی تعلیم کا انتظام ہے انھیں کافی فنڈ فراہم کیا جانا، اردو ترقی بیورو اوراس کے بعدقومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا قیام اور اس کے ذریعے مختلف موضوعات پرمعیاری کتب کی اشاعت، معتبرمصنّفین و اداروں کو حسب صورت کتابوں کی اشاعت اور اردوکمپیوٹر کورس چلانے کے لیے مالی امداد،سمینار،ثقافتی تقاریب، مشاعروں وغیرہ کے لیے مالی اعانت، مختلف ریاستوں میں اردو اکادمیوں کا قیام، فاصلاتی تعلیمی نظام کے ذریعےمختلف یونیورسٹیوں، خودمختار اداروں، این سی پی یو ایل و دیگر مختلف سوسائٹیوں کےذریعےاردوکی ابتدائی تعلیم کا انتظام، اردو اساتذہ کے تربیتی مراکز اور تربیتی کورسز کا انتظام، اردو مصنّفین ومترجمین کی ناکافی تعداد اور دیگر مشکلات کے باوجودنصابی کتابوں کی اردوزبان میں این سی ای آرٹی کے ذریعے فراہمی، مرکزی وریاستی سطح پرمختلف مسابقتی امتحانات جیسے آئی اے ایس، ریلوے وغیرہ میں اردومیں

* جن میں بلاشبہ اردوبھی شامل ہے

साहित्य अकादेमी

ہندوستان میں چل رہی کچھ اردو سرکاری ادارے۔

جوابات لکھنے کی اجازت اور مزید یہ کہ اردو کو کئی ریاستوں میں پہلی یا دوسری سرکاری زبان قرار دیا جانا اس بات کا دستاویزی ثبوت ہے کہ حکومت نے اس سلسلے میں اردو کے فروغ کے لیے برابر دلچسپی لی ہے اور یہ کام تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور متذکرہ بالا اداروں کو دی جانے والی مالی امداد میں برابر اضافہ کیا جاتا رہا ہے۔ البتہ صرف حکومت پر تو اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ اردو والوں اور ان کے مفادات میں دلچسپی رکھنے والی این جی اوز و دیگر اداروں کو بھی اس سلسلے میں آگے بڑھنا ہوگا اور وہ کسی حد تک آگے بڑھ بھی رہے ہیں مگر ابھی انہیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہنوز دلّی دور است۔ اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو کو مزید فعال بنانے اور اس کا دائرۂ کار وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری، نیم سرکاری اور نجی اداروں کو بھی اپنا دائرۂ کار صرف لسانیاتی، ادبی، مطالعاتی، سماجی، بشریاتی اور ثقافتی موضوعات یا علاقائی ادب تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اس میں دیگر علوم کو بھی شامل کرنا چاہیے جیسے، سائنس، انجینئرنگ، فنون لطیفہ، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور قانون وغیرہ۔ اس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنی کوششوں کو ضرور تیز کیا ہے اور خالص ادبی وروایتی موضوعات سے ہٹ کر دیگر علوم کی کتب اور ان کے تراجم نہ صرف شائع کیے ہیں بلکہ بہت کم قیمت پر انھیں عوام، طلبہ و دیگر قارئین تک بروقت پہنچانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو داں طبقے کو چاہیے کہ وہ سرکاری اسکیموں سے پورا پورا فائدہ اٹھائے اور اگر اسے کہیں دقت پیش آتی ہے تو متعلقہ محکموں اور اداروں کو اس سے آگاہ کرے تا کہ اصلاحی کارروائی کی جا سکے۔ وہ مختلف ایوانوں میں اپنے منتخب نمائندوں کو بھی ان مشکلات سے گوش گزار کرا سکتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے وہ آئین کے تحت اپنی مادری زبان اردو کا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں اگر ان کے نمائندے صرف اردو جانتے ہیں یا اردو نہیں بھی جانتے تو وہ بھی کم از کم پارلیمنٹ میں یہ سوالات کسی بھی زبان کا استعمال کرتے ہوئے اٹھا سکتے ہیں چونکہ پارلیمنٹ میں استعمال کی جانے والی زبان سے متعلق آئین کی دفعہ 120 میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ کسی بھی ایسے رکن کو جو اپنے خیالات کا اظہار پورے طور پر ہندی یا انگریزی میں نہ کر سکتا ہو اسے اپنی مادری زبان میں ایوان کو خطاب کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اس کام کے لیے پارلیمنٹ میں سرکاری قواعد وضوابط کے مطابق باقاعدہ مقرر کیے گئے پارلیمانی مترجم ومعبر دستیاب ہیں۔

بدلتے ہوئے حالات میں اردو کو ہم زماں وہم عہد بنانے کے بجائے یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ محض مشاعروں، فلموں اور ناٹکوں کی زبان ہے۔ یہ اس زبان پر ضرب کاری نہیں تو پھر اور کیا ہے؟ یہ سوچ بھی ایک غلط سوچ ہے چونکہ مشاعرے، فلمیں وڈرامے نہ صرف تفریح طبع بلکہ عصری مسائل سے عوام اور ارباب حکومت کو آگاہ کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ان میں صرف گل وبلبل یا جام و مینا کی ہی بات نہیں ہوتی۔ ہم سب پر یہ حقیقت آشکارا ہے اور اسے قاعدۂ کلی کے طور پر بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ ادب، فنون لطیفہ اور اسی طرح کے پروگرام وتخلیقات صرف تفریح طبع کا ذریعہ نہیں ہوتے بلکہ وہ سماج کی خوبیوں وخامیوں کا بھی عکس پیش کرتی ہیں یا بہ الفاظ دیگر سماج کو آئینہ دکھاتی ہیں۔

معدودے چند استثنائی افراد سے معذرت کے ساتھ، علی الاعلان یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو داں طبقے نے بھی اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اپنے بچوں کو اردو میڈیم میں تعلیم دلانے، معیاری تعلیمی ادارے قائم کرنے، اردو اخبار اور کتابیں خریدنے میں کوتاہی برتی لیکن سب کے باوجود اردو کا قافلہ رواں دواں رہا اور اردو ختم نہیں ہوئی۔ آج بھی ہمارے ملک میں اردو اخبارات، جریدے، رسالے، مختلف مضامین پر کتابیں اچھی خاصی تعداد میں شائع ہو رہی ہیں۔ اردو جاننے والے اردو کی خدمت کے لیے اگر اردو اخبارات یا اردو جریدے خریدنا شروع کر دیں اور اس کے ساتھ اردو کتابوں کی خریداری صرف دینی کتب تک محدود نہ رکھیں تو شاید ہمارے یہاں ناشرین کی قلت ہو جائے۔ یہ مانا کہ فی الحال اردو روزی کمانے کا بڑا ذریعہ نہیں لیکن انگریزی اور ہندی کے ساتھ ساتھ اگر اردو کی بھی اچھی جانکاری حاصل کر لی جائے تو اس سے ذرائع ابلاغ ومیڈیا اور مختلف مسابقتی امتحانوں میں کامیابی حاصل کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ مثلاً آئی اے ایس وغیرہ کے امتحانات میں اردو کا بحیثیت ایک مضمون کے انتخاب کیا جا سکتا ہے اور اردو میڈیم میں امتحان بھی دیا جا سکتا ہے۔ اب تو وزارت ریلوے نے ریلوے کے مختلف عہدوں کے لیے اردو میڈیم سے امتحان دینے کی بھی اجازت دے دی ہے۔ اگر کہیں اس کی اجازت نہیں ہے یا کہیں پر معقول وجوہات کے بغیر کسی بھی امتحان میں پہلے سے حاصل اس قسم کی اجازت کو واپس لے لیا گیا ہے تو اس کے خلاف بھی عرضداشت داخل کی جا سکتی ہے۔ اگر معقول وجہ کے بغیر اس قسم کی سہولت واپس لی جاتی ہے اور دیگر زبانوں میں اس قسم کی سہولت دی جاتی ہے تو یہ آئین کی دفعہ 14 کی خلاف ورزی ہوگی۔ کیونکہ اس دفعہ میں قانون کی نظر میں سب کو برابر سمجھے جانے کی بات کہی گئی ہے۔ اردو کی جانکاری کسی بھی شخص کو کامیابی کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ اردو مترجمین کی تو بات ایک طرف، ہر سال ہزاروں کی تعداد میں مشتہر ہندی ٹرانسلیٹر وں کی اسامیوں کے لیے بھی اردو جاننے والے بہتر امیدوار ثابت ہو سکتے ہیں چونکہ دو زبانیں جاننے کی وجہ سے ان کو ترجمے کے عمل میں بے انتہا آسانی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر ترجمہ کرتے وقت کسی امیدوار کے دماغ میں ہندی کا لفظ نہیں آ رہا ہے تو وہ اس کی جگہ اردو کا آسان لفظ استعمال کر سکتا ہے۔

آیئے اب ہم اپنے ملک کی سب سے بڑی ریاستوں جیسے یوپی و بہار کی بات کریں۔ ان دونوں ریاستوں میں ایسے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے جنھوں نے دل برداشتہ ہو کر اردو لکھنا اور پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔ اردو میڈیم اسکولوں کے بند ہونے یا کم ہونے کی خبر روزانہ پڑھنے کو ملتی ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ ان اردو گھرانوں میں جنھوں نے اردو کو اپنے خون سے سینچا، ان کے مکانات کے بند حجروں کی الماریاں اردو کی تصانیف سے بھری پڑی ہیں اور ان کتابوں کے نام کا صحیح تلفظ تک ادا کرنے والے افراد کا ان کے خاندانوں میں فقدان ہے۔ یہاں تک کہ مختلف رسوم کے ناموں کی ادائیگی میں

بھی زیر، زبر، تشدید، نقطوں کی غلطیاں عام ہیں۔ یوپی کے مقابلے میں بہار میں اردو کی حالت کم از کم اس اعتبار سے اتنی ناگفتہ بہ نہیں ہے کیونکہ بہار کے لوگ یوپی کے مقابلے میں اردو کے تئیں زیادہ پرخلوص ہیں۔ اگر اردو طبقہ ہی اپنے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دلانے میں کاہلی سے کام لے رہا ہے یا اس میں جھجک محسوس کر رہا ہے تو ایسی صورت میں سوائے اظہار افسوس کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ اگر حکومت کی جانب سے کوئی کوتاہی برتی جارہی ہے یا اس قسم کے اداروں کے ساتھ کوئی امتیاز برتا جارہا ہے یا ایسے ادارے تعلیمی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نہیں کھولے جارہے ہیں تو اس سلسلے میں حکومت سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ یہ مانا کہ زبان پر چہار طرفہ ماحول کا اثر پڑتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے ماضی اور ثقافت کو بالکل نظرانداز کردیں چونکہ آئین کے تحت بھی ہمارا یہ بنیادی حق ہے کہ ہم اپنی جداگانہ زبان، رسم الخط اور ثقافت کو محفوظ رکھیں اور آئین پر کاربند رہیں اور اس کے نصب العین کا احترام کریں اور اس کے ساتھ ساتھ ان عظیم المرتبت رہنماؤں کا، جن میں سے کچھ کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے، احترام کرتے ہوئے، اس اعلیٰ نصب العین کو عزیز رکھیں اور ان کی تقلید کریں جن سے آزادی کی تحریک کو ترغیب و تحریک ملی۔ اردو ایک نہایت شیریں زبان ہے۔ ہر شخص کو خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو یا کسی بھی علاقے سے اسے سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو لوگ اپنی مادری زبان اردو ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو انھیں چاہیے کہ وہ اردو سیکھیں اور سکھائیں۔ صرف شادی کے کارڈ اردو میں چھپوانے اور اس میں چشم براہ، فرزند اکبر، دختر نیک اختر جیسے الفاظ کا استعمال کرنے سے بات نہیں بنے گی، معلوم نہیں مدعو کرنے والا یا مدعو کیے جانے والا ان الفاظ کے معانی تو کیا اس رسم الخط سے بھی واقف ہے یا نہیں۔ دوسری جانب انگریزی سے اتنا عشق کیوں کہ کارڈ کی دوسری جانب انگریزی ضرور ہوتی ہے چاہے خاندان کے کسی شخص کو اس زبان کے حروف تک کی پہچان نہ ہو۔ اس سوچ کو بدلنا ہوگا۔

اب ہم ان اداروں کی بات کریں گے جنھیں اردو کی ترقی و ترویج کا کام سونپا گیا ہے۔ ان اداروں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے اور اس نے کافی حد تک اس ضمن میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اگر اس کا موازنہ دیگر اردو اداروں سے کیا جائے تو اس کی کارکردگی یقینی طور پر انتہائی اطمینان بخش اور غیر جانبدارانہ رہی ہے۔ اس کونسل کی شائع کردہ کتابوں کو معیاری کتب کا درجہ حاصل ہے اور انھیں ذی علم و باصلاحیت افراد نے تیار کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دیگر اداروں نے کچھ نہیں کیا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ملک کی بیشتر اردو اکادمیوں کو مختلف قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اور ان کی کارکردگی بھی کبھی کبھی تنقید کا نشانہ بنی ہے۔ البتہ اب چونکہ شفافیت کا دور شروع ہوچکا ہے تو حکومت نے اس بات کو محسوس کرنا شروع کردیا ہے کہ ان اداروں کی سربراہی ایسے افراد کو دی جائے جو نہ صرف اردو داں ہوں بلکہ انھیں اردو سے محبت بھی ہو اور وہ انتظامی و انصرامی امور سے بھی واقفیت رکھتے ہوں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اس قسم کی اسامیوں کو پر کرنے کے

اگر حکومت، عوام اور اردو داں طبقہ تینوں مل کر صدق دلی سے یہ چاہیں کہ اردو اس ملک میں پھلے پھولے اور اسے اس کا حق ملے تو اس ہدف کو پورا کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کے لیے عمل پیہم، نیک نیتی و معقول حکمت عملی درکار ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو یہ باتیںکہ اردو بڑی شیریں زبان ہے، ہماری گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے، ہماری ادبی محفلوں کی جان ہے، ہمارے ماضی کی پہچان ہے، ہماری ملی جلی ثقافت کی نمائندہ ہے، ہماری فلموں اور نغموں کی روح ہے اور سب سے بڑھ کر ہمارے سیکولرازم کی نشانی ہے، بے معنی ہوجائیں گی۔

لیے ان خوبیوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ یہ اکادمیاں اسکولوں کو کتابیں فراہم کراتی ہیں، اردو اسکولوں میں اساتذہ کی تقرریاں کرتی ہیں، مصنفین کو مالی امداد دیتی ہیں اور اسی طرح کی دیگر خدمات انجام دیتی ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ عوام کو مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کی مختلف اسکیموں، سہولتوں اور تعلیمی، طبی، مالی و قانونی امور سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات اردو زبان میں بہم پہنچائیں تاکہ اردو داں طبقہ اپنی بہبود و ترقی کے لیے خود آگے بڑھ کر آئے اور ان تمام اسکیموں کا فائدہ اٹھائے جو حکومت نے آئین کی دفعہ 38 کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شروع کی ہیں۔ آئین کے جز4، جو مملکت کی حکمت عملی کے ہدایتی اصولوں سے متعلق ہے، میں شامل اس دفعہ میں حکومت سے یہ توقع کی گئی ہے کہ وہ ایسے سماجی نظام کو، جس میں قومی زندگی کے سب ادارے سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف سے بہرہ ور ہوں قائم کرے گی اور عوام کی بہبود و ترقی میں کوشاں رہے گی۔ اس سلسلے میں عوام کو خاص کر مرکزی و ریاستی حکومتوں کی ان تعلیمی اسکیموں سے آگاہ کرایا جاسکتا ہے جو آئین کی دفعہ 15، جس میں مذہب، نسل، ذات، جنس یا مقام پیدائش کی بنا پر کسی بھی طرح کے امتیاز کی ممانعت کی گئی ہے، کے فقرہ (4) کو عملی شکل دینے کے لیے سماجی اور تعلیمی حیثیت سے پسماندہ طبقات کے لیے شروع کی گئی ہیں۔

اگر حکومت، عوام اور اردو داں طبقہ تینوں مل کر صدق دلی سے یہ چاہیں کہ اردو اس ملک میں پھلے پھولے اور اسے اس کا حق ملے تو اس ہدف کو پورا کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کے لیے عمل پیہم، نیک نیتی و معقول حکمت عملی درکار ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو یہ باتیں کہ اردو بڑی شیریں زبان ہے، ہماری گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے، ہماری ادبی محفلوں کی جان ہے، ہمارے ماضی کی پہچان ہے، ہماری ملی جلی ثقافت کی نمائندہ ہے، ہماری فلموں اور نغموں کی روح ہے اور سب سے بڑھ کر ہمارے سیکولرازم کی نشانی ہے، بے معنی ہوجائیں گی۔ اردو کو روزگار سے جوڑے بغیر یہ ہدف پورا ہونا آسان کام نہیں۔ یہ کام اکیلے حکومت نہیں کرسکتی۔ اس ضمن میں ہماری حکومت، نجی سیکٹر اور عوام تینوں کو مل کر سرگرم رول ادا کرنا ہوگا۔ آئین میں اردو اور دیگر زبانوں کو جو تحفظ فراہم کیا گیا ہے اس سلسلے میں ہمارے این جی اوز بھی مثبت رول ادا کرسکتے ہیں۔ وہ اردو کی تعلیم دینے کے لیے تعلیمی ادارے قائم کرسکتے ہیں، زبان کے فروغ سے متعلق سرکاری اسکیموں کا فائدہ اٹھاسکتے ہیں اور اردو داں طبقے کو درپیش مشکلات سے حکومت کو آگاہ کرسکتے ہیں اور اس سلسلے میں مختلف سرکاری محکموں اور ایجنسیوں سے بوقت ضرورت رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ آئینی راہ میں کوئی پیچ و خم نہیں، راستہ بالکل صاف ہے۔ ضرورت ہے صرف پیش قدمی اور جذبۂ صادق کی، نہ کہ بغیر کسی معقول وجہ کے یہ قیاس کرنے یا یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کہ کچھ نہیں ہونے والا ہے۔ اگر مسافر ہمت نہ ہارے اور تمام دشواریوں کے باوجود آگے بڑھتا رہے تو منزل خود اس کے قدم چوم لیتی ہے۔

یہاں سپریم کورٹ کے ٹی ایم اے پائی والے معاملے میں دیے گئے فیصلے کے مندرجہ ذیل اقتباس کا حوالہ دینا بے محل نہ ہوگا چونکہ اس سے ہمارے آئین میں جس سیکولرازم کی بات کی گئی ہے اس کا صحیح نقشہ، خواہ وہ اقلیتوں کے حوالے سے ہو یا زبان کے حوالے سے، ہمارے سامنے ابھر کر آتا ہے اور اگر اس کے نفس موضوع

پر غائر نظر ڈالی جائے تو یقینی طور پر اردو داں طبقہ خوش امیدی سے وسعت قلبی کے ساتھ مایوسی کے دلدل سے باہر نکل آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظیر کا بار بار حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس فیصلے میں سپریم کورٹ نے ہمارے ملک ہندوستان کو مادرِ ہند کے نام سے تعبیر کیا ہے اور ملک کے عوام کو اپنی مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کرتے ہوئے اس کی اولاد قرار دیا ہے:

ہندوستانی آئین سازی کی میٹنگ کا ایک منظر

''ماں کے دل میں اولاد کے لیے ہمیشہ جذبۂ فلاح نہاں رہتا ہے۔ مشفق ماں کو خاندان کی بہبود ہمیشہ مقدم ہوتی ہے۔ کسی بھی صحت مند خاندان کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا ہر فرد مضبوط اور تندرست ہو۔ لیکن سبھی افراد کی ہیئت، خواہ وہ جسمانی ہو اور/ یا ذہنی، یکساں نہیں ہوتی۔ مناسب اور صحت مند نشو ونما کے لیے یہ بات والدین اور خصوصاً ماں کے لیے فطری ہے کہ وہ کمزور بچے کا زیادہ سے زیادہ دھیان رکھے اور اسے بہتر غذا دے تاکہ وہ مزید صحت مند ہو سکے۔ اسے زیادہ کھانا دینا اور اس کا زیادہ دھیان رکھنا اور تعلیم کے معاملے میں اس کی مدد کے لیے پرائیویٹ ٹیوشن کو یقینی بنانا ایک معنی میں کمزور بچے کے ساتھ ترجیحی سلوک کرنے کے مترادف ہے۔ جس طرح کسی بوڑھے اور معذور شخص کو کوئی جسمانی یا مادی امداد دینا نامناسب یا غیر منصفانہ نہیں سمجھا جاسکتا اسی طرح معقول وجوہات کی بنا پر کسی خاص زمرے کے لوگوں کو کچھ حقوق عطا کرنا غیر منصفانہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ بھارت میں سبھی لوگ ایک جیسے نہیں ہیں اور اسی لیے اگر سماج کے کسی مخصوص طبقے کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے تو اس پر تیوری نہیں چڑھائی جاسکتی۔ دفعہ 30 ایک ایسا مخصوص حق ہے جو مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو ان کی تعداد کم ہونے کے باعث اور ان میں تحفظ اور اعتماد کا احساس پیدا کرنے کے لیے عطا کیا گیا ہے جبکہ بنفسہٖ انھیں سماج کا کمزور اور غیر مراعاتی طبقہ نہیں سمجھا جاسکتا۔

ہندوستان کی 100 کروڑ کی آبادی میں 6 خاص نسلی گروپ ہیں اور 52 بڑے قبیلے ہیں، 6 بڑے مذاہب ہیں اور 6400 ذاتیں اور ذیلی ذاتیں ہیں، 18 بڑی زبانیں ہیں اور 1600 چھوٹی زبانیں اور بولیاں ہیں*۔ بھارت میں سیکولرازم کی روح کو رنگ برنگے MOSAIC میں تراشے ہوئے پتھر کے ٹکڑوں سے بنائے گئے نقشے کے ذریعے بھی دکھایا جاسکتا ہے جس میں بھارت کے مذکورہ 100 کروڑ* لوگ سنگ مرمر کے ایسے ٹکڑے ہوں گے جن سے وہ نقشہ تیار کیا جائے گا۔ ان میں ہر شخص، خواہ اس کی کوئی بھی زبان، ذات یا مذہب ہو، کی شناخت کا تحفظ کیا جائے گا تاکہ جب ان ٹکڑوں کو جوڑا جائے تو اس سے ایک ایسی تصویر ابھر کر سامنے آئے جس میں بھارت کی مختلف جغرافیائی خصوصیات اجاگر ہوں۔ انسانوں کی شکل میں سنگ مرمر کے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو شکل وصورت میں ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن جب انھیں صحیح طریقے سے یکجا کیا جائے گا تو ان سے بھارت کا ایک خوبصورت نقشہ ابھر کر سامنے آئے گا۔ بھارت کے ہر شہری کی طرح ہر ٹکڑا بھارت کی مکمل تصویر بنانے کے عمل میں اہمیت رکھتا ہے۔ نقشے میں الگ الگ رنگ اور ایک ہی رنگ کے مختلف شیڈ ان سنگ مرمر کے گونا گوں رنگ کے شیڈ اور رنگوں کا ہی نتیجہ ہیں لیکن اگر سنگ مرمر کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو بھی اس میں سے نکال دیا جائے تو بھارت کے نقشے کی شکل ہی بگڑ جائے گی اور اس کی خوبصورتی بھی باقی نہیں رہے گی۔

قوم کی تشکیل میں ملک کے ہر باشندے کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے۔ ہر ٹکڑا اپنے رنگ کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ کوئی بھی ٹکڑا خود ایک معمولی پتھر ہو سکتا ہے لیکن جب اسے صحیح ڈھنگ سے لگایا جائے گا تو اس سے بھارت کے الگ الگ رنگ اور روپ کی مکمل تصویر ابھر کر سامنے آئے گی۔

بھارت کے ہر شہری کی حیثیت بھی کچھ اسی طرح ہے۔ آئین بھارت کے عوام کے الگ الگ رنگ اور روپ کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن وہ ان کی جداگانہ حیثیت کے باوجود ان میں سے ہر ایک کو مساوی اہمیت دیتا ہے کیونکہ اسی طرح ہی ایک متحدہ سیکولر قوم وجود میں آتی ہے۔ کسی مکمل قوم کی تشکیل میں کام آنے والے مختلف ٹکڑوں کے تحفظ اور انھیں قائم رکھنے کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے آئین میں دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ مساوات کے بنیادی اصول کو قائم رکھتے ہوئے ایسی بہت سی توضیعات شامل کی گئی ہیں جو ان گونا گوں ٹکڑوں کے تحفظ کو یقینی بناتی ہیں، مختلف قسم کے لوگوں کو جن کی زبان اور عقائد الگ الگ ہوں، تسلیم کرنا اور انھیں تحفظ فراہم کرنا اور ایک مکمل اور متحد بھارت کی تشکیل کے لیے یکجا کرنا ہی بھارت کے سیکولرازم کی روح ہے۔''

عدالت عظمٰی کی اس نظیر کے مطابق اگر حکومت کسی بھی زبان کے فروغ یا کسی بھی فرقے، طبقے یا زمرے کو ایک دوسرے کے برابر لانے کے لیے کوئی قدم اٹھاتی ہے تو اس کا ایسا کرنا یقینی طور پر ایک قابل تحسین قدم ہوگا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف ادوار میں کم وبیشی کے ساتھ اس قسم کے اقدامات کیے جاتے رہے ہیں اور امید ہے کہ جیسے جیسے سماجی اقدار مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائیں گی اور عوام آگے بڑھ کر جمہوری طریقے سے اس کا مطالبہ کرتے رہیں گے تو حکومت بھی یقینی طور پر اور زیادہ فعال کردار ادا کرے گی چونکہ جمہوریت عوام کی ہی حکومت ہوتی ہے اور اس میں اگر تمام شہریوں کو سماجی، معاشی یا سیاسی انصاف نہ ملے تو اس سے جمہوریت کے تصور کو بھی زک پہنچتی ہے۔ اب ہمارا ملک اپنی حیثیت اور مرتبے کے مدنظر کسی بھی وقت اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کا مستقل رکن بن سکتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ یقینی طور پر اس بات کا اور بھی زیادہ خیال رکھے گا کہ اس کی ساکھ پر کوئی آنچ نہ آئے اور ملک کے ہر باشندے کو ہر طرح کا انصاف ملے، اس کی زبان اور ثقافت برقرار رہے اور ملک کی ملی جلی ثقافت کا ہمیشہ ہمیشہ حصہ بنا رہے اور مذہبی، لسانی اور علاقائی وطبقاتی تفریق سے قطع نظر سب اس کی قدر کریں۔

(مضمون نگار ایمٹی یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر ہیں اور حکومت ہند کے ایڈیشنل لیجسلیٹو کاؤنسل اور قومی مذہبی ولسانی اقلیتی کمیشن کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ دستور وانسانی حقوق سے متعلق کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں)

Khwaja Abdul Muntaqim,Dharma Aptt, 2-I.P.Extn., Delhi-110092

* سپریم کورٹ نے یہ اعداد وشمار 2011 کی مردم شماری سے قبل درج کیے تھے۔ 2011 کی مردم شماری کے حتمی اعداد وشمار شائع ہونے کے بعد ان اعداد وشمار میں تبدیلی آنے کا امکان ہے اور ان کا حوالہ بہ اعتبار معتبریت اس کے بعد ہی لیا جاسکتا ہے۔

محمد عبدالقدیر

دستورِ ہند کے دائرے میں اردو کے فروغ کی صورتیں

دستورِ ہند (Constitution of India) کا ابتدائیہ (Preamble) ملک کے عزائم کا اعلان اس طرح کرتا ہے:

''ہم ہندوستان کے عوام ہندوستان کو ایک خود مختار، اشتراکی، سیکولر اور جمہوری ریپبلک بنانے کا سنجیدگی سے عزم کرتے ہوئے اس کے باشندوں کو سیاسی اور سماجی انصاف خیالات، اظہار رائے، یقین، عقائد و عبادات کی آزادی وقار اور مواقع کی برابری کے حصول اور ان کے مابین مساوات کے فروغ عزت نفس یکجہتی اور ملک کی سالمیت کی ضمانت دیتے ہوئے آج یعنی 6 نومبر 1949 کو اپنی مجلس قانون ساز میں پاس کرتے ہوئے اپنے لیے نافذ العمل قرار دیتے ہیں۔''

اس طرح ابتداہی میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ یہ دستور کوئی باہر سے درآمد حکم نامہ یا تھوپا گیا قانون نہیں ہے بلکہ یہاں کے عوام نے اسے خود بنایا ہے اور خود پر نافذ العمل قرار دیا ہے۔ آیئے اس کی کچھ دفعات کا سرسری تذکرہ کرتے ہیں جو ہمارے موضوع کی تفہیم میں معاون ہوگا۔

آرٹیکل 19 میں سب باشندوں کو اظہار رائے کی آزادی، آزادانہ طور پر پورے ملک میں رہنے، گھومنے پھرنے، انجمن یا یونین بنانے، اپنی مرضی سے پیشہ (Profession) یا بزنس اختیار کرنے کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے تو آرٹیکل 21 پُر وقار زندگی گزارنے کی آزادی دیتا ہے۔

آرٹیکل 25 ہر باشندے کو ضمیر کی آزادی اور کوئی بھی مذہب، مسلک اختیار کرنے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کرنے کی گارنٹی دیتا ہے۔ آرٹیکل 26 مذہبی اور عوامی بہبود کے ادارے کھولنے، اپنے مذہبی معاملات کو خود چلانے کی خودمختاری دیتا ہے۔ دفعہ 29 ہر اقلیتی طبقے کو جو اپنی منفرد زبان رکھتے ہوں، اس کی حفاظت اس کے رسم الخط کی حفاظت اور اپنی تہذیبی وراثت کو قائم اور محفوظ رکھنے کی ضمانت دیتا ہے۔ اسی طرح آرٹیکل 30 ہر اقلیت خواہ وہ مذہبی ہو یا لسانی، کو اپنے تعلیمی ادارے کھولنے اور اس کے انتظام و انصرام کی مکمل آزادی دیتا ہے۔ سپریم کورٹ کی تشریح کے مطابق اس کا فیصلہ صوبائی سطح پر طے ہوگا یعنی اگر کشمیر میں کوئی ہندی زبان و تعلیم کا ادارہ کھولے تو وہاں اقلیتی ادارہ تسلیم ہوگا، آسام میں کوئی پنجابی زبان یا سکھ مذہب کا ادارہ کھولے تو اس صوبے میں اسے اقلیتی ادارے کی حیثیت حاصل ہوگی۔

دفعہ 29 کی تشریح و تفسیر عدالت عظمیٰ نے اپنے ایک اہم فیصلے میں جو آل انڈیا رپورٹر 1965 کے صفحہ 183 پر رپورٹ کیا گیا ہے (جگدیو سنگھ بنام سدّ انتی پرتاپ سنگھ) اس طرح کی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زبان اور رسم الخط کی حفاظت کے لیے دوران الیکشن سیاسی تقریر بھی کرے تو اسے انتخاب قانون مجریہ 1951 Representation of people Act کی دفعہ (3)123 کے تحت غلط عمل (Corrupt Practice) نہیں کہا جاسکتا یعنی مذکورہ قانون میں کسی بھی منتخب امیدوار کے الیکشن کو اس بنیاد پر رد نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے غیر قانونی عمل کیا ہے کیونکہ اسے آئین کی دفعہ 29 میں ایسا کرنے کا بنیادی حق ہے۔

اقلیت کے معنی : حالانکہ آئین ہند میں اقلیت کی تعریف درج نہیں ہے لیکن مجلس قانون ساز Constituent Assembly کو اس کی مشاورتی کمیٹی Advisory Council نے جو سفارش کی تھی وہ یہ تھی:

''ہر یونٹ کی اقلیتوں کو زبان، رسم الخط اور تہذیب کی حفاظت کا حق ہوگا اور کوئی قانون ایسا نہ بنایا جائے گا جو اس ضمن میں مداخلت آمیز یا اس کے مفاد کے خلاف ہو۔''

مگر جب یہ مسودہ ڈرافٹ کمیٹی کے پاس گیا تو اس نے لفظ اقلیت کی جگہ section of Citizen (باشندوں کا حلقہ) یہ کہہ کر لکھ دیا کہ یہ وسیع تر معنوں میں ہے، جس میں اقلیت بھی شامل ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جہاں لفظ اقلیت (Minority) استعمال نہیں ہے اور باشندوں کا گروپ استعمال ہوا ہے وہ بھی اقلیت کے معنوں میں متصور کیا جائے گا۔ عام مفہوم میں یہ لفظ مذہبی یا لسانی کثرت کے خلاف استعمال ہوتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو مذہبی اور لسانی اعتبار سے قلیل ہوں۔ یہی مفہوم اس دفعہ میں مستعمل ہے۔

اسی طرح آرٹیکل 30 ہر اقلیت کو خواہ مذہب کی بنا پر ہو یا زبان کی بنا پر اپنی پسند کے تعلیمی ادارے کھولنے اور ان کا انتظام کرنے کا بنیادی حق فراہم کرتا ہے۔ مرکزی یا صوبائی حکومت محض مذہب یا زبان کی بنا پر سرکاری امداد دینے میں کوئی امتیاز نہیں برت سکتی۔

مذکورہ بالا پس منظر میں ہمیں وہ امکانات تلاش کرنا ہیں کہ جن سے اردو زبان کے حقوق کی حصولیابی کی کلید حاصل ہو۔ ہم اردو زبان والوں کا یہ المیہ ہے کہ اردو کا ماتم اور مرثیہ خوانی بہ اہتمام کرتے ہیں بس عمل نہیں کرتے۔ لاکھوں روپیوں کی سرکاری گرانٹس، نشست و گفت میں مال مفت کی طرح بے رحمی سے ہضم کر لیتے ہیں یا اڑا دیتے ہیں۔ اردو کو ایسے مردمیداں چاہییں جو اس کے لیے منصوبہ بند طریقے سے پیشہ ورانہ (Professional) انداز میں ایک لائحہ عمل بنا کر کام کریں۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔

راقم الحروف اپنے ایک حالیہ مضمون 'اردو زبان اور ہندوستان کا دستور' میں دفعہ 243, 345, 346, 347 کے حوالے سے تحریر کر چکا ہے کہ صوبائی حکومت یا اداروں کو ملک کے صوبوں یا صوبوں کے جن حصوں یا علاقوں میں اردو زبان بولنے والے خاطر خواہ تعداد میں رہتے ہیں وہاں کس طرح صدر جمہوریہ ہند یا گورنر اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے سکتے ہیں اور حکومت ہند یا صوبائی حکومتوں کو اردو زبان کی ترویج و ترقی، فروغ و اشاعت کے احکام صادر فرما سکتے ہیں۔ لہٰذا اس کی تفصیل دہرانے کی بجائے اشارے کافی ہوں گے۔

دفعہ 350 کے حوالے سے یہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ ہر صوبائی حکومت اور علاقائی اداروں کی ذمے داری ہوگی کہ وہ اپنے عوام کو مادری زبان میں تعلیم کی سہولتیں مہیا کریں۔ بالخصوص پرائمری درجات میں۔ اسی طرح دفعہ 351 جو ہندی زبان (قومی زبان) کے فروغ سے متعلق

ہے، اس میں بھی مقامی زبانوں کے فروغ پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے، جس پر ابھی تک کوئی توجہ ہی نہیں کی گئی۔

لہٰذا اس تحریر کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آئین کی مذکورہ بالا دفعات سے مترشح حقوق کو ہم اردو زبان کی خدمت کے لیے کس طرح کام میں لائیں۔ لہٰذا یہاں ان چند بنیادی نکات کو درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ محض کام شروع کرنے (to start with) کے مقصد سے ہیں، حتمی نہیں۔

لہٰذا اس ابتدا کے لیے:

1. وہ تمام ادارے جو اردو زبان کے فروغ یا خدمت کے لیے مرکزی حکومت نے قائم کیے ہوں یا مرکز سے امداد پاتے ہوں وہ ایک متحدہ لائحہ عمل تیار کریں۔

2. بہتر تو یہ ہے کہ جن صوبوں میں اردو اکادمیاں یا دوسرے سرکاری ادارے قائم ہیں ان میں ایک مشترکہ لائحہ عمل اور اشتراک Coordination ہو جائے کہ وہ ان حقوق کی حصولیابی کے لیے مشترکہ اقدام کریں۔

3. یونیورسٹیوں، ڈگری کالجوں، انٹر کالجوں کے اردو شعبوں میں اساتذہ میں کوآرڈی نیشن (Co ordination) ہو، گروپ اور کمیٹیاں تشکیل دی جائیں جو اپنے حلقے، صوبوں میں مشترکہ اقدام کریں۔

4. پرائیویٹ ادارے، انجمن، بزم، لائبریری جو اردو کی خدمت میں مصروف ہیں وہ متحدہ پلیٹ فارم بنائیں۔ قومی لیول پر، صوبائی لیول پر، ضلع، تحصیل، نگر پنچایت، گاؤں پنچایت لیول پر متحدہ پلیٹ فارم بنائیں۔

5. اردو دوست از خود انفرادی یا فروغ اردو کے نام سے پرائیویٹ انجمن بنالیں یا جہاں کہیں انجمنیں پہلے سے ہوں وہ خود اس کی سمت قدم بڑھائیں۔

کرنے کے چند کام

1. ہر گاؤں پنچایت، نگر پنچایت، ضلع پنچایت اور ضلع میں چند فعال حضرات کو جمع کر کے یہ کوشش کی جائے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے، ان کو دفعہ 350 کی رو سے اردو زبان کی تعلیم کا بندوبست کرانے کی کوشش کی جائے۔ اردو مدرس تعینات کرانے کی کوشش کی جائے۔ اگر اردو زبان کا مدرس وہاں منظور (Sanction) نہ ہو تو خود چندہ کر کے ایک اردو مدرس کی تنخواہ کا انتظام کر کے استاد فراہم کر دیا جائے جب تک کہ باقاعدہ مدرس کا تقرر نہ ہو جائے۔ ضلع بیسک آفیسر، ضلع انسپکٹر آف اسکول، ڈپٹی یا جوائنٹ ڈائرکٹر یا ڈائرکٹر (اردو) سے کوشش کر کے اس اسکول میں اردو ٹیچر کی پوسٹ کو منظور (Post Sanction) کرایا جائے۔ وہ کان نہ دھریں تو حکمران یا سیاسی جماعت کے انصاف پسند عہدیداران کی مدد سے اس دفعہ کے حوالے سے حکومت سے رجوع کیا جائے۔ جب کچھ نہ ہو تو کورٹ میں اس دفعہ کے نفاذ کے لیے مفاد عامہ کی رٹ دائر کی جائے۔ مگر یہ کام بتدریج اور منصوبہ بند طریقے سے ہو۔ حکومت یا سرکاری اداروں سے تصادم (Confruntation) سے کام نہ لے کر، لگاتار مخلصانہ کوشش اور اخلاقی و سیاسی دباؤ کا استعمال حکمت عملی کے ساتھ کیا جائے۔

2. دفعہ 351 کی تحت صدر جمہوریہ ہند سے نمائندگی کی جائے اور انھیں باور کرایا جائے کہ ہمارے ضلع، علاقے جہاں عوام کی مادری زبان اردو ہے وہاں وہ مرکزی اور صوبائی حکومت کو ہدایت دیں کہ ان کی تعلیم کا بندوبست اردو زبان میں کیا جائے۔ اس میں اپنے علاقے کے ممبر پارلیمان سے بھی مدد حاصل کی جائے۔ ایسا ہی ممبر اسمبلی کی مدد سے گورنر کے حوالے سے کیا جائے۔

3. وہ ممبر پارلیامان جن کی مادری زبان اردو ہے دفعہ 350B میں صدر جمہوریہ کو باور کرائیں کہ گوپال سنگھ کمیٹی

THE CONSTITUTION OF INDIA

WE, THE PEOPLE OF INDIA, having solemnly resolved to constitute India into a SOVEREIGN DEMOCRATIC REPUBLIC and to secure to all its citizens:

JUSTICE, social, economic and political;

LIBERTY of thought, expression, belief, faith and worship;

EQUALITY of status and of opportunity;
and to promote among them all

FRATERNITY assuring the dignity of the individual and the unity of the Nation;

IN OUR CONSTITUENT ASSEMBLY this twenty-sixth day of November, 1949, do HEREBY ADOPT, ENACT AND GIVE TO OURSELVES THIS CONSTITUTION.

رپورٹ، اندر کمار گجرال کمیٹی رپورٹ، سچر کمیشن رپورٹ، اور رنگ ناتھ مشرا رپورٹ کی روشنی میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ہدایت دیں کہ اردو زبان سے متعلق ان کی سفارشات کو عملی جامہ پہنائیں۔

یہ بھی باور کرایا جائے کہ دفعہ 351 کی رو سے ہندی (قومی) زبان کی ترقی کو بامعنی اور موثر بنانے کے لیے اردو اور ضمیمہ 8 میں شامل دوسری ہندوستانی زبانوں کو بھی آئینی طور پر فروغ دیا جائے۔

4. مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ جتنے مرکزی محکمے، منسٹری یا دفاتر ہیں ان کے کام کاج کے لیے جتنے ادارے ہیں ان کو ہدایت دی جائے کہ جہاں خاطر خواہ لوگوں کی مادری زبان اردو ہے وہاں اردو کو علاقائی زبان (Reagional Language) کا درجہ دیا جائے۔ اس سے بہت سے محکموں بالخصوص بینک، ریلوے، ڈاکخانے وغیرہ جیسے دفاتر میں اردو کا استعمال شروع ہو جائے گا تو اردو جاننے والوں کا تقرر بھی ہو گا۔ اس کی ماضی میں مثالیں ہیں کہ ریلوے محکمے نے اردو میں ٹائم ٹیبل شائع کرنا شروع کر دیا تھا مگر چند سال بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا اس کا احیا فوراً کرایا جائے اور اس کو اردو والے خریدیں بھی۔

اسی طرح الہ آباد شہر کی ایک تنظیم 'اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن' کی کوششوں سے ریزرو بینک Resrve Bank of India نے ایک مقامی بینک کو اردو میں چیک لینے اور چیک سے روپیہ دینے کا حکم کیا تھا۔ چند دنوں ایسا کیا مگر بعد میں اردو زبان میں لکھے چیک لینا منع کر دیا۔ اگر ریزرو بینک اردو کو ریجنل لینگویج کا درجہ دے دے تو اس علاقے میں اردو میں کام ہونا لازمی ہو جائے گا۔ جب کام ہونے لگے گا تو اردو جاننے والے ملازم کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔

7. اسی طرح سے اگر مادری زبان بولنے والے طے کر لیں کہ ہم خط و کتابت اردو میں ہی کریں گے اور وہ ڈاک خانہ، یا کوریئر میں پتہ صرف اردو میں ہی لکھنے لگیں تو حکومت یا کوریئر (Courier) کمپنیوں کو اردو جاننے والے ملازم رکھنا ضروری ہو جائے گا۔

8. اگر کوئی کچھ نہ کرے تو دفعہ 29 اور 30 کے حفاظت یافتہ اداروں کو کس نے روکا ہے کہ وہ اردو زبان کی تعلیم نہ دیں۔ پھر پرائیوٹ اداروں پر تو کوئی روکاوٹ ہی نہیں۔ جو منیجری کے مقدمات سپریم کورٹ تک لڑتے ہیں مگر اردو مضمون اور اردو ٹیچر کے مسئلے پر کیوں خاموش یا بے عمل ہیں۔ یہ محض چند باتیں ہیں۔ اس فہرست میں آئندہ توسیع کی جائے گی۔ یہ کام ایک ساتھ کرنے کے نہیں ہیں۔ ورنہ یہ محض منگیری لال کے سپنے نظر آئیں گے۔ مسئلہ کام سر دست شروع کرنے کا ہے۔ آپ اپنی صلاحیت، طاقت وسائل کی مناسبت سے خود طے کریں کہ آپ خود شروعات کہاں سے کرنا چاہیں گے۔ وہی کام شروع کریں جس کی تکمیل وحصول کی آپ میں ہمت اور سکت ہو۔ یہ کام انفرادی حیثیت سے بھی کیا جا سکتا ہے اور اجتماعی حیثیت سے بھی۔ انجمنوں کے ذریعے بھی اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سطح سے بھی۔ ہاں اگر ہمیں اپنی زبان، رسم الخط، تہذیب، ادب، وراثت کی حفاظت سے محبت ہے تو ہم اس کام میں کسی نہ کسی سطح پر ہاتھ ضرور بٹائیں گے کہ اردو زبان پکار رہی ہے کہ اے اردو والو! مجھے سنبھالو کہ میں تمھاری شناخت کا حوالہ ہوں۔

◘

Mohd Abdul Qadeer, Senior Advocate,
Allahabad High Court, Allahabad (UP)

قاضی عبیدالرحمان ہاشمی

اردو میں دوسری زبانوں سے ترجمے کی روایت اور مسائل

اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اردو زبان و ادب کے متمول اور زرخیز ہونے کا بنیادی سبب یہ رہا ہے کہ ملک اور بیرون ملک کی متعدد زبانوں کا علمی و ادبی سرمایہ اس زبان میں ہمیشہ کسی نہ کسی شکل اور مقدار میں منتقل ہوتا رہا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ چنانچہ اس ملک کی اہم زبانیں مثلاً کنڑ، ملیالم، تلگو، مراٹھی، بنگالی، گجراتی، کشمیری، پنجابی اور ہندی بلکہ سنسکرت سے بھی کافی کچھ مواد اردو میں منتقل ہوا ہے اور حسب ضرورت یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ البتہ رفتار سست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادیٔ ملک سے کچھ قبل حیدرآباد میں دارالترجمہ کے قیام کی صحت مند روایت کے خاتمے کے بعد اردو زبان میں ترجمے کو ایک مشن کے طور پر لے کر آگے بڑھنے والا کوئی دوسرا بڑا ادارہ افسوس ہے کہ وجود میں نہ آسکا، چنانچہ ترجمے کی بیشتر مثالیں انفرادی دلچسپی اور ذوق وشوق سے ہی عبارت ہوکر رہ گئیں۔ موجودہ دور میں حکومت کی توجہ سے حیدرآباد میں ہی ابوالکلام آزاد سینٹرل اردو یونیورسیٹی کے قیام سے پھر اس کا امکان پیدا ہوگیا ہے کہ اردو میں ملک اور بیرون ملک کی دیگر زبانوں سے علمی اور دانشورانہ کارناموں کو بڑے پیمانے پر منتقل کیا جاسکے گا، تاہم مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہاں بھی زیادہ زور انگریزی سے اردو میں ترجمے پر ہوگا۔

اس لیے انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہونے کی حیثیت سے آج دنیا کی سب سے زیادہ مقبول اور معنوی زرخیزی کی حامل زبان کا درجہ حاصل کرچکی ہے۔ اس میں جدید تر سائنسی علوم اور ٹیکنکی اصطلاحات کا جس تیزی سے رُوز بہ روز اضافہ ہورہا ہے اس کو اردو میں منتقل کیا جانا اولین ترجیحات میں شامل ہوگا۔ بلکہ سردست یہی کچھ ہو بھی رہا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہمارے ملک میں ایسے کسی معروف ادارے کا وجود نہیں ہے جو علاقائی اور یورپی زبانوں سے اردو میں براہ راست ترجمے کے سلسلے میں فعال اور سرگرم ہو، تاہم یہ واقعہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح وقتاً فوقتاً اردو میں اہم مواد منتقل ہوتا رہا ہے اور اردوداں طبقہ ان سے استفادہ کرتا رہا ہے۔ یہ کوششیں جیسا کہ بیشتر انفرادی نوعیت کی رہی ہیں، تاہم کافی تراجم بے شک بعض تعلیمی، مذہبی، سماجی اور سیاسی اداروں کی سرپرستی کے نتیجے میں بھی اردو کے علمی سرمائے میں وقعت اور زرخیزی کا سبب بنے ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کی علاقائی زبانیں جن میں بعض بے حد قدیم اور باثروت تاریخ وتہذیب اور کسب وکمال کی ہزاروں برسوں کی علمی، ادبی اور دانشورانہ روایات کی امین اور پاسبان ہیں، ان کے منتخب کارناموں کو اردو میں براہ راست بھی منتقل کیا گیا ہے لیکن زیادہ تر مواد بالواسطہ طور پر اور اکثر ہندی سے اردو میں آیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندی ہماری واحد زبان ہے جو ملک کے پورے طول وعرض میں گرچہ کئی جگہ بولی نہیں جاتی لیکن سمجھی ضرور جاتی ہے۔ ہندی زبان سے استفادے کا سلسلہ بھی خاصا قدیم ہے۔ ہندی اور سنسکرت سے اردو میں سب سے پہلے مذہبی کتب اور رسائل اور پھر ادبی سرمایے کو ضرورت کے مطابق مختلف ادوار میں منتقل کیا گیا، چنانچہ رامائن، بھگوت گیتا، رام چرت مانس اور اپنیشد وغیرہ کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں نسخے اردو میں آج بھی دستیاب ہیں۔

کالی داس کا شہرہ آفاق سنسکرت رزمیہ شکنتلم بھی اردو میں منتقل ہوچکا ہے۔ ہندی شعر و ادب اور فکشن کا اردو میں ترجمہ معمول کے مطابق ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور صاحبانِ ذوق مستفید ہوتے رہے ہیں۔ البتہ افسوس

کی بات یہ ضرور ہے کہ موجودہ دور میں چونکہ اردو زبان کی مقبولیت نوجوانوں میں روز بہ روز کم ہوتی جا رہی ہے اور لوگ ہندی تعلیم کی طرف زیادہ مائل ہیں اس لیے اب انھیں جو کچھ پڑھنا ہے وہ براہ راست ہندی میں ہی پڑھ لیتے ہیں، اردو میں پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ہندی سے ترجمے کا تمام تر سلسلہ بند ہو چکا ہے یا صرف مذہبی اور ادبی تراجم پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ سماجی علوم، سائنس اور تکنالوجی کے موضوعات پر لکھی گئی کتب اور مضامین کا ترجمہ حسب ضرورت ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں علوم وفنون اور حکمت و دانائی کی برکت کو منتقل کرنے کے جو فوائد ہیں اس کا احساس ہر ذی علم کو ہے۔

اردو میں مغربی زبانوں سے اخذ واستفادے کا سلسلہ بھی کافی پرانا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد سے خصوصاً اواخر 19ویں صدی سے یہ سلسلہ بڑی تیزی سے آگے بڑھا، چنانچہ انگریزی، جرمن، فرنچ اور روسی زبانوں سے اردو میں براہ راست اور بالواسطہ تراجم کی شکل میں شعر و ادب، فلسفہ، سیاست ومعیشت، سائنسی علوم، ریاضی، علم طب، علم الافلاک، تیکنیکی علوم، قانون اور دیگر بے شمار موضوعات مسائل پر مبنی کتب ورسائل کے دفاتر اردو میں منتقل کیے گئے اور اس کارگزاری پر ہمیشہ فخر بھی کیا گیا۔ اس لیے کہ مشرق جس کے بارے میں اہل مغرب کا یہ عام خیال رہا ہے کہ یہ ہر لحاظ سے کم وقعت اور پسماندگی کا شکار رہا ہے اب مغربی فکر ودانش سے روشنی، گرمی اور حرارت سے استفادہ کر کے زیادہ بالغ نظر، متمول، زرخیز اور ترقی یافتہ ہو گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو میں جتنے بڑے پیمانے پر مغربی خصوصاً (انگریزی) فکر ودانش کو منتقل کیا گیا ہے، مجموعی طور پر بھی شاید ہندی یا علاقائی زبانوں سے اتنا مواد کسی عہد میں اردو میں منتقل نہیں ہوا ہے۔ اس سے انگریزی زبان اور مغربی تہذیب کی بالادستی اور اقبال مندی کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں لوگ 16ویں صدی انگلستان کے شیکسپیئر اور بعد کی صدیوں کے یورپی شعرا اور ادبا، فلسفی اور حکما، مثلاً ورڈس ورتھ، بائرن، شیلی، کیٹس، لیگ لینڈ، بلیک، ملٹن، ڈرائیڈن، دانتے اور والٹیر وغیرہ کے کارناموں سے زیادہ بہتر واقفیت رکھتے ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس اپنی زبان کے شعرا اور دانشوروں سے شاید اس قدر دلچسپی نہیں رکھتے۔ البتہ یہ بات بھی درست ہے کہ یہ تمام تر واقفیت اور گہری شناسائی صرف ترجمے کی ہی رہین منت ہے۔ انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں سے براہِ راست واقفیت سے بھی بہت کچھ سیکھا اور حاصل کیا گیا ہے۔

اردو میں ترجمے کی اس روایت کے تناظر میں بعض

> **اردو میں مغربی زبانوں سے اخذ واستفادے کا سلسلہ بھی کافی پرانا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعدسے خصوصا اواخر 19ویں صدی سے یہ سلسلہ بڑی تیزی سے آگے بڑھا، چنانچہ انگریزی، جرمن، فرنچ اور روسی زبانوں سے اردو میں براہ راست اور بالواسطہ تراجم کی شکل میں شعر و ادب، فلسفہ، سیاست ومعیشت، سائنسی علوم، ریاضی، علم طب، علم الافلاک، تیکنیکی علوم، قانون اور دیگر بے شمار موضوعات مسائل پر مبنی کتب و رسائل کے دفاتر اردو میں منتقل کیے گئے اوراس کارگزاری پر ہمیشہ فخر بھی کیاگیا۔**

ایسے مسائل کا بھی مختصر ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو ہمیشہ اس مرحلے میں پیش آتے ہیں اور ان کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً اس صورت میں جب کہ Source language کا تاریخی، جغرافیائی، نفسیاتی اور تہذیبی پس منظر مختلف ہو، مثلاً انگریزی جرمن، فرنچ اور روسی زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے کی صورت میں ان مسائل سے نبرد آزما ہونا لازمی ہے۔ میں نے یہاں قصداً صرف چار مغربی زبانوں کا ذکر کیا ہے اس لیے کہ اردو میں اگر کچھ ترجمے شاعری اور نثر کے ہوئے ہیں تو زیادہ تر انھیں زبانوں سے متعلق ہیں۔

اگر صرف تہذیب کے تعلق سے ہی غور کیا جائے تو بھی یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ تہذیب کے بھی اپنے شیوے شیون، رنگ، جہات، باریکیاں اور کیفیات ہیں کہ ان کا عرفان اور ادراک حاصل کیے بغیر کوئی بھی شخص ترجمے کے فرائض سے سلامتی کے ساتھ نہیں گزر سکتا۔

تہذیبیں جن صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہیں ان میں زبان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں تہذیب اگر ایک دائرہ ہے تو اس کا مرکز انسان ہے، اور چونکہ زبان ایک موثر ترین وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے فکر وخیال کا اظہار کرتا ہے، لہٰذا یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ زبان کو ان عناصر کا حامل ضرور ہونا چاہیے جو اس تہذیب کا حصہ ہیں اور جن کی مظہر وہ زبان ہے۔ چنانچہ یہ واضح ہوا کہ زبان اور تہذیب آپس میں اس قدر مربوط ہیں کہ انھیں نہ صرف ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے بلکہ ان کا الگ الگ تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ بات واضح ہوگئی کہ زبان کا جاننا دراصل ان عناصر اور تصورات کو جاننے سے عبارت ہے جن سے کسی تہذیب کی تشکیل ہوتی ہے۔

خصوصاً جب ہمارا مقصد تخلیقی متون اور ان کے ترجمے سے ہو۔ ادبی متون جن میں شاعری اور نثر دونوں شامل ہیں اپنی فطرت میں معنی خیزی کی صلاحیت اور صفت سے متصف ہوتے ہیں۔ چنانچہ ادبی متن اگر بلند پائے کا ہے تو اس میں معنی خیزی کے امکانات بھی اسی قدر غیر واضح اور اکثر زیریں سطح پر ہوتے ہیں کہ بعض اوقات ان کی طرف دھیان تک جانا مشکل ہو جاتا ہے، حالانکہ دو طرح کے متون میں کچھ فرق بھی ہوتا ہے یعنی شاعری میں ان عناصر کی کارفرمائی فکشن کے مقابلے میں نسبتاً کم تر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ فکشن بیانیہ ہونے کے سبب ان عناصر کو بخوبی انگیز کر سکتا ہے جبکہ شعری لوازم استعارہ، علامت اور دیگر اشارے زبردست تہذیبی دباؤ کے متحمل کم ہی ہو پاتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ترجمہ شدہ متن ان قباحتوں کے سبب اصل متن سے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی ایک گونہ فاصلہ رکھنے پر مجبور ہے۔

■

Qazi Obaidur Rahman Hashmi, B-10, Okhla Vihar, Jamia Nagar, New Delhi-110015

محمد زاہد

مغربی بنگال میں اردو زبان

فورٹ ولیم کالج

ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے مغربی بنگال کا صوبہ کشمیر اور آسام کے بعد تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ 2001 کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی کل آبادی تقریباً آٹھ کروڑ ہے جس میں مسلمانوں کا تناسب سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 27 فیصد اور غیر سرکاری اندازے کے حساب سے 35 فی صد ہے یعنی یہاں مسلمانوں کی تعداد دو سے ڈھائی کروڑ ہے۔ کل آبادی میں تقریباً دس فی صد لوگ اردو کو اپنی مادری زبان تسلیم کرتے ہیں۔ اس طرح اردو داں آبادی لگ بھگ ستر سے اسی لاکھ کی ہے جن کی اکثریت بہار، جھارکھنڈ، اترپردیش، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، دلی وغیرہ سے نقل مکانی کرکے آنے والوں پر مشتمل ہے۔ مغربی بنگال کے شہروں میں کلکتہ، ہوڑہ، بردوان، رانی گنج، آسنسول، مرشدآباد، ہگلی، اسلام پور وغیرہ میں ان کی خاطر خواہ تعداد ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں بنگالہ بہت بڑا صوبہ تھا۔ آزادی کے وقت مشرقی اور مغربی بنگال کی تقسیم اور پھر لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تشکیل نے اس کا رقبہ مختصر کر دیا۔

1192 میں شہاب الدین محمد غوری نے پرتھوی راج چوہان کو شکست دے کر ہندوستان میں ایک نئی تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ اس کے سپہ سالاروں نے قلیل عرصے میں ایک بڑے علاقے کو اس کی قلمرو میں شامل کر دیا۔ 1201 میں بختیار خلجی نے بنگال کے راجہ لکشمن سین کو صوبہ سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے گوڑ کو پایۂ تخت بنایا اور اشاعت اسلام کی طرف خصوصی توجہ دی۔ مسلم سلاطین نے بڑی کامیابی سے بنگال پر حکومت کی اور یہاں کی اکثریت کو مغائرت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے بنگلہ زبان وادب اور ثقافت کی سرپرستی کی۔ 1576 میں جب مغلوں نے بنگال کو اپنی سلطنت میں شامل کیا تو ایرانیوں کی ایک بڑی تعداد یہاں آکر آباد ہوئی۔ 1704

بنگال کے سب سے پہلے اردو زبان کے شاعر کی حیثیت سے بہرام بخاری سقّا کا نام آتا ھے جن کا انتقال بردوان میں 1562 میں ہوا۔ سقا کا فارسی قلمی دیوان بھنڈارکر اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، پونہ میں محفوظ ھیں۔ آپ چغتائی ترک تھے اور شہر بخارا سے اکبر کے عہد مین دھلی آئے تھے۔ عمر کا بڑا حصہ سیاحت میں گزارا۔

میں مرشد قلی خاں نے اپنی سلطنت کا صدر مقام ڈھاکہ سے مرشدآباد منتقل کیا تو یہ شہر جگمگا اٹھا۔ ویسے بنگال میں مسلم حکومت کے قیام سے قبل صوفیائے کرام کی کوششوں سے عربی، فارسی کے بہت سے الفاظ یہاں کی مقامی زبان یعنی پرانی بنگلہ میں شامل ہو چکے تھے۔ حضرت جلال الدین تبریزی بنگال کے ندیا ضلع میں بختیار خلجی کے آنے سے پہلے موجود تھے۔ حضرت شیخ علاء الحق پنڈوں میں عقیدت مندوں کو فیض پہنچا رہے تھے۔ سید اشرف جہاں گیر سمنانی (پیدائش 1309، وفات 1425) آپ کے مرید بنے۔ انھوں نے بنگال میں چھ سال قیام کیا اور پھر کچھوچھ، اترپردیش میں جا کر سکونت اختیار کی۔ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ سراج الدین عثمان پانڈوی، شیخ نور قطب عالم وغیرہ نے اپنے ملفوظات اور درس کے ذریعے ایک نئی زبان کا راستہ ہموار کیا۔

بنگال کے سب سے پہلے اردو زبان کے شاعر کی حیثیت سے بہرام بخاری سقّا کا نام آتا ہے جن کا انتقال بردوان میں 1562 میں ہوا۔ سقا کا فارسی قلمی دیوان بھنڈارکر اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، پونہ میں محفوظ ہیں۔ آپ چغتائی ترک تھے اور شہر بخارا سے اکبر کے عہد میں دہلی آئے تھے۔ عمر کا بڑا حصہ سیاحت میں گزارا۔ وہ بنگال ہوتے ہوئے سراندیپ (سری لنکا) جانا چاہتے تھے کہ یہیں بردوانون میں سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ اس کے بعد کے شاعروں میں رام نرائن موزوں اور فقیہ صاحب دردمند کا نام آتا ہے جنھوں نے 1763 میں دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ موزوں صوبیدار تھے جب کہ فقیہ صاحب مظہر جان جاناں کے شاگرد اور مرید تھے۔ اس دور کے دیگر اہم شعرا میں خواجہ امانی، شیخ فرحت اللہ فرحت، قدرت اللہ قدرت، مخلص مرشدآبادی، انشاء اللہ خاں انشا وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ اس طرح بنگال میں اردو زبان شعر وشاعری اور رابطہ کی زبان بن گئی۔

1800 میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اردو

نثر کی ترقی کے دروازے کھولتا ہے۔ اس کالج سے پہلے ہندوستان میں کوئی پریس نہیں تھا۔ کتابوں کے صرف قلمی نسخے ملتے تھے اس لیے جان گل کرسٹ نے یہاں مصنفین کی لکھی کتابیں چھاپنے کے لیے اردو پریس قائم کیا۔ یہاں رہ کر میرامن دہلوی نے باغ و بہار، گنج خوبی اور قصہ چہار درویش؛ حیدر بخش حیدری نے طوطا کہانی اور آرائش محفل، میر شیر علی افسوس نے خلاصۃ التواریخ، مرزا علی لطف نے 'گلشن ہند'، میر بہادر علی حسینی نے 'نثر بے نظیر'، مظہر علی ولا نے 'بے تال پچیسی' اور 'تاریخ شیر شاہی'، نہال چند لاہوری نے 'مذہب عشق'، للولال جی نے 'سنگھاسن بتیسی' کاظم علی جواں نے 'شکنتلا' وغیرہ کی تصنیف و تالیف و ترجمہ کر کے اردو نثر کو نئے راستہ پر گامزن کیا۔ 1822 میں اردو کا پہلا ہفت روزہ 'جام جہاں نما' کلکتہ سے اشاعت پذیر ہوا جس کے مالک ہری ہر دت اور مدیر لالہ سدا سکھ مرزا پوری تھے۔ 1828 میں جب مرزا غالب کلکتہ کا سفر کرتے ہیں تو انھیں اردو شاعری، نثر نگاری اور صحافت کا حسین امتزاج یہاں نظر آتا ہے اور دلی واپس جا کر بھی وہ کلکتہ کے سحر سے آزاد نہیں ہو پاتے۔ 1856 میں انگریزوں کے ذریعے اودھ کی سلطنت سے بے دخل ہونے کے بعد تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی آمد ہوتی ہے۔ وہ مٹیا برج میں آکر بستے ہیں اور زبان و تہذیب کے لحاظ سے اسے دوسرا لکھنؤ بنا دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ اردو کے ادبا و شعرا بھی وہاں قیام پذیر ہوتے ہیں جن میں نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر، رضا خاں برق، علی جان درخشاں، الٰہی بخش تبسم، اسیر لکھنوی، نشتر لکھنوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

انیسویں صدی میں بنگال میں اردو زبان کی زلف سنوارنے میں ہر قوم کے لوگ نظر آتے ہیں ان میں جان گل کرسٹ، عبدالغفور نساخ، مرزا جان طپش، قاضی صادق اختر، جمے جے مترا ارماں، ایورب کشن بہادر، بوکنور، جادب کرشنا دیب شفق، شرف النسا، جوالا ناتھ ناگ، کشن دیب بہادر راجہ، عبدالغفور شہباز، سید محمد آزاد، خجستہ اختر سہروردیہ، کبیر الدین احمد، عبدالرحیم ابد، واعظ الدین احمد وغیرہ کے اسم گرامی اہم ہیں۔

بیسویں صدی میں بنگال کے ادبا، شعرا اور صحافیوں

نیشنل لائبریری

کی خدمات کا حاطہ کرنے کے لیے سیکڑوں صفحات کی ضرورت ہے۔ آزادی کی جدوجہد میں یہاں کے فرزندوں نے قلمی اور عملی جہاد کے روشن نقوش چھوڑے ہیں۔ شاعری کے میدان میں علامہ وحشت کلکتوی کا الگ مقام ہے جنھیں 'غالب ثانی' کہا گیا اور جن کی صلاحیت کا اعتراف ڈاکٹر اقبال، الطاف حسین حالی وغیرہ نے بھی کیا۔ ان کے علاوہ عباس علی خاں بے خود، آرزو لکھنوی، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، ابراہیم ہوش، اعزاز افضل،

صادق رائے بریلوی، عین رشید، علقمہ شبلی، قیصر شمیم، شمیم انور، منور رانا، شہناز نبی، زرینہ زریں تک ایک پورا کارواں ہے۔ نثر نگاری میں بھی نواب مفسر حسین خیال، ل احمد اکبر آبادی، عندلیب شادانی، نیاز احمد خان، لطیف الرحمٰن، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، ظفر اوگانوی، سالک لکھنوی، خلیل عباس صدیقی، عبدالمنان، یوسف تقی، ابوذر ہاشمی، حشمت کمال پاشا، الف انصاری، عشرت بیتاب، انور ادیب، مشتاق انجم وغیرہ تک جگمگاتے ستاروں کا سلسلہ ہے۔ اسی طرح صحافت میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، چراغ حسن حسرت، احمد سعید ملیح آبادی، وسیم الحق، ف س اعجاز، خورشید اختر فرازی وغیرہ کے نام سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

اکیسویں صدی میں بھی مغربی بنگال میں اردو کا پرچم بلند ہے۔ یہاں مخصوص علاقوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کا بل آخری مرحلے میں ہے۔ مغربی بنگال میں تقریباً 112 اردو میڈیم ہائی اسکول ہیں۔ کئی سو مدارس ہیں جہاں اردو اور بنگلہ دونوں میڈیم سے تعلیم دی جاتی ہے۔ بہت سے کالجوں میں اردو پڑھانے کا انتظام ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی اور بردوان یونیورسٹی میں اردو کے شعبے قائم ہیں۔ مغربی بنگال اردو اکادمی کے ذریعے ادبا، شعرا اور طلبا کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور انعام و اعزاز سے نوازہ جاتا ہے۔ ساتھ ہی درسی کتابوں کی اشاعت اور کوچنگ کا انتظام ہے۔ کلکتہ سے کئی روزنامے آزاد ہند، اخبار مشرق، راشٹریہ سہارا، آبشار، عکاس وغیرہ مسلسل شائع ہوتے ہیں۔ کئی ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہانہ جریدے بھی نکلتے ہیں۔ جن میں 'سرپرست' برحق، پول کھول، مقتل، اخبار اعظم وغیرہ خاص ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ رسالے مثلاً روح ادب، سہیل، انشا، مژگاں، ترکش، وغیرہ تواتر سے منظر عام پر آرہے ہیں۔ جگتدل سے انٹرنیٹ پر ماہنامہ 'کائنات' کی اشاعت ہوتی ہے۔ مولانا آزاد یونیورسٹی (حیدرآباد) کے کئی مقامی مراکز میں کامیابی کے ساتھ بی اے اور ایم اے تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ رائٹرس بلڈنگ سے حکومت کا ترجمان پندرہ روزہ 'مغربی بنگال' شائع کیا جاتا ہے۔ اردو داں طبقے میں کسی طرح کا احساس کمتری نہیں ہے۔ وہ مقابلے کے امتحانوں میں حصہ لیتے ہیں اور سرکاری نوکری میں کامیاب ہوتے ہیں۔ نثری و شعری محفلیں مسلسل منعقد ہوتی ہیں۔ لوگ زبان کے تئیں سنجیدہ اور فکرمند رہتے ہیں۔ اگر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، NCERT، CSIR وغیرہ جیسے ادارے یہاں کے اردو اداروں کے ساتھ اپنے تعاون کو بڑھائیں اور مشترکہ پروگرام چلائیں تو بڑی کامیابیاں مل سکتی ہیں۔

◘

Dr. Mohd Zahid, B-5, Matya Burj,
Kolkata- 24 (WB)

علی گڑھ تحریک اور اردو تنقید

ستار ساحر

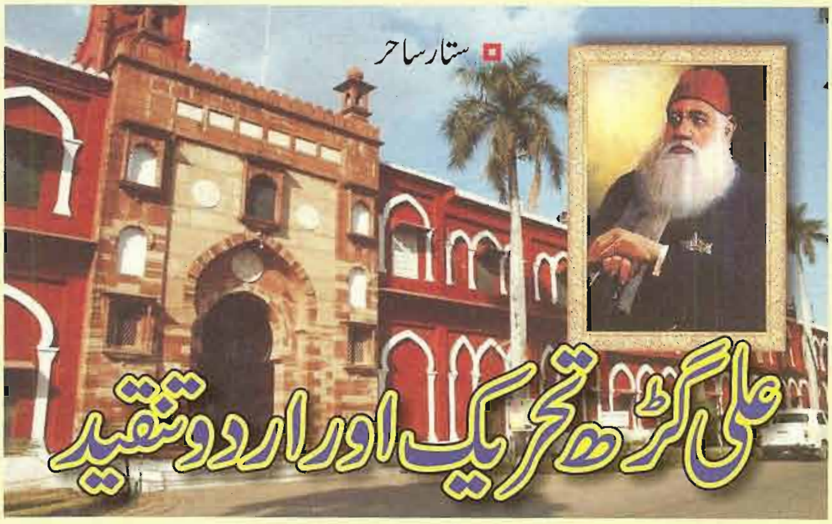

سرسید احمد خاں نے اردو ادب اور اپنے وقت کی زندگی کو بہت متاثر کیا ہے۔ ان کے رسائل اور اُن کی تحریروں نے اردو ادیبوں کو ایک ایسے ادب کی طرف متوجہ کیا جس کو تعمیری، اخلاقی اور افادی کہا جاسکتا ہے ان کے افکار و خیالات کی تاثیر نے اربابِ علم وفن کا ایک ایسا حلقہ پیدا کیا جو سرسید کا ہم نوا اور ہم مسلک تھا سرسید نے اس سے وابستہ لوگوں کو فکری سطح پر معروضی طرزِ اختیار کرنے اور سائنسی زاویہ نظر اپنانے کی دعوت دی۔ رفتہ رفتہ اس حلقے میں وسعت پیدا ہوئی اور اس کے اہلِ قلم نے جس دبستانِ ادب کی بنیاد رکھی وہ علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک کے زیر اثر انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں اردو میں کئی ادیب نمایاں ہوئے۔ مثلاً محسن الملک، چراغ علی، مولانا محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی اور ذکا اللہ۔ اگرچہ مولانا آزاد، ذکاء اللہ اور نذیر احمد کا علی گڑھ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا مگر تینوں کو سرسید کے اخلاص اور ان کے اصلاحی خیالات کا اعتراف تھا۔

علی گڑھ تحریک کا امتیاز یہ ہے کہ اس کے ذریعے مذہب میں عقلیت، سماجی زندگی میں رسم و رواج سے بیزاری اور تعلیم و تہذیب میں مغربی طرزِ تعلیم اور ترقی پسندی کی جانب لوگوں کو متوجہ کیا گیا۔ دوسرے لفاظ میں سرسید نے جس مہذب اور متمدن سماج کی تشکیل کا خواب دیکھا تھا اُسے قوت سے عملی جامہ پہنانے کے لیے اس تحریک نے غیر معمولی جدو جہد کی۔ بقول سید عبداللہ:

''علی گڑھ تحریک کو بظاہر صرف سیاسی اور محض تعلیمی تحریک خیال کیا جاتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ہے یہ ایک لحاظ سے ایک علمی اور ادبی تحریک بھی ہے علمی اس معنی میں ہے کہ اس تحریک کے زیر اثر فکر و نظر میں اہم انقلاب پیدا ہوا اور مذاقِ تصنیف میں گہری تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ملک میں مغرب سے استفادہ کرنے کے لیے جو میلان پیدا ہوا، اُس کے ماتحت جس طرح اندازِ نظر بدل گئے اُسی طرح معانی اور موضوعات میں بھی تغیر پیدا ہوا۔'' (سرسید اور ان کے نامور رفقا، ص67,68)

مذہبیات میں منقولات اور روایات سے مواد حاصل کرنے، تاریخ میں سرسری واقعہ نگاری، تصوف یا صوفیانہ ادب میں مابعدالطبیعاتی انداز اور عرفانی رنگ، تذکروں میں مناقب اور فضائل کا مبالغہ آمیز بیان جیسے رجحانات کو سرسید کی علمی و ادبی تحریک نے بدل ڈالا اور ایک ایسے علمی مذاق کی بنا رکھی جسے ایک طرف حقیقت اور صداقت کی تلاش تھی تو دوسری طرف وہ افادیت اور مقصدیت کا علمبردار تھا سرسید کے تمام علمی کاموں کی اساس، سچائی کی تلاش اور تکمیل زندگی و ترقی پر ہے اور یہی علی گڑھ تحریک کی روح ہے یہ وہ سائنٹفک نقطۂ نظر ہے جس کو علی گڑھ تحریک اور اس کے بانی سرسید نے پیدا کیا۔

ادبی اعتبار سے علی گڑھ تحریک کے اثرات بہت وسیع اور دوررس رہے ہیں اُسلوبِ بیان اور نفس مضمون کے ساتھ ساتھ ادبی انواع کے معاملے میں بھی علی گڑھ کے ناموروں کی توسیعی کوششوں کو بڑا دخل ہے انھوں نے بعض ایسی اصناف ادب کی ترویج کی جو مغرب سے آئی تھیں ان اصناف کا ہمارے ادب میں یا تو سرے سے فقدان تھا یا پھر ان کی شکل مختلف تھی ان میں متوجہ کرنے والے رجحانات یہ ہیں نیچرل شاعری کی تحریک، جس میں آرزو کے ساتھ حالی کا اسم گرامی بھی شامل ہے نیچرل شاعری کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ فطری جذبات کے تحت رکھا جائے اور اندازِ بیان بھی فطری ہو۔ قدیم طرزِ شاعری سے بھی اس تحریک نے انحراف کیا۔ مولانا حالی کی تنقیدی شاعری سے اِس بات کی توثیق ہوتی ہے کہ اس میں ایسے ہی بڑے اور اہم مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اُردو میں جدید تنقید کی ابتدا بھی سرسید اور ان کے رفقا سے ہوتی ہے اس سلسلے میں بعد میں جو کوششیں ہوئیں اور آگے بڑھیں ان کا نقشِ اولیں دراصل یہی تھا۔ بیشتر معاملات میں سرسید کی تنقید اور ان کا تنقیدی نقطۂ نظر اسی انتقادی رجحان کے لیے تقویت کا سبب بنا۔ سرسید کے رفقا میں حالی اور شبلی نے نقدالادب کے معیار کو اس درجہ بلند کیا کہ جہاں سے آگے وہ آج تک شاید کچھ زیادہ نہیں بڑھ سکی۔

اردو میں تنقیدی اشارے سب سے پہلے شاعری میں نظر آتے ہیں ہمارے قدیم شاعروں میں پہلے پہل وجہی نے اپنے کلام میں شاعری سے متعلق اپنا خیال ظاہر کیا اس کے بعد غواصی نے بھی شاعری کے بارے میں اپنی رائے دی۔ ولی، سراج، آبرو، میر اور غالب نے بھی شاعری کے فن پر اظہارِ خیال کیا۔ نثر میں تنقید کے ابتدائی نقوش اردو شعرا کے تذکروں میں ملتے ہیں ان کے علاوہ کتاب کی تقریظوں اور بعض تبصروں میں بھی تنقید کی جھلکیاں نظر آتی ہیں تذکروں میں دستیاب تنقیدی نمونوں کو باقاعدہ تنقید نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ان میں شاعر کا مختصر تعارف کراتے ہوئے چند جملوں میں شاعر کے کلام پر رائے دی جاتی ہے۔ چند تذکرے ایسے ہیں جن میں تنقید کلام کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ان میں میر کا نکات الشعرا، مصحفی کا تذکرۂ ہندی، شیفتہ کا گلشنِ بے خار اور محمد حسین آزاد کا آبِ حیات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

زمانے نے کروٹ بدلی تو انگریزی راج قائم ہوا اور انگریزوں کے ذریعے مغربی ادب کے اثرات ہندوستان پہنچے۔ سرسید نے پہلی بار ادب کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا۔ سرسید کا دور اردو ادب کی ترقی کا ابتدائی زمانہ تھا لہٰذا اس دور میں کسی ترقی یافتہ اور مکمل نظام تنقید کی توقع رکھنا بے سود ہے لیکن یہ سچ ہے کہ اسی زمانے میں فن کے شعور اور اصول کے تنقید کے صحیح ادراک کی ابتدا ہوئی اور ایسی کہ اس میں نظری اور عملی دونوں اعتبار سے تنقید کے بعض شاہکار وجود میں آئے۔ ان میں بعض کی حیثیت اردو میں وہی ہے جو مغربی نظام تنقید میں ارسطو کی 'بوطیقا' یا لون جائینس کی "On the Subline" کی ہے۔

سرسید کی فنِ تنقید پر کوئی مبسوط کتاب نہیں ہے تاہم ان کے خیالات نے تنقیدی رجحانات کو بہت متاثر کیا۔ مثال کے طور پر اُن کے اِس بنیادی تصور نے کہ اعلیٰ تحریر سچی ہوتی ہے اور وہ دل سے نکل کر دل پر اثر کرتی ہے جو

بعد میں آنے والے تقریباً تمام تنقیدی تصورات کی بنیاد ہے۔ سرسید کا یہ نقطۂ نظر بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ مصنف کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے تو اُس کی ادائیگی کا طریقہ خود بخود متعین ہوگا جو نیچرل اور قدرتی ہوگا۔ سرسید نے عام ادب ہی نہیں بلکہ تنقید میں نیچرل اسلوب کو قائم کیا اور ان کا یہ طریقہ ان کے تمام رفقا نے نظامِ تنقید میں برتا ہے۔ خاص طور پر حالی کے نقد ونظر کی بنیاد یہی فطری طریقہ ہے۔

سرسید نے ہمارے ادب کے 'ادب برائے ادب اور حسن برائے حسن' کے تصور سے قطع نظر کرتے ہوئے اُس کو زندگی کے مقاصد سے وابستہ کیا۔ ان کی نظر میں ادب افادی عمل کی حیثیت رکھتا ہے جو تکمیل حیات اور ترقی کا اہم وسیلہ بن سکتا ہے اس بنا پر سرسید کو پہلا ترقی پسند ادیب اور نقاد کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ادب کو تفنن طبع کا ذریعہ نہیں سمجھا۔ وہ ادب کو قومی اور اجتماعی کام لیے جانے کے قابل سمجھتے ہیں۔ سرسید عام تاریخی اور علمی تنقیدوں میں عقل اور فطرت کے فیصلوں کو بنیاد قرار دیتے ہیں اس اعتبار سے نقد ونظر ان کے لیے سائنسی تجربے کے قریب قریب ایک فعل ہے جس میں کسی نتیجے یا فیصلے پر پہنچنے کا واحد ذریعہ مشاہدہ اور تحلیل ہے بقول سیدعبداللہ:

''اردو کے تنقیدی تصورات میں سب سے پہلے سرسید ہی نے واضح کیا کہ انشا میں اصلی چیز مضمون ہے طریقِ ادا نہیں— پھر یہ بھی بتایا کہ اعلیٰ انشا میں جذباتِ صادقہ، حسن اور اثر وتاثیر کے ضامن ہوتے ہیں محض تک بندی اور بے مقصد استعارات وتشبیہات سے حسن نہیں نکھرتا۔'' (سرسیداوران کے نامور رفقا:ص202)

سرسید کے ان تصورات سے اُن کے رفقا ہی نہیں بلکہ بعد کے ادیب اور نقاد دونوں متاثر ہوئے۔ یہاں اُن کے رفقا حالی اور شبلی کے تنقیدی نظریات کا تذکرہ کریں گے۔

سرسید کے تنقیدی خیالات کا اثر تھا کہ 'انجمن پنجاب' کی تاسیس سے جدید نظم نگاری کا آغاز ہوا اور محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے روایتی غزل کو چھوڑ کر موضوعاتی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ حالی نے سرسید کے تنقیدی نظریات کو سمیٹ کر ان پر غور کیا اور مقدمۂ شعر وشاعری کی شکل میں پیش کیا اور اس طرح تنقید کی پہلی باضابطہ کتاب وجود میں آئی۔ مقدمۂ شعر وشاعری حالی کا شاہکار ہے تاہم ان کے تنقیدی تصورات حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید میں بھی نظر آتے ہیں نیز چند بکھرے خیالات اُن کے بعض مقالوں میں بھی ملتے ہیں۔ مولانا حالی نے 'مقدمۂ شعر وشاعری' کے ذریعے بلاشبہ سب سے پہلے اردو تنقید کے اصول مقرر کیے۔ اسی لیے مولوی عبدالحق نے مقدمہ کو تنقید کا پہلا نمونہ قرار دیا اور آل احمد سرور نے اسے اردو شاعری کے پہلے منشور کا نام دیا۔ مقدمۂ شعر وشاعری اردو تنقید میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے مقدمہ میں حالی نے شعر و شاعری کے عام اصولوں اور اردو کی مختلف اصنافِ سخن پر تنقید کی ہے شعر اور اس کی تاثیر سے متعلق اپنی بحث کا آغاز کرتے ہوئے حالی نے تہذیب سے اُس کا رابطہ قائم کیا ہے اُس کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ شاعری سماج کے تابع ہوتی ہے ان کے خیال میں شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں تخیل، مطالعۂ کائنات اور تفحص الفاظ۔ وہ شعر میں سادگی، جوش اور اصلیت کی موجودگی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور حیات جاوید کی عملی تنقیدوں سے بھی حالی کے نظریات وتصورات پر کافی روشنی پڑتی ہے ان میں ادب پاروں کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے مقابلہ وموازنہ کے اصول پر عمل کیا ہے۔ حالی کے تنقیدی تصورات کو نہ صرف مشرقی کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی خالص مغربی۔ انھوں نے مغربی اصول تنقید سے بالواسطہ استفادہ کیا ہے مقدمۂ شعر وشاعری کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر وہ یورپ کے فن انتقاد سے مکمل واقفیت رکھتے تو اس کی نوعیت الگ ہوتی۔ حالی نے نقد ونظر کے جمالیاتی پہلو پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ ایسی تنقید کو اچھی قرار دیتے ہیں جس میں اعتدال کو مدنظر رکھا گیا ہو۔ سیدعبداللہ کے الفاظ میں:

''اردو تنقید میں حالی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فارسی اور اردو کی عملی تنقید سے ایک منظم نظریۂ تنقید پیدا کیا۔ پرانی تنقید میں عمل تھا مگر اصول نہ قلم بند تھے نہ واضح۔ حالی نے پرانی تنقید کو ایک نیا نظریہ بخشا۔ ان کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے مغربی تنقید اور مشرقی نقد و نظر میں ایک پیوند قائم رکھنے کی کوشش کی۔''

(سرسیداوران کے نامور رفقا،ص205)

علامہ شبلی نے بھی اردو تنقید کی نشو ونما میں بہت مدد کی۔ ادبی تاریخ وتنقید میں شبلی کی 'شعر العجم' اور 'موازنۂ انیس و دبیر' شامل ہیں۔ شبلی کے تنقیدی افکار کو سمجھنے کے لیے سب سے اہم تصنیف 'شعر العجم' ہے اور خاص طور پر اس کا چوتھا حصہ جس میں تنقیدی نظریات پیش کیے گئے ہیں انھوں نے 'شعر العجم' میں شاعری کی حقیقت اور ماہیت پر روشنی ڈالی ہے اور شاعری کا سرچشمہ احساس اور ادراک قرار دیا ہے یہ کتاب فارسی شاعری کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ان کے تنقیدی تصورات کا سرچشمہ ہے 'موازنہ انیس و دبیر' سے اُردو میں عملی اور تقابلی تنقید کی ابتدا ہوئی۔ اس میں مرثیہ کی ماہیت سے بحث کی گئی ہے اس بہانے شبلی نے اچھی شاعری کے اصول بھی بیان کیے ہیں ان دو تصانیف کے علاوہ سوانح مولانا رومؒ اور متعدد مقالات میں انھوں نے نقد ونظر کے معیاروں پر روشنی ڈالی ہے۔ ادبی تنقید کے علاوہ شبلی نے ادب اور علوم کی بعض دوسری شاخوں کی تنقید کے اصولوں کی بھی وضاحت کی ہے مثال کے طور پر سوانح نگاری اور تاریخ نگاری کے اصول۔ مہدی حسن نے 'شعر العجم' کو تنقیدِ عالیہ (ہائی کریٹیسزم) (High criticism) کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ اردو ادب ہی نہیں بلکہ مشرق کی کسی بھی زبان میں اس پایہ کی کتاب موجود نہیں ہے مغربی اصولوں سے استفادہ کے باوجود 'شعر العجم' کی وضع قطع مشرقی ہے۔

شبلی نے عام تنقید کے چند اصول مقرر کیے ہیں انھوں نے عام طور پر طبعی حالات کا اثر شاعری پر دکھایا ہے انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ معاشرتی اور سماجی حالات سے قوموں کی شاعری اثر پذیر ہوتی ہے۔ شبلی نے عملی تنقید میں شاعروں کے کلام کے ان حصوں کو زیادہ اہمیت دی ہے جن سے عزتِ نفس، خودداری، آزادی، اولوالعزمی اور حق گوئی کی صفات نمایاں ہوتی ہیں دراصل ان صفات کی شبلی کے زمانے کی سوسائٹی کو بہت ضرورت تھی۔ شبلی کے نظامِ تنقید میں نیچر کو بنیادی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

سائنٹفک نظریۂ تنقید میں سب سے پہلا نام سرسید کا ہے۔ ان کا ذہن منطقی تھا اور وہ ہر چیز کو عقل اور سائنس کی کسوٹی پر کسنے کے عادی تھے۔ حالی نے سرسید کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سائنٹفک بنیادوں پر تنقید کی مکمل عمارت تعمیر اور سربلند کی۔ دراصل حالی نے ہی اردو تنقید کو ایک جامع نظام دیا۔ ایک طرف حالی نے بیسویں صدی کی تنقید کی ذہنی قیادت کی اور دوسری طرف شبلی کی تنقیدی تحریروں نے کئی نسلوں کے مذاقِ سخن کی تربیت کی۔

علی گڑھ تحریک کی بدولت اردو شعر وادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تحریک اردو زبان میں مقصدی ادب کی پہلی آواز ہے اور اردو نظم ونثر کی تمام اصناف و اسالیب کے امکانات کا ازسرِنو جائزہ لے کر اسے قومی زندگی اور اقدارِ عالیہ کا ترجمان بنانے کی پہلی جدوجہد—

■

Prof. S.A. Sattar, Dept. of Arabic, Persian & Urdu, S.V. University, Tirupati - 517502, (A.P.)

محمد اطہر مسعود خاں

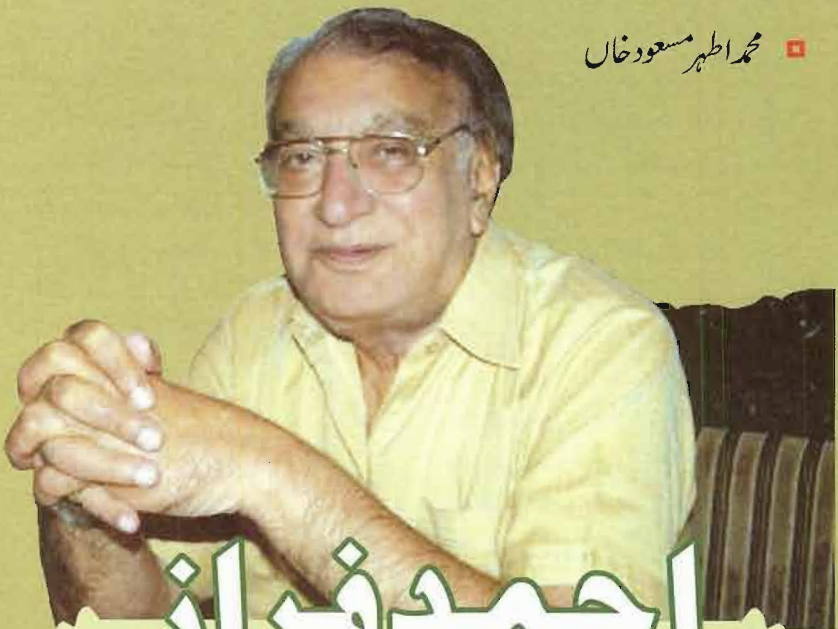

احمد فراز کی غزل میں انسانی قدریں

اردو کے حسن و جمال، اس کی شیرینی و حلاوت، اس کی نزاکت و نفاست اور اس کے رنگ کمال پر اس کے پرستار اور شیدائی، اس کے دلدادہ اور فدائی اس کی تعریف و توصیف میں ہزاروں صفحات لکھ چکے ہیں اور یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا جاتا ہے۔ فن شاعری اور احمد فراز کی غزل گوئی کے تذکرہ سے قبل، اردو کی دلکشی کے تعلق سے پروفیسر خالد حسین خاں کا ایک خوبصورت اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''شہد سے زیادہ شیریں، عطر سے زیادہ عنبریں، صندل سے زیادہ صندلیں، گلاب سے زیادہ گلگوں، دلبر سے زیادہ دلبریں، محبوب سے زیادہ مہ جبیں، معشوق سے زیادہ مہ وشیں، تصور سے زیادہ تہ نشیں، نادی سے زیادہ نازنیں، غرضیکہ جو غزل بن کر دلوں کو مسحور کر لے، نظم بن کر حواس پر چھا جائے، قصیدہ بن کر دماغ کو مسخر کر لے، مرثیہ بن کر قلب کو محزوں کر دے، تقریر بن کر سامعین کو مرتعش کر دے اور تحریر بن کر قارئین کے ہوش اڑا دے، یہ خوبی، یہ محبوبی، یہ ادا، یہ کمال اور یہ کرشمہ اردو زبان کا ہے، یہ جمال اور جلوہ اردو کا ہے، یہ جوبن اردو کا ہے اور یہ جوانی اردو کی ہے۔ یہ قتالۂ عالم ہندوستان میں پیدا ہوئی، دلی، لکھنؤ، حیدرآباد، عظیم آباد، بھوپال، رام پور اور میرٹھ میں اس نے جوانی میں قدم رکھا اور یہیں اس میں جوبن و نکھار اور وقار آیا۔ اس الہڑ ناری کے شیدائی بلا تخصیص مذہب و مسلک، رنگ و نسل پورے کرۂ ارض میں موجود ہیں۔'' (گفتنی) کتاب: ساز و مضراب مصنف، بی ایس این جوہر)

احمد فراز کی شاعری جہاں عصری حسیت کی شاعری ہے اور وہیں اس میں غم دوراں اور غم جاناں کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں سوز و گداز اور درد و کرب کے عناصر کی موجودگی ان کے بے حد حساس ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے:

اپنی افسردہ مزاجی کا برا ہو کہ فراز
واقعہ کوئی بھی ہو آنکھ کو بھر آنا ہے۔

موجودہ دور میں سماج کا سب سے بڑا مسئلہ اور انسانی زندگی کا ایک بڑا المیہ انسانی قدروں کی پامالی ہے اور یہ پامالی ایک ایسی تاریکی کی مانند ہے جسے آج ہم نے دور نہ کیا تو یہ اجالوں پر بھی اپنی کمند ڈال دے گی۔ احمد فراز نے ایک تیکھے طنز کے ساتھ اس طرف بے باکی سے اشارہ کیا ہے:

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فراز
رات تو رات ہے ہم دن کو جلاتے ہیں چراغ

آج ہم دوستانہ تعلقات کے کس قدر تلخ تجربات سے گزرتے ہیں، ان کی ایک تلخ لیکن حقیقی مثال احمد فراز کے اس شعر سے دی جا سکتی ہے:

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

لیکن سارے ذاتی و سماجی دکھ درد، رنج و الم، غم واندوہ اور مصیبت و پریشانی کے باوجود زندگی کی بوقلمونی، اس کی رنگارنگی، اس کا حسن و جمال، اس کی لطافت و نزاکت، اس کا سفر و حضر اور اس کی روانی، جاری و ساری رہتی ہے کیونکہ اس کائنات کی سب سے حسین اور خوبصورت شے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سب سے عظیم نعمت کا نام ہے زندگی!

اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہم سب سے زیادہ زندگی کو ہی پیار کرتے ہیں۔

زندگی کے پس منظر میں خلیل الرحمٰن اعظمی کا یہ شعر بھی دل کے تاروں کو چھوتا ہے اور خود اس شعر کی گہرائی میں جتنا غور کیجیے اس کا عمق دراز ہوتا محسوس ہوگا۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

لوگ مرنے کے لیے زہر پیا کرتے ہیں
زندگی! تیرے لیے زہر پیا ہے میں نے

لیکن وہ بزرگ جو اپنی زندگی نہایت سادگی سے گزار گئے، ہمیں طویل عمر کی دعا بھی دے گئے۔ اس سلسلے میں پروفیسر نورالحسن ہاشمی کا ایک شعر دل میں اترنے کے لیے کافی ہے:

بڑھاپا اور یہ لمبی زندگانی
بزرگوں کی دعا نے مار ڈالا

احمد فراز کے یہاں بھی زندگی مختلف تجربوں اور رویوں کے ساتھ رنگارنگ روپ میں ملتی ہے۔ اس تعلق سے یہاں ان کے چند اشعار پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔ ان اشعار میں محبت، جدائی، کرب اور مختلف قلبی جذبات کی جلوہ گری نظر آتی ہے:

آج اک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے
کاش تو بھی کبھی آجائے مسیحائی کو
لوگ آتے ہیں بہت دل کو دکھانے میرے
چارہ گر یوں تو بہت ہیں مگر اے جان فراز
جز ترے اور کوئی زخم نہ جانے میرے

محبت اور دوستی میں سب سے قیمتی شے کا نام اعتبار ہے۔ یہ نہ ہو تو محبت کی کونپل نہ تو نمو پا سکتی ہے اور نہ کبھی بڑھ کر برگ و بار لا سکتی ہے۔ اردو شاعری میں اس تعلق سے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اشعار کہے گئے ہیں، ان

میں احمد فراز کے شعروں کی ندرت بھی قابل داد اور لائق تحسین ہے۔ جس طرح ہرا زخم مندمل ہونے کے باوجود اپنا نشان ضرور باقی رکھتا ہے۔ اسی طرح دوستی کا تعلق بھی کچے دھاگے سے زیادہ نازک ہوتا ہے اور یہ ٹوٹ کر بھی جڑ بھی جائے تو اس میں عیب ضرور آجاتا ہے۔ کچھ ایسے ہی جذبوں کی عکاسی کرتے ہوئے، احمد فراز کے، حقیقت سے قریب اور دل کو چھو لینے والے اشعار کو کون فراموش کرسکتا ہے؟ اسی ضمن میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ محبت بھی ہے کیا روگ فراز
جس کو بھولے وہ سدا یاد آیا
دل کے زخموں کو نہ رو دوست کا احسان سمجھ
ورنہ وہ دستِ حنائی نہیں دیتا کچھ بھی
تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا
جدائیاں ہوں تو ایسی کہ عمر بھر نہ ملیں
فریب دو تو ذرا سلسلے بڑھا کے مجھے
یہ لوگ تذکرے کرتے ہیں اپنے لوگوں کے
میں کیسے بات کروں، اب کہاں سے لاؤں اسے

احمد فراز کی عصری حسیت اور آگہی نے انھیں عام آدمی کے مسائل کو سمجھنے اور ان کو اجاگر کرنے کا موقع دیا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اس پر آشوب دور میں، ہر ادیب و شاعر کو اپنے قلم کی حرمت و سچائی کا پاس و لحاظ رکھنا نہایت دشوار عمل ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس بار گراں کو اٹھانے کی ذمے داری قبول کرتے ہوئے فرمایا:

مرا قلم تو امانت مرے لہو کی ہے
مرا قلم تو امانت مرے ضمیر کی ہے

احمد فراز کی بصیرت اور ان کا وجدان وسیع ہے اور ان کی فکر کسی مخصوص خطۂ ارض کا احاطہ نہیں کرتی۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی انسانی قدروں کو پامال اور عزت و تقدس کو رسوا کیا جارہا ہو، ان سب کے لیے احمد فراز اپنے قلبی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں:

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا لیا دل سے
اس آسرے پہ کہ اک غم گسار اپنا ہے
تنہائی میں روتے ہیں کہ یوں دل کو سکوں ہو
یہ چوٹ کسی صاحب محفل سے لگی تھی
اداسیاں ہوں مسلسل تو دل نہیں روتا
کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری لگے

چونکہ ہر نثری شہ پارہ اور ہر شعری تخلیق اپنے دور کی عکاسی کرتی ہے، اس لیے یہ عکاسی اور سماج کی نباضی فراز کے کلام میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ اہل نظر شاعر اور صاحب فکر و بصیرت فنکار تھے۔ اس لیے ان کی شاعری میں سطحیت نہیں بلکہ گہرائی ہے۔ اپنے گرد و پیش کی منظر کشی وہ یوں کرتے ہیں:

تم جو نا خوش ہو یہاں کون ہے خوش پھر بھی فراز
لوگ رہتے ہیں اسی شہر دل آزار کے بیچ
تو یہیں ہار گیا ہے مرے بزدل دشمن
مجھ سے تنہا کے مقابل ترا لشکر نکلا

اپنے دور کی فکر و آگہی کا کرب آمیز ادراک فراز کی شاعری کی شناخت اور پہچان بن گیا تھا۔ غم جاناں اور غم دوراں کے باعث اور اس کے برملا اور دوٹوک اظہار کی وجہ سے ان کی شاعری دو آتشہ بن گئی تھی۔ اس آفاقی، غیر مرئی اور لاشعور دکھ کو انھوں نے متعدد اشعار میں پیش کیا۔ یہاں بطور نمونہ چند اشعار نذر کیے جاتے ہیں:

غم دنیا میں غم یار بھی شامل کرلو
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں
اپنی بود و باش نہ پوچھو
ہم سب بے توقیر ہوئے
کون گریباں چاک نہیں ہے
ہم ہوئے تم ہوئے میر ہوئے
جب شاعری پردہ ہے فراز اپنے جنوں کا
پھر کیوں کیا رسوا مجھے اشعار نے میرے

فراز کی شاعری میں فرد کے ذاتی دکھ درد، اس کی ناکامیوں اور محرومیوں اور انسانی ہمدردی کے گہرے جذبات کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کا خلوص اور اس خلوص کا والہانہ پن ان کے متعدد اشعار میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے:

ناوک ہی رہا قسمت ہر دیدۂ بینا
نیزہ ہی مقدر رہا بے باک دہن کا

احمد فراز کی شاعری کی وسعت کے باعث، اس کا تجزیہ کسی ایک مخصوص موضوع یا مختصر رویہ کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کی شاعری کے متعدد پہلو ہیں اور ہر پہلو کی تفصیل اور تفہیم کے لیے ان کے بہت سے اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے وجدان، ان کے علم، ان کی قوت فکر اور ان کی وسعت نظر نے اشعار کی صورت میں اردو ادب کو ایسے گہر ہائے آبدار سے نوازا ہے جن کو ایوان شاعری میں نگینوں کی طرح جڑا جاسکتا ہے اور جن سے ذہن و دل کو یقیناً نئی سوچ و فکر ملتی ہے۔ یہاں مختلف موضوعات کے تحت چند متفرق اشعار پیش ہیں:

ہم نے اک عمر بسر کی ہے غم یار کے ساتھ
میر دو دن نہ جئے ہجر کے آزار کے ساتھ
میں آج زد پہ اگر ہوں تو خوش گماں نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں
ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ
آج دل کھول کے روئے ہیں تو یوں خوش ہیں فراز
چند لمحوں کی یہ راحت بھی بڑی ہو جیسے

جدید اردو شاعری آج ان موضوعات کی نمائندگی اور عکاسی کرتی ہے ان کا ماضی میں تصور بھی محال تھا۔ موجودہ دور میں غزل کے موضوعات کی رنگارنگی اور مضامین کے تنوع نے غزل کو مالا مال کردیا ہے۔ احمد فراز کا شمار یقیناً بیسویں صدی کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے لیکن ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے ان پر ایم فل، پی ایچ ڈی یا ڈی لٹ کے تحت مبسوط تحقیقی مقالات لکھے جانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ آئندہ نسلیں ان کے کلام کو مزید بہتر طور پر سمجھ سکیں اور ادب میں ان کے قد آور مرتبے کا تعین بھی حقیقی طور سے ہوسکے۔ امید ہے یونیورسٹیوں کے پروفیسر صاحبان نئے ادیبوں اور پروفیسر اسکالرز کو اس جانب راغب کرکے ادب کی اس اہم خدمت کو ضرور تکمیل تک پہنچائیں گے۔

مختلف موضوعات، کائناتی مشاہدات اور قلبی واردات نے فراز کو صدا تخلیق کلام پر مہمیز کیا اور اپنے تجربات کو فراز نے قرطاس و قلم کے سپرد کیا۔ یہاں صرف چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے:

دل تو وہ برگ خزاں ہے کہ ہوا لے جائے
غم وہ آندھی ہے کہ صحرا بھی اڑا لے جائے
یہ ظلم دیکھ کہ تو جان شاعری ہے مگر
مری غزل میں ترا نام بھی ہے جرم سخن
چپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو فراز
دنیا تو عرض حال سے بے آبرو کرے
ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جا
یہ منظر بارہا دیکھا نہ جائے
اس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم
زندگی پر اس سے بڑھ کر طنز کیا ہوگا فراز
اس کا یہ کہنا کہ تو شاعر ہے دیوانہ نہیں

(قومی اردو کونسل کے تعاون سے مراد آباد میں منعقدہ سیمینار میں پڑھا گیا۔)

■

Dr. M. Athar Masood Khan, Ghaus Manzil, Talab Mulla Iram, Rampur - 244901 (U.P.)

محمد فرقان سنبھلی

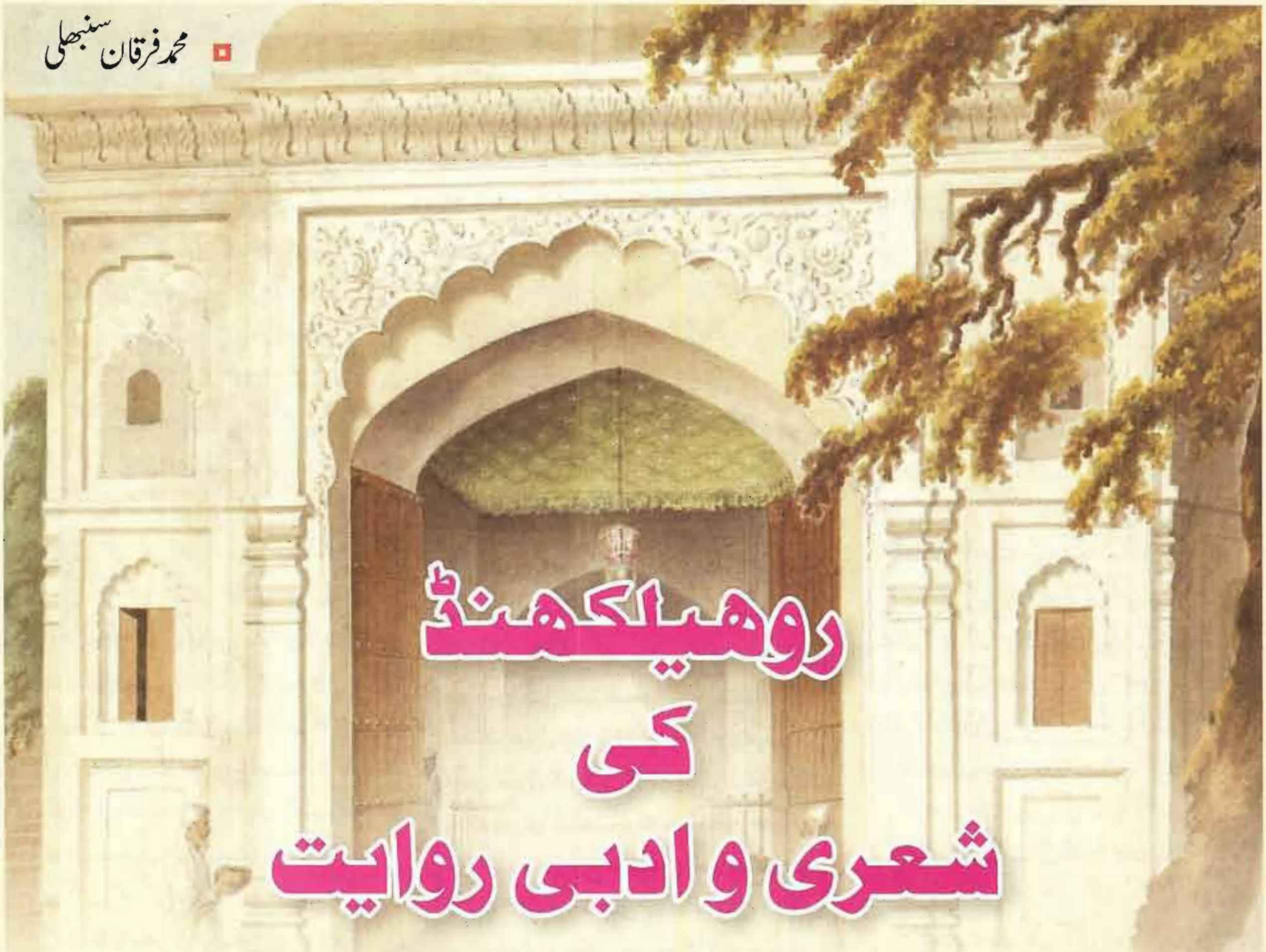

روھیلکھنڈ کی شعری و ادبی روایت

علاقہ روہیلکھنڈ کی تاریخ جتنی اہم اور دلچسپ ہے اتنی ہی اس علاقے کی ادبی روایت اہمیت کی حامل ہے۔ پیلی بھیت ضلع کو اگر چھوڑ دیں تو باقی روہیلکھنڈ علاقہ میں ادبی سرگرمیاں عہد بہ عہد جاری دکھائی دیتی ہیں۔اس علاقے سے نامور شعراء اور ادبا کی ایک پوری کہکشاں وابستہ نظر آتی ہے۔ جہاں میر، غالب اور داغ وغیرہ اساتذہ فن روہیلکھنڈ کی زمین پر قدم رکھنے کو مجبور ہوئے وہیں دوسری طرف مصحفی، فانی، عندلیب شادانی، مصور سبزواری وغیرہ نے خطہ روہیلکھنڈ سے باہر نکل کر علاقہ کا نام روشن کیا۔ خط روہیلکھنڈ سے وابستہ شعرا میں مصحفی، فانی بدایونی، عرفان صدیقی، شاہ عارفی، عندلیب شادانی، باغ سنبھلی، مصور سبزواری وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں تو دوسری طرف عبدالرحمٰن بجنوری، آل احمد سرور، امتیاز علی عرشی، سجاد حیدر یلدرم، قرۃ العین حیدر، سلطان حیدر جوش، قاضی عبدالغفار وغیرہ کے نام نثر سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ خطہ روہیلکھنڈ کی ادبی روایت کا ذکر کریں تو یہ بات واضح طور پر محسوس ہوتی ہے کہ یہاں غزل شاعری کا محور تصور کی گئی ہے۔ جبکہ قصیدہ، لوک گیت، نظم، مرثیہ، لغت گوئی وغیرہ پر بھی کافی کام ہوا ہے۔

مختلف زمانوں میں میر تقی میر، مرزا غالب، داغ دہلوی جیسے قادر کلام شعرا نے خطہ روہیلکھنڈ میں قیام کیا اور یہاں ان کے بہت سے شاگرد بھی رہے۔ نامور شعرا کی موجودگی سے خطہ روہیلکھنڈ میں صنف غزل پر بڑا انکھار آیا۔ روہیلکھنڈ میں غزل گوئی کا معتبر نام 'قائم چاندپوری' کا ہے۔ جو کہ خواجہ میر درد اور مرزا محمد رفیع سودا کے شاگرد تھے۔ وہ 1722/1726 (1) میں پیدا ہوئے۔ قائم چاندپوری نے دہلی میں رہ کر شعر و سخن کا آغاز کیا لیکن بعد میں رام پور آگئے تھے۔ وہ لکھنؤ بھی گئے لیکن واپس رامپور ہی لوٹے اور یہیں مقبرہ محمد یار خاں کے قریب دفن ہیں۔ قائم چاندپوری کے کلام میں دلکشی، سوز و گداز اور جاذبیت ہے۔ غزلوں میں روانی اور تغزل بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں خیال اور فکر کی بلندی، حسن و بیان، معنویت اور رعنائی بھی پائی جاتی ہے:

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں جا کر کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

غلام ہمدانی مصحفی خطہ روہیلکھنڈ کے ایسے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے بڑی تعداد میں شعر کہے ہیں۔ امروہہ میں 1747 میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری میں دہلی اور لکھنؤ دونوں طرح کا رنگ ملتا ہے۔ مصحفی نے قصیدے میں بھی ہاتھ آزمائے لیکن غزل میں انھیں امتیاز حاصل تھا۔ غنائت، دلکشی، زبان کی شیرینی اور لہجے کی نرمی کے ساتھ ساتھ دل پسند ترکیبیں اور مشکل زمین ان کے کلام کی خاصیت ہیں۔ مصحفی نے اردو کے آٹھ دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔ جو کہ نہایت ضخیم ہیں:

شوخی تو دیکھو تیر کو سینے سے کھینچ کر
کہتا ہے میرے تیر کا پیکان رہ گیا

روہیلکھنڈ علاقہ میں رامپور علم و ہنر کا بے مثال مرکز تھا۔ نظام رامپوری اسی رامپور میں 1823 میں پیدا ہوئے (2) نظام عاشقی اور رند مشرب مزاج کے انسان تھے (3) وہ خوش فکر، خوش مزاق شاعر تھے اور ان کی شاعری دلی جذبات کی ترجمان تھی۔ ان کا مجموعۂ کلام بھی شائع ہو کر مقبول ہوا ہے:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

خطہ روہیلکھنڈ میں ضلع شاہ جہاں پور کی بھی اپنی

خاص ادبی روایت رہی ہے۔ حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ’حیرت شاہ جہاں پوری‘ کی ولادت 1869 میں ہوئی۔ انھوں نے ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے(4)۔کلام روزمرہ کی صفائی، بندش کی ندرت اور سادہ زبان سے بھرپور ہے:

ستم کر گیا وہ بھی وقت رخصت
وہ مڑ مڑ کے ان کا ادھر دیکھ لینا

سنبھل بھی اپنی تاریخی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے کئی عہد میں مشہور رہا ہے۔ جانشین داغ دہلوی فضل رب ’عباسی باغ سنبھلی‘ سنبھل میں 1871 میں پیدا ہوئے (5) باغ سنبھلی کے کلام پر داغ کا رنگ خوب محسوس ہوتا ہے۔ غیر مطبوعہ دیوان موجود ہے۔ غزل کے معروف شعرا میں باغ سنبھلی کا شمار تھا:

تھی کلی کو پھول بننے کی خوشی
یہ نہ سمجھی موت کا پیغام ہے

’فانی بدایونی‘ ضلع بدایوں کے قصبہ اسلام نگر میں (1879) میں پیدا ہوئے(6) فانی کم عمری سے ہی شاعری کی طرف مائل ہو گئے تھے وہ پہلے دہلوی اور بعد میں لکھنوی رنگ میں رنگے بعدۂ یاسیات کے امام کہلائے۔ کلام میں سوز و گداز، یاس و محرومی، کسک، صداقت جذبات اور بے چارگی پائی جاتی ہے:

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میّت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

دیوان فانی، وجدانیات فانی، باقیات فانی، عرفانیات فانی اور کلیات فانی وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔

ضلع مرادآباد بھی علم و ادب کی بستی رہی ہے۔ ’علی سکندر جگر مرادآبادی‘ کی پیدائش مرادآباد میں 1890 میں ہوئی۔ شاعری ان کو وراثت میں ملی تھی۔ جگر، داغ کے شاگرد تھے۔ لیکن جب اصغر گونڈوی کے قریب آئے تو انھی کا رنگ غالب آ گیا۔ وہ ’شہنشاہ غزل‘ بھی کہلائے۔ ان کا شعر پڑھنے کا انداز اتنا دلکش تھا کہ محفل پر چھا جاتے تھے۔ ’شعلہ طور‘، ’آتش گل‘ اور ’داغ جگر‘ ان کے شعری مجموعے ہیں۔ کلام میں برجستگی، شوخی، رنگینی، بیخودی، محاورات، تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال ملتا ہے:

بجھا نہ آتش پنہاں کرم کے چھینٹوں سے
دل و جگر کو مجسم گداز رہنے دے

خطہ روہیلکھنڈ میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، شاد عارفی، عرفان صدیقی، مصور سبزواری، قمر مرادآبادی، شکیل بدایونی، جگر بریلوی، حفیظ میرٹھی (کرتپور) وغیرہ کے نام غزل کے حوالے سے معتبر ہیں۔

روہیلکھنڈ کی ادبی روایت میں ’نظم نگاری‘ کے میدان میں بھی کئی اہم نام ملتے ہیں۔ ان میں محمود اسرائیلی اور سرور جہاں آبادی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ’محمود اسرائیلی‘ سنبھل میں 1889 میں پیدا ہوئے۔ وہ نہایت زود گو، خوش فکر اور کہنہ مشق شاعر کے طور پر مقبول تھے۔ انھوں نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن نظم ان کا خاص میدان رہا۔ انھوں نے اخلاقی، اصلاحی، مذہبی، وطنی اور قومی موضوعات پر لاتعداد نظمیں لکھی ہیں۔ پیغام عندلیب، فردوس خیال، خیاباں، انوار دانش، پیغام اسلام اور ملک وملّت ان کے مجموعۂ کلام ہیں:

شکوہ یار سے کچھ دل کو سکوں ہوتا ہے
عشق میں یہ بھی اک اندازِ جنوں ہوتا ہے

> مختلف زمانوں میں میر تقی میر، مرزا غالب، داغ دھلوی جیسے قادر کلام شعرا نے خطہ روھیلکھنڈ میں قیام کیا اور یھاں ان کے بھت سے شاگرد بھی رھے۔ نامور شعرا کی موجودگی سے خطہ روھیلکھنڈ میں صنف غزل پر بڑا نکھار آیا۔ روھیلکھنڈ میں غزل گوئی کا معتبر نام ’قائم چاندپوری‘ کا ھے۔ جوکہ خواجہ میر درد اور مرزا محمد رفیع سودا کے شاگرد تھے۔ وہ 1722/1726 [1] میں پیدا ھوئے۔ قائم چاندپوری نے دھلی میں رہ کر شعر و سخن کا آغاز کیا لیکن بعد میں رام پور آگئے تھے۔ وہ لکھنؤ بھی گئے لیکن واپس رامپور ھی لوٹے اور یھیں مقبرہ محمد یار خاں کے قریب دفن ھیں۔ قائم چاندپوری کے کلام میں دلکشی، سوزوگداز اور جاذبیت ھے۔

’سرور جہاں آبادی‘ 1873 میں پیلی بھیت ضلع کے جہاں آباد میں پیدا ہوئے۔ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے محض 23 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ’خمخانۂ سرور، جام سرور‘ ان کی تصانیف ہیں۔ ان کا کلام نیچرل، سادہ، پرجوش اور رنگین ہے۔ منظر اور واقعات نگاری کے ساتھ کلام میں سوز و گداز بھی ہے۔ اپنے عہد کے ممتاز نظم گو شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں:

’آ مل کے ساتھ کھیلیں، ہم تم ہلال دونوں‘ مشہور نظم ہے۔

’قصیدہ نگاری‘ کی بھی روہیلکھنڈ خطہ میں اہم روایت رہی ہے۔ اسی علاقہ میں مصحفی، امیر بریلوی، بیخود بدایونی، شیخ علی بخش، جوہر بجنوری، رضا رامپوری، سیماب رامپوری، عیش بدایونی، شیخ ظہور بدایونی، صبا سہسوانی، جوہر وسید سرسوی وغیرہ (75) سے بھی زائد قصیدہ نگاروں کے نام علی جواد زیدی نے ’قصیدہ نگاران اتر پردیش‘ میں ذکر کیا ہے۔ شمالی ہند میں لکھنؤ قصیدہ نگاری کا بڑا مرکز بن کر ابھرا تھا۔ روہیلکھنڈ میں بدایوں، رامپور وغیرہ میں قصیدہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔ روہیلکھنڈ میں مصحفی ایسے اہم قصیدہ نگار ہیں جنھوں نے 80 قصیدے لکھے(7) جبکہ جوہر شاہجہاں پوری نے سیکڑوں کی تعداد میں قصیدے لکھے(8)

’غلام ہمدانی مصحفی‘ نے جو 80 قصیدے لکھے ان میں سے بیشتر نوابین، امرا اور شاہزادوں کی شان میں ہیں۔ کچھ نعتیہ و منقبتی قصیدے بھی ملتے ہیں۔ ان کے کچھ قصائد سودا اور انشا کے قصائد کے جوابی قصائد ہیں۔

مصحفی محض بڑی تعداد میں قصیدے لکھنے کی وجہ سے ہی مشہور نہیں ہوئے بلکہ کیفیت کے اعتبار سے بھی ان کی خاص جگہ محفوظ ہے۔ مشکل زمینوں، بھاری بھرکم الفاظ، عمدہ فارسی تراکیب ان کے قصائد کی خاصیت ہیں:

حنا سے ہے یہ تری سرخ اے انگار انگشت
کہ ہو نہ پنجۂ مرجاں کی زینہا انگشت
شمار داغ سے کب اتنی مجھ کو فرصت ہے
کہ رکھ سکوں بسر چشم اشکبار انگشت (9)

’پنڈت ہست لال سنبھلی بیخود‘ (حیات 1248) کی مثنویوں اور قصیدوں کا نادر قلمی مجموعہ مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ میں محفوظ ہے۔ اس میں کئی اچھے قصیدے شامل ہیں:

کیا جانے مجھ سے کس نے کہا یہ پکار آج
چل دیکھ ہو رہی ہے چمن میں بہار آج
ہر شاخ گل پہ مرغ چمن کا ہے چہچہا
باندھی ہے ڈالیوں پہ ہر اک نے قطار آج (10)

ناسخ کے شاگرد محمد حسن علی خاں جوش بریلوی نے قصیدے کی طرف توجہ مرکوز کی۔ ان کا کلام ’دیوان جوش‘ کے عنوان سے شائع ہوا:

سر دیواں میں لکھتا ہوں قصیدہ نعت احمد کا
وسیلہ حشر کے دیواں میں ہو تحصیل مقصد کا
فرشتوں کو ہوا اس رو سے حکم سجدۂ آدم
کہ پیشانی پہ ان کی جوہ گر تھا نور احمد کا (11)

امروہہ میں ’حسین اصغر جون امروہوی‘ جو کہ رئیس امروہوی کے بھائی تھے نے بڑی تعداد میں قصیدے کہے ہیں۔ محض 15 برس کی عمر میں انھوں نے جو قصیدہ کہا تھا وہ اتنا عمدہ تھا کہ بقول علی جواد زیدی سنانے پر چھتیں اڑ گئی

تھیں(14)۔ وہ پاکستان جا کر وہیں بس گئے تھے :

تم کو جو ڈھونڈنا ہو آپ سے پوچھ لیں گے ہم
ہم سے خلش سے غم سے نوا نوا سے تم

'ذکی مرادآبادی' کے رامپور اور لکھنؤ میں قیام کے دوران علما فضلا سے صحبتیں رہیں اور مختلف ہنرمندوں سے فیض حاصل کیا۔ ذکی مرادآبادی نئے مضامین اور صنعتوں کے استعمال پر قدورت کے ساتھ قصیدے کہتے تھے۔ انھوں نے غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کی مدح سرائی کچھ یوں کی:

اس قدر رنگ طبیعت کے اثر سے ہے عیاں
کہ زمانہ نظر آتا ہے مجھے رنگ محل
چرخِ اخضر کو کیا عکسِ شفق نے گل رنگ
قصر یاقوت بنا گنبد فیروزہ محل

ان کے علاوہ سید سرسوی، جوہر سرسوی، دبیر پرساد سحر بدایونی، حشمت علی خاں رامپوری، نظام رامپوری وغیرہ کے نام بھی روہیلکھنڈ میں قصیدہ نگاری کے تعلق سے اہم مانے گئے ہیں۔ سہسوان بدایوں کے 'سید اعجاز احمد معجز سہسوانی' بھی قصیدوں کے استاد شعرا میں سے تھے۔ ان کا مکمل 'دیوان قصائد' جن میں نعتیہ و منقبتی قصائد شامل ہیں۔ شائع ہوا تھا:

دیدہ ور گردش افلاک کے جوہر دیکھیں
خرمن گل کی جگہ خار کا منظر دیکھیں
رنگ نیرنگیٔ دوراں ہو نظر میں روشن
زخم گل داغِ دلِ لالہ احمر دیکھیں (12)

'غفلت احمد خاں رامپوری' کا بھی قصائد اور مثنوی کا دیوان مرتب ہوا تھا جس میں انھوں نے مدح اور قدح دونوں ہی میدانوں میں طبع آزمائی کی۔ امیر مینائی نے ان کے دیوان سے تیرہ مدحیہ اور منقبتی قصائد کے انتخابات شامل کئے ہیں:

زمانہ رنگ بدلتا ہے کیا عجب ہے اگر
کبھے سمن ہو کبھے گل گہ ارغواں نرگس
کہے نہ عیب و ہنر تاکہ اہل ہستی کا
عدم میں اس لیے چھوڑ آتی ہے زباں نرگس

روہیلکھنڈ میں خاتون قصیدہ نگار طاہرہ بیگم کا بھی ذکر ملتا ہے، جنھوں نے رامپور میں رہ کر قصیدے اور سلام کہے ہیں۔ ناظم پریس رامپور سے ان کے مجموعہ قصائد 'گوہر کعبہ' کے عنوان سے شائع کیے گئے ہیں۔ اس میں 27 قصائد شامل تھے(13)۔

ابتدائے روہیلکھنڈ سے ہی خطہ میں لوک گیتوں کی روایت پائی جاتی ہے۔ شادی بیاہ، تہواروں وغیرہ پر گائے جانے والے گیتوں اور نوجوانوں میں وصال و ہجر، بوڑھوں میں مذہبی گیت، ساون اور برہا کے گیتوں کو لوک گیتوں کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ دیہی علاقوں میں جہاں کھڑی بولی کا رواج ہے اور ہندو فلسفہ کی چھاپ یہاں کے لوک گیتوں میں نظر آتی ہے جبکہ شہری علاقوں میں لوک گیتوں پر مسلم کلچر کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ روہیلکھنڈ علاقہ میں غدر اور جنگِ آزادی کے واقعات کو بھی لوک گیتوں میں ڈھالا گیا ہے انھیں 'ساکھا' کہتے ہیں۔ روہیلکھنڈ میں بہت بڑی تعداد میں ساکھے کہے گئے ہیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ آزادی سے قبل کے ساکھے اب نہیں ملتے ہیں۔

رامپور رضا لائبریری اور صولت پبلک لائبریری میں 'جنگ نجو خانی' کے تین جنگ نامے عوامی زبان میں مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں۔ ان جنگ ناموں کے مصنف آصف الدولہ کے معاصر ہیں(14)۔ روہیلہ سردار مصطفیٰ خاں عرف نجو خاں کی انگریزوں سے موضع بھٹورہ کے قریب 24 اکتوبر 1794 میں ہوئی جنگ کا بیان مولوی غلام جیلانی رفعت نے کچھ اس طرح کیا ہے:

یہ کرسی نشینیاں چناں تیغ راند
کہ حرف شجاعت پہ کرسی نشاند

جنگ نجو خانی کے ساکھے میں ایک برہی کا ساکھا بھی بہت مشہور ہے۔

نجو خاں کا ساکھا کہتا سرن جاؤں میں تیرے
سہرام پور عجب دوانہ اس میں بسے روہیلے (15)

اس کے علاوہ 'جنگ نامہ تسلیم نگری' کا پانچ سو(500) اشعار والا ساکھا بھی خاصا مشہور ہے:

محمد علی تھا جو نائب مرا
غلامی نے مارا اسے دو سزا
چڑھا ہم کو غصہ اسی بات پر
ہمارے لکھے پر بھی مارا اسے

دراصل محمد علی خاں کو نہ مارنے کی ہدایت نواب آصف الدولہ نے غلام محمد خاں کو دی تھی لیکن اس نے محمد علی خاں کو قتل کر دیا تھا۔ اسی پر یہ ساکھا لکھا گیا ہے۔

روہیلوں کی کٹھیر میں جمعیت کے ساتھ ہی یہاں کی زبان میں عربی، فارسی اور پشتو کے الفاظ داخل ہو گئے تھے جنھوں نے روہیلکھنڈ کی زبان کو مخصوص طرز ادا کر دی تھی۔ روہیلوں کی آمد سے عوامی ادب میں چہار بیت کی مشہور صنف بھی آئی۔ شروع میں دف پر چہار بیت پشتو میں گائے جاتے تھے۔ بعد میں اس میں مقامی زبانیں بھی شامل ہو گئیں۔ سب سے قدیم چہار بیت عنبر شاہ خاں عنبر کا ملتا ہے:

دل جو لگایا یار کی زلفِ گرہ گیر سے
پھر نہ چھٹا ایک شب حلقہ زنجیر سے
دل ہی مرا ہمدمو! سینے میں ہر دم نگار
دلبر خوں ریز کے خنجر و شمشیر سے (16)

رامپور میں 'عبدو کا چار بیت' بھی خاصا مقبول تھا اس میں نواب محمد علی خاں کے قتل کا واقعہ بیان کیا گیا ہے(17)۔

خطہ روہیلکھنڈ نعتیہ کلام کے لیے بھی جانا گیا ہے۔ مولانا احمد رضا خاں، حسن رضا بریلوی، ضیا القادری بدایونی، اثر رامپوری وغیرہ نے نعت گوئی کے فن میں طبع آزمائی کی۔ اسیر بدایونی کے شاگرد ضیا القادری بدایونی کے دیارِ نبیؐ، مرقع شہادت، نغمہ ربانی وغیرہ مجموعے شائع ہوئے ہیں:

اے خدا اے مالک کل کائنات
اے کریم والے رحیم و حق صفات
خالق و قیوم تیری ذات ہے
روشنی ہر جا تری دن رات ہے

روہیلکھنڈ میں طنز و مزاح میں بھی شعرا نے اپنے جوہر دکھلائے ہیں۔ سنبھل کے اعجاز وارثی نے (مجموعہ پیش دستی) کے ذریعہ اپنا لوہا منوایا۔ جبکہ روشن بدایونی (خورشید روشن اور گلِ عشق) کے ذریعہ مثنوی کی روایت کو روہیلکھنڈ میں زندہ کیا۔ ان کے علاوہ رئیس امروہوی نے 'لالہ صحرا' اور 'حسین اور حسنیت' مثنویوں کے ذریعہ روہیلکھنڈ میں مثنوی کی صنف کو تقویت دی۔

روہیلکھنڈ میں مرثیہ نگاری کی روایت کافی پرانی ہے۔ اسماعیل امروہوی خطہ روہیلکھنڈ کے پہلے مرثیہ نگار ہیں(18)۔ مثنوی کی فارم میں 'وفات نامہ بی بی فاطمہؓ' قدیم شعرا کے درمیان نمایاں مقام رکھتی ہے۔ یہ مرثیہ شمالی ہند کا بھی پہلا مرثیہ ہے۔(19)

اسماعیل امروہوی کے بعد روہیلکھنڈ کے دوسرے مرثیہ گو شاعر سعادت امروہوی ہیں۔ ان کی ولادت 1698 میں ہوئی تھی۔ میر تقی میر نے سعادت کے کہنے پر ہی ریختہ میں شاعری شروع کی تھی۔ اسی دور میں قائم چاندپوری، زائر بریلوی، میر بدایونی، حسرت بریلوی، حرمت رامپوری وغیرہ نے بھی مرثیے کہے۔ لیکن ان کے کلام کے نمونے شاذ و نادر ہیں۔ مصحفی نے بھی امام حسینؓ کی شہادت کو رثائی انداز میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

پہلے تو آبدیدہ ہوئی چشم آفتاب
چاہا یہ صبح نے میں اسے اپنا دوں نقاب
پھر آسماں سے مانگ کے لایا کہیں سحاب
چادر کمبول دلا شہ بے سر کے سامنے (20)

شمیم امروہوی نے 70 سے زاید مرثیے لکھے ہیں۔ انھیں اردو ادب میں قدر و منزلت حاصل ہے۔ ان کے کلام کو لکھنؤ کے لوگ انیس کے مرثیوں کا گمان کرتے تھے۔ روہیلکھنڈ میں مرثیے کی روایت تقریباً ہر عہد میں موجود رہی ہے۔ بیسویں صدی میں بھی جدید مرثیے کے تعلق سے نسیم امروہوی، مہدی نظمی رامپوری، اور رئیس رامپوری نے کافی نام کمایا۔ نسیم امروہوی نے کثیر تعداد میں مرثیے کہے ہیں:

زور علیؓ انہیں کی شجاعت کا معجزہ
بیٹی بتول سی یہ رسالت کا معجزہ
دختر کے دلبروں سے جو نسلِ نبیؐ چلی
دختر کشی کی رسم نجس پر چھری چلی

مرثیہ نگاری میں ڈاکٹر ناشر نقوی، نسیم الظفر باقری، نظیر باقری، صریر سنبھلی، خمار فاروقی، کیفی سنبھلی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

روہیلکھنڈ میں نثری ادب کی روایت نے بھی اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ تحقیق اور تنقید کے میدان میں اختر انصاری، خلیق احمد نظامی، امتیاز علی عرشی، عبدالرحمٰن بجنوری، عبادت بریلوی، ڈاکٹر عندلیب شادانی اور رشید حسن خاں وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقات سے ادبی دنیا میں ہلچل پیدا کی۔

اختر انصاری بدایوں میں 1909 میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے 'غزل اور غزل کی تعلیم'، 'حالی اور نیا تنقیدی شعور'، 'مطالعہ تنقید' نام سے کتابیں لکھیں۔ خلیق احمد نظامی 1925 میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے مکتوبات رشید احمد صدیقی، سرسید احمد اور علی گڑھ تحریک، تاریخ مشائخ چشت وغیرہ کتابیں لکھیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری کا شمار تنقید کے اعلیٰ نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ 1885 میں قصبہ سیوہارا ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ 'محاسن کلام غالب، باقیات بجنوری، یادگار بجنوری' وغیرہ ان کی اہم تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ جنھوں نے شاعری، افسانہ نگاری اور تحقیق و تنقید سبھی میدانوں میں اپنے جوہر دکھائے۔ عندلیب شادانی 1896 میں سنبھل میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے فارسی ڈپارٹمنٹ میں استاد ہو گئے۔ ان کا مجموعہ کلام 'نشاط رفتہ' ہے۔ انھوں نے 'سچی کہانیاں اور چھوٹا خدا' کے ذریعہ اپنی افسانوی مہارت کو دکھایا۔ بعدہ 'تحقیق کی روشنی میں'، 'دور حاضر اور اردو غزل گوئی' جیسی کتابیں بھی لکھیں۔

روہیلکھنڈ میں فکشن کے میدان میں بھی کئی بڑے نام ذہن میں ابھرتے ہیں۔ پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد 1836 میں نگینہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابن الوقت، مراۃ العروس، بنات النعش وغیرہ ان کے اہم ناول ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم نہٹور ضلع بجنور میں 1888 میں پیدا ہوئے۔ وہ پریم چند سے بھی قبل افسانے لکھنے لگے تھے۔ انھوں نے ترکی زبان سے اردو میں افسانوں کے ترجمے بھی کیے۔ ان کے طبع زاد افسانے بھی اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ 'خیالستان، حکایات و احساسات' (افسانوی مجموعے) بے حد مقبول ہوئے۔ ثالث بالخیر، زہرا، مطلوب حسیناں، آسیب الفت اور سیما خانم وغیرہ ان کی دیگر مقبول کتابیں ہیں۔

روھیلکھنڈ میں فکشن کے میدان میں بھی کئی بڑے نام نھن میں ابھرتے ھیں۔ پھلے نلول نگلر ڈپٹی نذیر احمد 1836 میں نگینہ میں پیدا ھوئے تھے۔ ابن الوقت، مراۃ العروس، بنات النعش وغیرہ ان کے اھم ناول ھیں۔ سجاد حیدر یلدرم نھٹور ضلع بجنور میں 1888 میں پیدا ھوئے۔ وہ پریم چند سے بھی قبل افسانے لکھنے لگے تھے۔ انھوں نے ترکی زبان سے اردو میں افسانوں کے ترجمے بھی کیے۔ ان کے طبع زاد افسانے بھی اردو ادب میں خاص اھمیت رکھتے ھیں۔ 'خیالستان، حکایات و احساسات' (افسانوی مجموعے) بے حد مقبول ھوئے۔

سجاد حیدر سے ٹھیک پہلے مرادآباد میں قاضی عبدالغفار 1885 میں پیدا ہوئے۔ 'مجنوں کی ڈائری، لیلیٰ کے خطوط، تین پیسے کی چھوکری' وغیرہ ان کی مقبول ترین کتابیں ہیں۔ 1898 میں سلطان حیدر جوش بدایوں میں پیدا ہوئے۔ مخصوص دلچسپ اور انفرادی طرزِ نگارش کے سبب وہ بے حد مقبول ہوئے۔ 'صبر کی دیوی، ابن مسلم، نواب فرید، مساوات اور فسانہ جوش' وغیرہ ان کی مقبول تصانیف ہیں۔

فکشن کے نظریے سے کوثر چاندپوری کا مقام روہیلکھنڈ میں اہم مانا جا سکتا ہے۔ وہ 1908 میں چاندپور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ 'دل گداز افسانے، شعلہ رنگ، رات کا سورج، دنیا کی حور، دلچسپ افسانے' وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ انھیں معاشرے کی اصلاح اور راہ نمائی کے لیے بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ نذر سجاد حیدر جو کہ سجاد حیدر یلدرم کی زوجہ ہیں نے 'اختر النسا' ناول لکھ کر تہلکہ مچا دیا تھا۔ 'حرماں نصیب، آہ مظلوماں، نجمہ اور مذہب اور عشق' ان کی دیگر تصانیف ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے نام سے تو سبھی واقف ہیں وہ سجاد حیدر یلدرم کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے بھی ناول اور افسانہ نگاری کے فن پر طبع آزمائی کی اور کئی لازوال تخلیقات وجود میں آئیں۔ 'آگ کا دریا' ان کا معروف ناول ہے۔

خطہ روہیلکھنڈ کی ادبی روایت پر غور کرنے سے یہ بات صاف طور پر محسوس ہوتی ہے کہ علاقہ میں اردو ادب اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ تقریباً ہر صنف میں خطہ روہیلکھنڈ کے شعرا و ادبا نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اس مقالے میں طوالت کے خوف کی وجہ سے بہت سے ادبا اور شعرا کی شخصیت اور ان کی کاوشوں پر تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی جا سکی۔ دراصل روہیلکھنڈ کی ادبی روایت کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے لئے ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔

حواشی

1. سوانحی انسائکلو پیڈیا از ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف (جلد اول) 2007 ص447 2. نظام رامپوری: حیات دشاعری ص24 3. سوانحی انسائکلو پیڈیا از ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف (جلد اول) 2007 ص534 4. خمخانۂ جاوید (جلد دوم) از لالہ سری رام ص554 5. چند ممتاز شعرا سنبھل از ڈاکٹر سعادت علی صدیقی (جلد اول) ص72 6. سوانحی انسائکلو پیڈیا از ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف ص432 7. قصیدہ نگاران اتر پردیش از علی جواد زیدی۔ 8. قصیدہ نگاران اتر پردیش از علی جواد زیدی۔ 9. قصیدہ نگاران اتر پردیش از علی جواد زیدی ص282 10. قصیدہ نگاران اتر پردیش از علی جواد زیدی ص282 11. قصیدہ نگاران اتر پردیش از علی جواد زیدی ص145 12. قصیدہ نگاران اتر پردیش از علی جواد زیدی 1983 13. قصیدہ نگاران اتر پردیش از علی جواد زیدی 1983 14. روہیلکھنڈ کا عوامی رزمیہ از محمود نیازی ص12 15. روہیلکھنڈ کا عوامی رزمیہ از محمود نیازی ص12 16. محمود نیازی کے مطابق دیوان عنبر شاہ خان عنبر رامپور رضاء لائبریری میں موجود ہے 17. 'عبدو کا چار بیت' بھی محمود نیازی کے مطابق رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے (قلمی نسخہ)۔ 18. اردو مرثیہ اور روہیلکھنڈ از ڈاکٹر ناشر نقوی رضا لائبریری جرنل 5-4، 1999، ص367 19. نکات الشعرا میر تقی میر ص27 20. اردو مرثیہ اور روہیلکھنڈ از ڈاکٹر ناشر نقوی رضاء لائبریری جرنل 5-4، 1999، ص371

■

M. Furqan Sambhali, C/o M Captain Irfan, Deepa Sarai Chowk Distt, Sambhal (UP)

کوثر رسول

اقبال

فلسفہ سے مذہب تک

اقبال کو اردو کا پہلا فلسفی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے وہ اس لیے کہ انھوں نے فلسفہ کے راستے سے ہی شاعری میں دخل درانداز ی کی ایک خوبصورت سی جسارت کی ہے یعنی کہ اقبال بنیادی طور پر فلسفی تھے اور شاعری کو انھوں نے اپنے مخصوص نظامِ فکر کی تبلیغ واشاعت کا ذریعہ بنایا، ان کی شاعری میں فکری بلندی، جذبے کی طاقت وطہارت اور تخیل کی نادرہ کاری بہ درجۂ اتم موجود ہے، یہ کہنا مبنی برحقیقت ہوگا کہ اقبال کی شاعری عقل و ذہن کا مسلسل امتحان ہے، جس کا آغاز مابعدالطبعیات کی بھی نہ نظر آنے والی حقیقتوں کی تلاش وجستجو سے ہوتے ہوئے اپنے وجود کی تشکیل ومقصد اور کائنات کی اصل حقیقت تک پہنچنے کی سعی وکوشش پر ختم ہوجاتی ہے۔

افلاطون نے کہا تھا کہ فلسفہ ایک ایسا علم ہے جس کی ابتدا بھی حیرت سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا بھی حیرت ہی ہے۔ علم فلسفہ کی ابتدا 'وجود' کی بحث سے ہوتی ہے یعنی کہ ازل سے کس چیز کا وجود تھا اگر کچھ ہے تو اس کے ہونے کا کیا مطلب ہے؟ کیا 'وجود' کا وجود کی حیثیت سے علم ہوسکتا ہے؟ کیا جود کی ماہیت علم کی رسائی سے پرے ایک رازِ سربستہ ہے؟ چنانچہ علم منطق کے اعتبار سے ان تمام سوالات کو سمجھنا اور پھر ان کا جواب دینا بہت ہی مشکل ہے۔ چنانچہ ایک فلسفی عموماً اپنی پیدائش اور اپنی اصل (ماخذ) پر متحد ہوتا ہے، اس کے بعد وہ اپنے اطراف کی دنیا پر غور وفکر کرتا ہے، اس کائنات میں شامل بڑی طاقتوں (آفتاب، چاند، ستارے وغیرہ) گردش ایام پر اقبال اپنی نظم فلسفہ و مذہب' کی شروعات انھیں بنیادی سوالات سے کرتے ہیں:

یہ آفتاب کیا یہ سپہرِ بریں ہے کیا
سمجھا نہیں تسلسل شام و سحر کو میں
اپنے وطن میں ہوں، کہ غریب الدیار ہوں
ڈرتا ہوں دیکھ دیکھ کے اس دشت و در کو میں

گویا کہ فلسفی اپنے وجود کے ساتھ ساتھ کائنات کے ہر ذرّے پر غور کرتا ہوا اس کی اصل حقیقت تک پہنچنے کی جستجو میں اپنے ذہن کو مشقت سے دوچار کراتے ہوئے اپنی اس بے چینی واضطراب میں مزید اضافے کا باعث بنا رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کوئی اس کی یہ الجھن سلجھائے:

کھلتا نہیں ہے میرے سفرِ زندگی کا راز
لاؤں کہاں سے بندۂ صاحب نظر کو میں

فلسفہ جیسا کہ پتہ ہی ہے کہ اس کا سارا تار و پود 'عقل' ہے اور عقل قائم بالذات نہیں۔ یہ ناقص ہے، محدود ہے، جو محض ایک حد تک چیزوں کی حقیقت تک پہنچ سکتی ہے، خود اپنی ذات تک بھی اس کی رسائی ممکن نہیں پھر بھلا خدائے واحد تک کیسے اور کیونکر پہنچ سکتی ہے اسی لیے اقبال یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں:

لاؤں کہاں سے بندۂ صاحب نظر کو میں؟

یعنی یہ کہ خدائے واحد تک پہنچنے کے لیے کسی صاحبِ نظر کی محبت درکار ہے بقول مولانا رومی:

یک زمانہ محبتِ با اولیا
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اسی طرح ایک عربی مقولہ ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ یعنی جس نے خود کو جان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا، اور خود کو پہنچانے کے لیے محض تعقل ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے 'دل' کی معاونت بھی ضروری ہے اور دل تبھی صحیح معاونت کرسکتا ہے جب وہ تربیت یافتہ ہوگا اور دل کی تربیت بنا صاحب نظر کے ممکن نہیں ہے۔ اس کی مزید وضاحت کے لیے مولانا رومی، کا یہ شعر کافی ہے:

گر تو سنگِ خارہ مرمر شوی
چوں بہ صاحبِ دل رسی گوہر شوی

چنانچہ خود سے خدا تک کے اس پورے سفر میں رہنمائی کرنے والی ذات کسی مرشدِ کامل کی ہی ہوسکتی ہے اور جب ایک انسان خدائے واحد کی ذات کو سمجھنے لگتا ہے تو اس کائنات کے تمام اسرار ورموز بھی اس کے سامنے بے نقاب ہوجاتے ہیں، اسی لیے اقبال اپنی نظم 'فلسفہ' میں اس چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فلسفی پر مردِ قلندر کو فوقیت دیتے ہیں:

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں مردِ قلندر کی نظر سے
معلوم ہیں مجھ کو تیرے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے

یعنی فلسفی ہونے کے ناطے خود اقبال بھی اسی راہ گزر سے گزرے ہیں، جہاں ان کے لیے یہ طے کرپانا مشکل تھا کہ کس فلسفی کے نظریے کو صحیح مانے اور کس کے نظریے سے اختلاف کرے، چنانچہ اقبال بڑی حد تک نطشے سے متاثر رہے ہیں۔ جس نے انسان کی آرزو کو اتنی اہمیت دی کہ اس تک پہنچنے کی جدوجہد کو وہ زندگی کی حرارت سے تعبیر کرتا ہے، نطشے کی اس آرزو سے اقبال نے خودی کے فلسفے کی کسی حد تک بنیاد تیار کی کہ انھوں نے بھی انسان کی خودی کی اہمیت کو اتنا آگے تک بڑھا دیا کہ خدا اس سے اس کی مرضی پوچھنے کے لیے مجبور ہوجاتا ہے، مگر نطشے اور اقبال میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نطشے نے (نعوذباللہ) خدا کی موت کا اعلان کردیا، اس لیے اس کے یہاں زندگی کی حرارت کے باوجود قہاریت ہے، لیکن اقبال نے اپنے فلسفے کو مذہب کی عینک سے دیکھنے کی کوشش کی، اسی لیے ان کو مرشد روحانی کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ اقبال عام فلسفیوں کے برعکس 'عقل' پر 'دل' کو مقدم سمجھتے ہیں:

وہ پرانے تار جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انھیں بے سوزن و تارِ رفو

مگر 'دل' کی تب تک کوئی اہمیت نہیں جب تک کہ اس کی تربیت نہ کی جائے کیونکہ 'دل' متعدد خواہشات و آرزوؤں کی آماجگاہ ہے اور اکثر خواہشات مادیت پر مبنی ہوتی ہیں، اسی لیے دل کی تربیت ضروری ہے، دل کو مذہبی اصطلاح میں نفس بھی کہا گیا ہے۔ یعنی کہ نفس کی تربیت شرعی وصوفیانہ نقطۂ نظر میں بنیادی درس ہے، جس کو دینے والی ذات کسی عالم یا صوفی (مرشد) کی ہوتی ہے، گویا کہ علم کی بنا محض 'عقل' نہیں ٹھہرتی، عقل معلومات کو ہی علم گردانتی ہے جب کہ اصل علم تک رسائی دل کے راستے سے ممکن ہے، جس کے لیے مرشد کی نگاہ کافی ہے بقول اقبال:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

مگر اس نظر کو پہچاننے میں اقبال کو بھی بہت عرصہ لگا، انھیں بھی خوب تلاش وجستجو کرنا پڑی جیسا کہ 'فلسفہ و مذہب' کے آخری شعر میں وہ اشارہ کرتے ہیں:

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

چنانچہ جب اقبال نے اپنے اس راہبر کو پہچان لیا، تب ان کے فلسفے کو نئی راہ مل گئی، اقبال کا یہ فلسفہ مذہب سے مستنبط ہے، جس میں ان کی رہنمائی ان کے مرشدِ روحانی جناب مولانا رومی نے کی جس کا اعتراف اقبال ان الفاظ میں کرتے ہیں:

کہتا ہے مگر فلسفۂ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا ہے مرشدِ کامل نے راز فاش
باہر کمال اند کے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدہٗ بے جنوں مباش

یعنی کہ اگر عقلِ کل بھی ہوگی تب بھی اس کائنات کی گتھی کو نہیں سلجھایا جاسکتا ہے حتی کہ اس میں تربیت یافتہ دل کی کارگزاریاں شامل نہ ہوں اور دل کی اس تربیت کے لیے مرشدِ کامل کی اک نگاہ کافی ہے، اسی لیے اقبال اپنی ایک نظم 'موتی' میں کہتے ہیں:

تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا
میری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا
تخیلات کی دنیا غریب ہے لیکن
غریب تر ہے حیات و ممات کی دنیا
عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تیری
بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا

چنانچہ اقبال کا اس نظرِ التفات کے لیے اصرار و انکسار، ان کی متعدد نظموں اور غزلوں میں دکھائی دیتا ہے، مولانا رومی سے تعلق پیدا ہونے سے پہلے ان کی زندگی میں کس قدر اضطراب و بے چینی اور انتشار تھا، اس کی بابت وہ اپنی نظم رومی میں مختصراً یوں انکشاف کرتے ہیں:

غلط نگر ہے تیری چشمِ نیم باز اب تک
تیرا وجود تیرے واسطے ہے راز اب تک
تیرا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک
کہ ہے قیام سے خالی تیری نماز اب تک
گستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک
کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک

یعنی کہ اقبال اپنے گزشتہ تمام افکار ونظریات کو خام اور ناقص سمجھتے ہوئے مولانا رومی سے روحانی تعلق پیدا کررہے ہیں اور ان کی تقلید کرتے ہوئے اپنے وجود کے راز سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اپنی زندگی کے مقصد اور اپنی عاقبت کی فکر کرتے ہیں یعنی:

خرومندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

اس نوعیت کا ایک شعر 'فلسفہ و مذہب' میں بھی ہے:

حیراں ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں!
رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں؟

یعنی کہ اپنے وجود کی اصل پر فکر مند ہونا یا متحیر ہونا فلسفی کا کام ہے اور خالص فلسفہ کے بارے میں اقبال کی رائے کچھ یوں ہے:

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

چنانچہ اقبال کا فلسفہ محض تعقل و تفکر تک ہی محدود نہیں ہے اس میں وہ قلب ونظر کو بھی شامل کرتے ہیں کیونکہ ان کی نظر میں خدائے واحد تک پہنچنے کا علم ایک بحرِ بے کراں ہے، جس میں ایک سالک غواص کی مانند کود پڑتا ہے اور یہ غواص صرف عقل کے دم پر گہر تک نہیں پہنچا بلکہ اپنے خونِ جگر کو بھی اس تلاش وجستجو میں شامل کرتا ہے جیسا کہ اقبال کہتے ہیں:

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

اور خدائے واحد تک پہنچنے کا یہ دریا صرف علم سے ہی مشروط نہیں ہے بلکہ علم سے زیادہ اس کا تعلق عشق سے ہے چنانچہ یہ غواصِ عشق کے اس دریا میں ہمیشہ غوطہ زن رہتا ہے، اس لیے اقبال کے منہ سے بے ساختہ اس کے حق میں دعا نکلتی ہے:

غواصِ محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی [1]

حقیقت میں بھی غواصِ محبت (صوفی، سچا عاشق) کا معاون خود اللہ کی ذات ہوتی ہے۔ چونکہ صوفی کا نہ دل مردہ ہوتا ہے اور نہ عقل پریشان رہتی ہے، صوفی ہوئی و ہوس سے آزاد خلق سے منقطع اور حق سے منسلک ہوتا ہے وہ توصبغۃ اللہ میں تبدیل ہوچکا ہوتا ہے۔ اس لیے خدا بھی اس کو تمام چیزوں پر ترجیح دیتے ہوئے اس پر کائنات کے بہت سے اسرار ورموز منکشف کردیتا ہے جو عام انسان کی نظر سے پوشیدہ اور عقل سے ماورا ہوتے ہیں، کیونکہ عام انسان کا علم محض محسوسات تک ہی محدود ہے اسی لیے بقول اقبال شیشۂ عقائد پاش پاش ہوچکا ہے۔

> اقبال کے یہاں مذہب کے بارے میں ایک منضبط و مکمل نظریہ کارفرما رہا ہے، جو انسان کا بقول اقبال سب سے بڑا محافظ و معاون ہے، جو اس کی اخلاقی زندگی کا پاسدار بھی ہے۔ چنانچہ 'اخلاق' فلسفے کا ایک اہم دبستانِ فکر ہے اور اخلاق ہی وہ کڑی ہے جو فلسفے کو مذہب سے جوڑے رکھتا ہے اور جو انسان کی زندگی کی تہذیب کرکے اس کو مذہبی ارکان کی ادائیگی کا اہل بناتا ہے، چنانچہ فلسفہ، اخلاق اور مذہب ان تمام شعبہ جات کو ایک دوسرے سے مربوط رکھنے کے لیے اقبال کی نظر میں جو قوت سب سے زیادہ فعال و متحرک ہوسکتی ہے وہ جذبہ عشق ہے جو ان کی نظر میں ازلی و ابدی ہے

یوں تو اقبال کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ وہ تصوف کے خلاف ہیں، مگر حقائق کچھ اور ہی دلیل پیش کرتے ہیں، دراصل اقبال اس تصوف کے خلاف ہیں جو انسان کو دنیا ترک کرنے گوشہ نشینی اختیار کرنے پر اکساتا ہے اور اقبال اس نظریہ کے بھی حق میں نہیں ہیں، جو انسان کو اپنے اندر کی خودی کو نیست کرنے کا مشورہ دیتا ہے کیونکہ اقبال ایسے شخص تھے جنھوں نے عقل وخرد کو تحلیلی ومنطقی فکر کے معنی میں استعمال کیا ہے، جس میں ان کا جذبۂ عشق ایک قوت یا محرکہ کی شکل میں ابھر کر ان سے ایک ایسے نظریہ کی بنیاد رکھواتا ہے جو شریعت وطریقت دونوں کے امتزاج سے عبارت ہے، اور اقبال بنیادی طور پر مذہب سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے جس کا اندازہ ان کی نظم بہ عنوان مذہب سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اسی طرح 'جوابِ شکوہ' میں ایک جگہ کہتے ہیں:

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

گویا کہ اقبال کے یہاں مذہب کے بارے میں ایک منضبط ومکمل نظریہ کارفرما رہا ہے، جو انسان کا بقول اقبال سب سے بڑا محافظ ومعاون ہے، جو اس کی اخلاقی زندگی کا پاسدار بھی ہے۔ چنانچہ 'اخلاق' فلسفے کا ایک اہم دبستانِ فکر ہے اور اخلاق ہی وہ کڑی ہے جو فلسفے کو مذہب سے جوڑے رکھتا ہے اور جو انسان کی زندگی کی تہذیب کرکے اس کو مذہبی ارکان کی ادائیگی کا اہل بناتا ہے، چنانچہ فلسفہ، اخلاق اور مذہب ان تمام شعبہ جات کو ایک

1 اقبال کے یہاں عشقِ حقیقی کارفرما ہے اور عشقِ حقیقی سے مراد حضور پاکؐ کی محبت ہے۔ اقبال کے یہاں عشق کا تصور ابدی ہے یعنی انسان کی وجہ تخلیق عشق ہے، اسی نے ہست وبود کے گرداب سے زندگی کو باہر کھینچ نکالا، اس لیے کہ خالقِ کائنات کی یہی مرضی تھی۔

2 قرآنی اصطلاح میں اللہ کے رنگ میں رنگ جانا

دوسرے سے مربوط رکھنے کے لیے اقبال کی نظر میں جو قوت سب سے زیادہ فعال و متحرک ہوسکتی ہے وہ جذبہ عشق ہے جو ان کی نظر میں ازلی وابدی ہے جیسا کہ خلیل جبران نے بھی کہا ہے:

''ابدیت کسی بھی چیز کو دوام نہیں بخشتی، ہر چیز کا کھنڈر ہوتا یعنی ہے سوائے محبت (عشق) کے۔''

چنانچہ اقبال کے نظریۂ مذہب کی اساس یہی قوتِ عشق ہے:

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسم محمد سے اجالا کردے

مگر عشق کی اس وادی میں وہ تنِ تنہا داخل نہیں ہوتے بلکہ اس مقام پر انھیں روحانی مرشد کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ جب اقبال کا تعلق مولانا رومی سے پیدا ہوگیا تب ان کے اندر کا متجسس و متلاشی فلسفی اک بار پھر متحرک ہوگیا اور انھوں نے بے اختیار اپنے مرشدِ کامل سے استفسار کرنا شروع کیا:

خاک تیرے نور سے روشن بصر
غایتِ آدم خبر ہے یا نظر
کس طرح قابو میں آئے آب و گل
کس طرح بیدار ہو سینے میں دل؟

پہلا سوال اقبال مرشدِ کامل سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا یہ ایک روشن حقیقت ہے جو دنیا کے سامنے ظاہر کی گئی، کیا حضرت آدمؑ کی بعثت دنیا کے لیے محض ایک خبر 1 تھی یا پھر اللہ تعالیٰ اس تخلیق کے پسِ منظر میں دنیا کو کچھ اور دکھانا چاہتے تھے۔ مولانا رومی اس سوال کا یوں جواب دیتے ہیں:

آدمی دید است، باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

یعنی کہ آدمی کی حقیقت یا اہمیت محض اس کی آنکھوں (دیکھنے کی صلاحیت) کی وجہ سے ہے ورنہ اس خاک میں ہڈیوں کے سوا اور کیا ہے اور اس دیکھنے کی اہمیت بھی اسی بنا پر ہے کہ اس سے مراد اپنے معشوق کو دیکھنا ہے جیسا کہ سنت کبیر کا یہ دوہا ہے:

کاگا سب تن کھائیو، چُن چُن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو، پیا ملن کی آس

گویا کہ حضرت آدمؑ کی بعثت اس لیے اہم ہے کہ اللہ پاک کو اپنا معشوق (حضور اکرمؐ) اسی مخلوق سے پیدا کرنا تھے، یعنی کہ اس پوری کائنات کے معرضِ وجود میں آنے کے پیچھے حضور پاکؐ کی بعثت کارفرما تھی، اور پوری دنیا کو آپ کی اہمیت سے باور کرانا تھی، چنانچہ مولانا رومی بھی اسی راز کو سمجھانے کی کوشش کررہے ہیں کہ درحقیقت انسان کے پورے وجود میں محض اس کے قلب ونظر کی اہمیت ہے کیونکہ دل میں حضور پاکؐ کی محبت رہتی ہے اور آنکھوں کو آپؐ کا دیدار مقصود ہوتا ہے۔

اقبال آگے پوچھتے ہیں:

کس طرح قابو میں آئے آب و گل
کس طرح بیدار ہو سینے میں دل

سچی وحقیقی محبت کے لیے ضروری ہے کہ 'دل' کو ہوئیٰ وہوس سے خلاصی دلائی جائے۔ اس لیے اقبال اپنے مرشد کامل سے پوچھتے ہیں کہ دنیاوی چیزوں سے خود کو کیسے بچایا جائے اور کس طرح دل کو بیدار یا بہ الفاظ دیگر دل کی تربیت کیسے ممکن ہے۔

مولانا رومی جواب دیتے ہیں:

بندہ باش و ہرز میں روچوں سمند
چوں جنازہ نے کہ بہ گردن چرند

انسان کو اس زمین پر ایسے زندگی گزارنی چاہیے جیسے اسے ابھی یہاں سے جانا ہے یعنی کہ اسے نہ تو دنیاوی چیزوں کی خواہش کرنی چاہیے اور نہ انھیں حاصل کرنے کی جدوجہد اور اسے یوں رہنا چاہیے جیسے وہ اپنی ہی گردن پر اپنا جنازہ لادے ہوئے ہو، یعنی موت ہر لحہ یاد رہنی چاہیے اور جب وہ موت کو یاد رکھے گا تو 'دل' خود بہ خود ہی اس کے قابو میں رہے گا۔

جوں جوں مولانا رومی کائنات کی اصل حقیقت وعلم کی ماہیت سمجھاتے جاتے ہیں اقبال کا تجسس سوا ہوا ہوتا جاتا ہے اور وہ مزید دریافت کرتے ہیں:

علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ
کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ؟

اگرچہ علم ودانائی کا ماخذ حضور پاکؐ کی محبت ہے تو کوئی کیسے اس تک رسائی حاصل کرسکتا ہے کیسے دل میں وہ اوصاف حمیدہ 2 پیدا ہوتی دراصل سوز و درد و داغ یہ عشق کی تین منزلیں ہیں۔ پہلے دل میں سوز یعنی نرمی وانکسار پیدا ہوتا ہے اور جب ایسا 'دل' واقع ہوتا ہے تب اس میں محبت جیسا زور آور جذبہ ابھر سکتا ہے، یعنی اسی دل میں اللہ و رسولؐ کی محبت پیدا ہوسکتی ہے اور جب یہ درد کسک سے تجاوز کرکے داغ (عشق) میں تبدیل ہوجاتا ہے تب اسی عشق کی سرخوشی عاشق کو مست ومسرور کرکے اس کو خود سے بےخبر کردیتی ہے اور پھر وہ ماسوا سے بےخبر ہوجاتا ہے۔

اقبال کی نظر میں انسان کی اہمیت محض اس کی 'خودی' کی وجہ سے ہے:

گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

اس کے بعد وہ انسان کو عشقِ حقیقی کا درس دیتے ہیں کیونکہ یہی اصل کنجی ہے خدائے واحد تک پہنچنے کی جس کا سفر اپنی ذات یعنی دل سے شروع ہوتا ہے، اور 'دل' اس لیے 'عقل' پر مقدم ہے کیونکہ یہ عشق کا ماخذ ہے اور 'عشق' ایسی قوت ہے کہ جس کی رسائی کائنات کی اصل حقیقت یا بہ الفاظِ دیگر 'حق' تک ممکن ہے۔ بقول اقبال

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا حبشیؓ کو دوام ہے

مختصر یہ کہ اقبال کی شاعری میں 'فلسفہ ومذہب' ایک دوسرے سے مشروط و مربوط ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر علامہ اقبال فلسفی نہ ہوتے تو وہ 'مذہب' کو اتنی گہرائی سے سمجھ نہ پاتے اور نہ وہ شریعت وطریقت کی باریکیوں کو حکیمانہ وفنکارانہ پیرایۂ بیان میں صفحۂ قرطاس پر اتار پاتے۔ اگر اقبال محض شاعر ہوتے، تب ان کا کوئی خاص نصب العین نہ ہوتا، ان کا زندگی اور حیات وکائنات کے بارے میں کوئی مکمل نظریہ نہ ہوتا، ان کی شاعری بھی سابق شعرا کی طرح کئی خانوں میں بٹی ہوئی ہوتی، مگر چونکہ وہ فلسفی شاعر تھے اس لیے، انھوں نے اپنی شاعری کو ایک منضبط وجامع نظریۂ حیات کے تابع مذہب وشریعت کے دوش بدوش آگے لے جاتے ہوئے ایک عالمگیر فکر میں تبدیل کیا ہے، یہ مذہب سے لگاؤ کا ہی نتیجہ ہے کہ اقبال دیگر فلسفیوں کی طرح قنوطیت کے شکار نہیں ہوئے اور نہ ہی انھوں نے ایسا کوئی نظریہ پیش کیا جس کو محض فلسفی کی اپنی ذہنی اختراع پر محمول کیا جائے۔ وہ دیگر فلسفیوں کے برعکس 'دل' کو 'دماغ' پر اس طرح ترجیح دیتے ہیں کہ:

جس معنی پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر ہے

■

Dr. Kausar Rasool, Dept of Urdu, Kashmir University,

1 اقبال کے یہاں 'خبر' اور 'نظر' یہ دونوں اصطلاحیں بارہا استعمال ہوئی ہیں، خبر کے معنی وہ 'عقل' اور 'نظر' کو وہ 'دل' سے موسوم کرتے ہیں۔ چونکہ فلسفہ محض عقل یا خبر تک محدود ہے جب کہ نظر یا دل عشق کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

2 'سوز و درد و داغ' ان کو ہم اوصافِ حمیدہ کہہ سکتے ہیں۔

ظفر انصاری ظفر

مومن
کی
شخصیت اور شاعری

یہ عجب اتفاق ہے کہ ایک طرف مغلوں کی عظیم الشان حکومت اپنی آخری سانسیں گن رہی تھی وہیں دوسری طرف اردو شاعری کا ستارا اس طرح چمک رہا تھا کہ اس سے آسمان ادب درخشندہ وتابندہ تھا۔ عہد میر کے بعد عہد غالب کو اردو شاعری کا عہدِ زریں تصور کیا جانا چاہیے کیوں کہ اس عہد میں اردو کے اہم ترین شعرا دہلی کی ادبی وشعری فضا میں اپنی نکتہ آفرینیوں اور نغمہ سنجیوں سے حرارت پیدا کیے ہوئے تھے جس کی خبر ہندوستان کے دور دراز کے علاقوں تک پہنچ رہی تھی اور جس وجہ سے پورے ہندوستان میں شعر وشاعری کے لیے زمینیں ہموار ہو رہی تھیں۔ حکیم مومن خان مومن اسی عالم میں انتخاب دہلی کی خاک سے اُٹھے تھے اور یہیں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی تھی۔ اُن کے معاصرین میں غالب اور ذوق جیسے عظیم شعرا بھی تھے۔

مومن خاندانی اعتبار سے کشمیری تھے۔ حکیم کامدار خاں اوران کے بھائی حکیم نامدار خاں کو، جو طبابت کے فن میں یکتائے عصر اور نابغۂ زمانہ تھے، اپنے وطن کشمیر میں اپنے فن کی ناقدری کا احساس ہوا تو انھوں نے روزگار کی تلاش میں ہندوستان کے دار السلطنت دہلی کا رُخ کیا۔ دہلی آنے کے بعد ان کی وابستگی شاہ عالم کے دربار سے ہوگئی۔ مومن کے دادا حکیم نامدار خاں شاہ عالم کے زمانے میں شاہی طبیب مقرر کیے گئے۔ ازراہ قدردانی وصلۂ خدمت انھیں مغلیہ حکومت کی جانب سے بارول کا علاقہ جاگیر کے طور پر مرحمت کیا گیا۔ جب برطانوی حکومت نے جھجر کی ریاست کو نواب فیض طلب خاں کے سپرد کیا تو اس میں یہ علاقہ بھی شامل تھا جس کے عوض میں ریاست جھجر کی جانب سے نامدار خاں کو ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا گیا جو اُن کے بعد اُن کے وارثین کو بدستور ملتا رہا۔ اس کا حصہ مومن کو بھی ملا۔ اس کے علاوہ اُن کے خاندان کے چار طبیبوں کو انگریزی سرکار کی جانب سے پینشن مقرر کی گئی تھی جس میں سے ایک چوتھائی اُن کے والدِ گرامی غلام نبی خاں کو بھی ملی اور اُن کے انتقال کے بعد مومن اس کے مستحق ٹھہرے۔

مومن کی پیدائش 1215 ہجری مطابق 1800 کو محلّہ کوچہ چیلان دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے غایت درجے کی عقیدت رکھتے تھے۔ جب مومن کی پیدائش ہوئی تو ان کے والد نے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کی ولادت کی خبر سنائی اور اُن سے مؤدبانہ گزارش کی کہ چل کر نومولود بچے کے کان میں اذان دیں اور اس کا نام بھی تجویز فرمادیں۔ اُن کی درخواست پر شاہ صاحب اُن کے گھر تشریف لے گئے اور نومولود بچے کے کان میں اذان دینے کی رسم پوری کی اور اس کا نام محمد مومن رکھ دیا۔ اگرچہ گھر والوں کے جی میں تھا کہ بچے کا نام حبیب اللہ رکھیں لیکن چوں کہ پورا گھر اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل تھا اس لیے از راہِ ادب لوگوں نے خاموشی اختیار کی اور ان کے تجویز کردہ نام کو ہی منظور کرلیا۔ یہ شاہ صاحب ہی کی دعا کی برکت تھی کہ ان کا رکھا ہوا نام اردو شاعری کے افق پر مہر مبین کی صورت میں جلوہ افروز ہوا۔

جاگیردار گھرانوں کی روایت کے مطابق مومن نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی میں حاصل کی۔ جب ذرا

بڑے ہوئے تو شاہ عبدالقادر دہلوی کے مدرسے میں گئے اور وہاں اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے عربی میں شرحِ مُلّا تک کی تعلیم پائی تھی۔ اُن کی فارسی کی صلاحیت بھی غیر معمولی تھی۔ انھوں نے فارسی کی تعلیم اپنے دور کے مشہور عالم عبداللہ خاں علوی سے پائی تھی۔ اس طرح عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں انھیں کامل دستگاہ حاصل تھی۔

طبابت ان کا خاندانی پیشہ تھا، اس لیے اس کا علم حاصل کرنا اُن کے لیے لازم تھا۔ انھوں نے اس کی تعلیم اپنے والدِ محترم نیز اپنے دو چچا غلام حیدر خاں اور غلام حسین خاں سے حاصل کی تھی۔ اس فن میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے خود لکھا ہے:

حکیم وہ ہوں کہ جاتے رہے حواس اگر
کرے معارضہ سو دفترِ عقول و نفوس

طبیب وہ ہوں کہ ہو سوزِ سینۂ بُلبل
نظارۂ رُخِ گلِ فام سے مجھے محسوس

جو ہوں معالجِ مبطوں تو قابضِ ارواح
کرے دوائے رواجِ طریقِ جالینوس

حکیم مومن خاں مومن علم نجوم کے بھی ماہر تھے۔ آبِ حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ''اس کو اہلِ کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پہنچایا۔ ان کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ احکام سُن سُن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے۔ پھر برس دن تک ستاروں کے مقام اور اُن کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پیش کرتا تو نہ زائچہ کھینچتے نہ تقویم دیکھتے۔''

حکیم مومن خاں مومن کی نجوم دانی کے کئی قصے مشہور ہیں۔ ایک بار اُن کے پاس ایک برہمن آیا اور اُن سے کہا کہ میں لٹ گیا۔ انھوں نے اس کو دیکھتے ہی اس سے کہا کہ تمھارے گھر میں چوری ہوگئی ہے، لیکن وہ زیور تم نے یا تمھاری بیوی نے چُرایا ہے۔ یہ سُن کر وہ شخص حیران ہُوا۔ پھر انھوں نے کہا کہ تم اُسے کہیں رکھ کر بھول گئے ہو۔ لیکن اس نے بتایا کہ اُسے گھر کے چپّے چپّے میں تلاش کرلیا گیا ہے۔ یہ بات سُن کر مومن نے علم نجوم میں مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے اُس کے مکان کا نقشہ اور وہ کمرہ جس کے مچان پر زیور رکھا ہوا تھا بتادیا۔

اس سلسلے میں ایک کڑی اُن کی موت کا واقعہ بھی ہے۔ ایک دن وہ اپنی چھت پر چڑھ کے مکان کی مرمت کرا رہے تھے کہ اچانک ان کے پاؤں پھسل گئے اور وہ زمین پر آگرے۔ اگرچہ اونچائی کچھ زیادہ نہ تھی لیکن قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہوکر ہی رہتا ہے۔ اس وقت انھوں نے کہا کہ ان کا علم یہ کہتا ہے کہ وہ پانچ دن، پانچ ماہ یا پانچ برس میں اس دنیا سے کوچ کر جائیں گے۔ اُن کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ وہ پانچ مہینے میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ مومن نے علم نجوم سے متعلق اپنے کلام میں بھی اشارے کیے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مرے کلام سے ہیں گونہ گونہ فائدہ مند
ادیب و نبض شناس و منجّم و فاصل

کہاں ہے بدر سیما وہ ترحّم
کہ ہوں میں راز دانِ سیرِ انجم

مومن نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں معیاری شاعری کی، لیکن اردو شاعری کی وجہ سے مشہور ومقبول ہوئے۔ شاعری کے دستور وروایت کے مطابق مومن نے شاہ نصیر کو اپنا استاد بنالیا اور اُن کے روبرو زانوئے تلمذ تهه کیا۔ چوں كه مومن غیر معمولی استعداد کے مالك تھے۔ قدرت نے انهیں اپنی طرف سے خاص صلاحیتوں کی نعمت سے سرفراز کیا تھا، یهی وجه هے كه وه اپنی قوت مدركه اور قوتِ متخیله كی بدولت اپنے استاد سے بهت آگے بڑھ گئے۔ اگرچه ابتدا میں انهوں نے اپنے استاد کی بے شبه پیروی کی، لیکن بعد کے زمانے میں اپنی شاعری کے لیے خود نئی راہ نکالی اور نئے اسلوب اور لهجه وآهنگ وضع کیے۔

کروں جو گردشِ انجم کی میں رضا بندی
فدا ہوں وجد میں آکر روانِ بطلیموس

مومن خاں مومن کو شطرنج سے بھی خاصا لگاؤ تھا۔ وہ اس فن کے بھی ماہر تھے۔ اُس وقت پوری دلّی میں ان کے ہم پلہ ایک دو ہی ماہر شطرنج رہے ہوں گے۔ مولانا فضلِ حق بھی شطرنج میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیکن جب ان کا مقابلہ مومن سے ہوتا تو وہ اکثر مات کھا جایا کرتے تھے۔ مومن شطرنج کے ایسے رسیا تھے کہ جب وہ شطرنج کھیلتے تھے تو انھیں اس کے سوا کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ وہ اس میں اس قدر محو ہو جاتے تھے کہ بعض دفعہ کئی ضروری کام کا بھی انھیں خیال نہیں رہتا تھا۔ ان علوم وفنون کے علاوہ رمل، جفر، ریاضی اور موسیقی جیسے علوم وفنون سے بھی شغفِ خاص رکھتے تھے۔

مومن رومانی مزاج اور رنگین فطرت کے حامل تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں پانچ عشق کیے جن کا اظہار اُن کی مثنویوں میں بحسن وخوبی ہوا ہے۔ مومن کی مثنویاں اُن کی داستانِ عشق ہیں۔ علاوہ ازیں اُن کی غزلوں میں بھی ان کی عکاسی ملتی ہے۔

مومن نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی 1823 میں 23 برس کی عمر میں ایک دیہاتی زمیندار کی لڑکی سے ہوئی۔ چونکہ مومن کی طبیعت میں نفاست اور مزاج میں نزاکت تھی، یہی وجہ ہے کہ اس دیہاتی اور غیر مہذب لڑکی سے ان کا نباہ نہ ہوسکا اور علیحدگی کی نوبت آگئی۔ دوست احباب نے دونوں کے درمیان اُنسیت پیدا کرنے کی بھی کوششیں کیں لیکن ان کی یہ کوششیں ناکام رہیں۔ اس کے بعد ان کی دوسری شادی خواجہ میر درد کے خاندان میں ہوئی۔ اُن کے خُسر خواجہ محمد نصیر خواجہ میر درد کے نواسے تھے اور اُن کی خوش دامن خواجہ میر درد کی پوتی تھی۔

مومن کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مسلکی اعتبار سے سخت اور غالی وہابی تھے۔ انھوں نے ابتدائی زمانے ہی میں سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کرلی تھی اور نظری وعملی ہر دو اعتبار سے وہ اُن کی تحریک سے وابستہ بھی تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے دیگر مسالک کے افراد سے اپنا رشتہ استوار رکھا اور تعلقات میں کسی طرح کی کمی کا احساس ہونے نہیں دیا۔

مومن کی وفات 12 مئی 1852 کو ہوئی۔ ان کی ہدایت کے مطابق انھیں دلّی دروازے کے باہر مہندیان میں شاہ عبدالعزیز اور اُن کے خاندان کے مزارات کے احاطے میں دیوار کے نیچے مغرب کی جانب دفن کیا گیا۔ ایک مدت تک ان کا مدفن بے نام ونشان رہا۔ 1943 میں پروفیسر ضیا احمد بدایونی کی تحریک پر پروفیسر سید احمد علی دہلوی نے اُن کے مزار کو پختہ کر کے اس پر کتبہ لکھوایا۔

مومن نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں معیاری شاعری کی، لیکن اردو شاعری کی وجہ سے مشہور ومقبول ہوئے۔ شاعری کے دستور وروایت کے مطابق مومن نے شاہ نصیر کو اپنا استاد بنالیا اور اُن کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ چوں کہ مومن غیر معمولی استعداد کے مالک تھے۔ قدرت نے انھیں اپنی طرف سے خاص صلاحیتوں کی نعمت سے سرفراز کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی قوت مدرکہ اور

قوتِ متخیلہ کی بدولت اپنے استاد سے بہت آگے بڑھ گئے۔ اگرچہ ابتدا میں انھوں نے اپنے استاد کی بے شبہ پیروی کی، لیکن بعد کے زمانے میں اپنی شاعری کے لیے خود نئی راہ نکالی اور نئے اسلوب اور لہجہ و آہنگ وضع کیے۔

مومن کی شعری کائنات مختلف اصناف سے تشکیل پاتی ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور قصیدے بھی، مثنویاں بھی رقم کی ہیں اور قطعات بھی، رباعیاں بھی کہی ہیں اور قطعۂ تاریخ بھی، لیکن جس صنف سخن کی بنا پر انھیں درجۂ اعتبار حاصل ہوا وہ غزل ہے۔ اردو غزل کی تاریخ میں مومن کی حیثیت مسلم ہے اور اُن کے ذکر کے بغیر اردو غزل کی تاریخ پوری نہیں ہوسکتی۔ مومن کی غزل گوئی کا ایک خاص اسلوب ہے اوراس کے بانی وہ خود ہی ہیں۔

عشقیہ رنگ و آہنگ مومن کی غزل گوئی کا طرۂ امتیاز ہے۔ عشقیہ مضامین میں جس قدر تنوع اور رنگارنگی ممکن ہوسکتی ہے، ان کی غزلوں میں موجود ہے۔ اس نکتے کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر سیدہ جعفر فرماتی ہیں کہ ''مومن کے یہاں عاشقانہ زندگی کے متنوع تجربات ملتے ہیں اور اُن کی شاعری میں انسان کی فطرت اور اس کی نفسیاتی کیفیات کے اوراک کا پرتو بھی اکثر جگہ دکھائی دیتا ہے''۔ یعنی مومن کا عشق افلاطونی اور ماروائی عشق نہیں ہے بلکہ اس میں بدن کی خوشبو اور جسم کی آنچ موجود ہے۔ اُن کی غزلوں میں 'پردہ نشیں' کے عشق کا ذکر بار بار آیا ہے۔ یہ اُس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے ان کی غزل کا محبوب شاہد بازاری نہ ہوکر کوئی پردہ نشیں تھا۔ پردہ نشیں سے عشق کے اظہار کو غزل کی چلی آرہی اُس روایت کو بدلنے کی ایک کوشش بھی سمجھنا چاہیے جس میں شاعر امرد کو اپنا محبوب متصور کرتا تھا۔ اشعار دیکھیے:

بس کہ اک پردہ نشیں سے دلِ بیمار لگا
جو مریضوں سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا

جلوہ دکھلا کے تا وہ پردہ نشیں
میں نے دعویٰ کیا تحمّل کا

جو نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا
کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشیں کا دیکھ کر

آفتِ جاں ہے کوئی پردہ نشیں
کہ مرے دل میں آ چھپا ہے عشق

عشق پردہ نشیں میں مرتا ہوں
زندگی پردہ در نہ ہوجائے

عشقیہ کیفیات کے اظہار کی وجہ سے مومن کی غزلوں میں رنگِ تغزل کا تسلط قائم ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مومن رنگِ تغزل کے بادشاہ ہیں۔ اُن کے دیوان میں بہت سی ایسی غزلیں مل جاتی ہیں جن میں از اوّل تا آخر یکساں طور سے تغزل کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مومن کی مشہور غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دمبدم
گلۂ ملامت اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ کہتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ اشعار اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ واردات قلب اور معاملات عشق کی مختلف کیفیات کے اظہار میں مومن کو بلا کی قدرت حاصل ہے۔ وہ واقعات کا نقشہ اس انداز میں کھینچتے ہیں کہ محاکاتی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔

مومن کی شاعری کی ایک انفرادی خصوصیت اُن کی غزلوں میں مکرِ شاعرانہ کی صنعت کا استعمال ہے۔ میں مکر شاعرانہ کے استعمال سے مومن نے ندرت پیدا کی ہے اور بیان میں تنوع: یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے
اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوں گے

غزل ایک نہایت ہی نازک صنف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین نے اُسے 'کارگہہ شیشہ گری' کے کام سے تعبیر کیا ہے۔ فنی نزاکتوں کا خیال رکھنا اس میں اشد ضروری ہوتا ہے۔ مومن ایک باکمال شاعر تھے اور انھیں شاعری کے فن پر مکمل دستگاہ حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں شعری عوامل وعناصر کی کارفرمائی جگہ جگہ پر دکھائی دیتی ہے۔ ان کی غزلوں میں رعایت لفظی کا اہتمام خاص طور سے پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور شاہ نصیر نے ناسخ کی پیروی کرتے ہوئے اپنی غزلوں میں رعایتوں کا استعمال بکثرت کیا ہے، لیکن مومن رعایت لفظی کے استعمال میں نہ شاہ نصیر کی پیروی کرتے ہیں اور نہ ناسخ کی بلکہ اس مرحلے میں بھی وہ مجتہدانہ شان کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اشعار میں رعایتوں کی وجہ سے مشکل پسندی پیدا نہیں ہو پاتی بلکہ ان میں سلاست وروانی پیدا ہوجاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خُدا کو بھول گئے اضطراب میں

ہائے صنم ہائے صنم لب پہ کیوں
خیر ہے مومن تمھیں کیا ہو گیا

مومن اور دیر خُدا خیر کرے
طور بے ڈھب نظر آتے ہیں مجھے

مومن کی شعری خصوصیات کا اعتراف ان کے عہد کے فنکاروں نے بھی کیا ہے۔ غالب نے ان کے شعر:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کو سن کر کہا تھا کہ حکیم صاحب مجھے یہ شعر دے دیجیے اور میرا پورا دیوان لے لیجیے۔ اس سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچ جاتا ہے کہ مومن کی شاعری کو اُن کے عہد ہی میں بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ ان کے بعد کے زمانے میں بھی اُن کی شاعری کا رنگ پھیکا نہیں پڑا اور بعد کے غزل گویوں نے ان کے اسلوب کی پیروی میں غزلیں کہیں جس سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اردو شاعری میں ان کی حیثیت اور عظمت مُسلّم ہے۔

■

Zafrullah Ansari, JNU, New Delhi - 110067

مومن خان مومن

انتخابِ کلامِ مومن

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز! دیکھنا

اُڑتے ہی رنگِ رخ مرا، نظروں سے تھا نہاں
اس مرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس! نزاکتِ آواز دیکھنا

دیکھ اپنا حالِ زار، منجم ہوا رقیب
تھا سازگار، طالعِ ناساز دیکھنا

مت رکھیو گردِ تارکِ عشاق پر قدم
پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا

میری نگاہِ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بے طاقتی پہ سرزنشِ ناز دیکھنا

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے
مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

تاثیر صبر میں، نہ اثر اضطراب میں
بے چارگی سے، جان پڑی، کس عذاب میں؟

بے نالہ منھ سے جھڑتے ہیں، بے گریہ آنکھ سے
اجزائے دل کا حال، نہ پوچھ، اضطراب میں

اتنی کدورت اشک میں؟ حیراں ہوں کیا کہوں؟
دریا میں ہے سراب؟ کہ دریا سراب میں؟

فکرِ مآل سے، مے و شاہد رہے عزیز
پیری میں موت یاد تھی، پیری شباب میں

کھولا جو دفترِ گلہ، اپنا زیاں کیا
گزری شبِ وصال، ستم کے حساب میں

اے حشر! جلد کر تہ و بالا، جہان کو
یوں کچھ نہ ہو، امید تو ہے، انقلاب میں

مومن! یہ عالم اس صنمِ جاں فزا کا ہے
دل لگ گیا جہانِ سراسر خراب میں

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے، انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستم، ناز تو دیکھو

اس بت کے لیے، میں ہوسِ حور سے گزرا
اس عشقِ خوش انجام کا، آغاز تو دیکھو

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا؟ حضرت ناصح!
طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز، تو دیکھو

اربابِ ہوس، ہار کے بھی، جان پہ کھیلے
کم طالعیِ عاشقِ جاں باز، تو دیکھو

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی، اٹھے وہ
بدنامیِ عشاق کا اعزاز، تو دیکھو

محفل میں، تم اغیار کو، دزدیدہ نظر سے
منظور ہے، پنہاں نہ رہے راز، تو دیکھو

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان، ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے، آواز تو دیکھو

جنت میں بھی، مومن نہ ملا، ہائے بتوں سے
جورِ اجلِ تفرقہ پرداز، تو دیکھو

عدم میں رہتے تو شاد رہتے، اسے بھی فکرِ ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا، جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

مگر رقیبوں نے سر اٹھایا، کہ یہ نہ ہوتا، تو بے مروّت!
نظر سے ظاہر حیا نہ ہوتی، حیا سے گردن میں خم نہ ہوتا

وہاں ترقی جمال کو ہے، یہاں محبت ہے روز افزوں
شریک زیبا تھا بوالہوس بھی، جو بے وفائی میں کم نہ ہوتا

غلط کہ صانع کو ہو گوارا، خراشِ انگشت ہائے نازک
جوابِ خط کی امید رکھتے، جو قولِ 'جفّ القلمُ' نہ ہوتا

یہ بے تکلف پھرا رہی ہے، کشش دلِ عاشقاں کی، اس کو
وگرنہ ایسی نزاکتوں پہ، خرامِ ناز اک قدم نہ ہوتا

وصال تو ہے کہاں میسر؟ مگر خیالِ وصال ہی میں
مزے اڑاتے، ہوس نکلتی، جو ساتھ اندازِ رم نہ ہوتا

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا؟
میں الزام اس کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا؟

نہ شادی مرگ ہو کیوں کر ہے مژدہ قتلِ دشمن کا
کہ گھر میں سے لیے شمشیر وہ روتا نکل آیا

کوئی تیر اس کا دل میں رہ گیا تھا کیا؟ کہ آنکھوں سے
ابھی رونے میں اک پیکاں کا ٹکڑا نکل آیا

دمِ بسمل یہ کس کے خوف سے ہم پی گئے آنسو؟
کہ ہر زخمِ بدن سے خون کا دریا نکل آیا

خدنگ یار کے ہمراہ نکلی جان سینے سے
یہی ارمان اک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

بہت نازاں ہے تو اے قیس وحشت پر دکھاؤں گا
کتابوں میں کبھو قصہ جو مومن کا نکل آیا

ناوک انداز، جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے

تابِ نظارہ نہیں، آئنہ کیا دیکھنے دوں؟
اور بن جائیں گے تصویر، جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی؟ کچھ اپنا ٹھکانہ کرلے
ہم تو کل، خوابِ عدم میں، شبِ ہجراں! ہوں گے

ایک ہم ہیں، کہ ہوے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں، کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

منتِ حضرتِ عیسیٰ، نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے؟

داغِ دل نکلیں گے، تربت سے مری، جوں لالہ
یہ وہ اخگر نہیں، جو خاک میں پنہاں ہوں گے

عمر تو ساری کٹی، عشقِ بتاں میں، مومن!
آخری وقت میں، کیا خاک مسلماں ہوں گے؟

○

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

آنکھ نہ لگنے سے شب، احباب نے
آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

مرگئے اس کے لبِ جاں بخش پر
ہم نے، علاج آپ ہی اپنا کیا

بجھ گئی اک آہ میں شمعِ حیات
مجھ کو، دمِ سرد نے ٹھنڈا کیا

غیر، عیادت سے برا مانتے
قتل کیا آن کے، اچھا کیا

ان سے پری وش کو، نہ دیکھے کوئی؟
مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا

زندگیِ ہجر بھی اک موت تھی
مرگ نے کیا کارِ مسیحا کیا

جور کا شکوہ نہ کروں؟ ظلم ہے
راز مرا صبر نے افشا کیا

کچھ بھی بن آتی نہیں، کیا کیجیے؟
اس کے بگڑنے سے کچھ ایسا کیا

سچ ہی سہی آپ کا ایماں ولے
مرگ نے کب وعدۂ فردا کیا

دشمنِ مومن ہی رہے بُت سدا
مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا؟

○

جلتا ہوں ہجرِ شاہد و یادِ شراب میں
شوقِ ثواب نے مجھے ڈالا عذاب میں

چینِ جبیں کو دیکھ کے، دل، بستہ تر ہوا
کیسی کشودِ کار؟ کشادِ نقاب میں

آنکھ اس کی پھر گئی تھی، دل اپنا بھی پھر گیا
یہ اور انقلاب ہوا، انقلاب میں

بدنام میرے گریۂ رسوا سے، ہوچکے
اب عذر کیا رہا؟ نگہِ بے حجاب میں

''دونوں کا ایک حال ہے'' یہ مدعا ہو کاش
وہ ہی خط اس نے بھیج دیا، کیوں؟ جواب میں

تقدیر بھی بری، مری تدبیر بھی بری
بگڑے وہ پرسشِ سببِ اجتناب میں

کیا جلوے یاد آئے؟ کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں، شبِ ماہتاب میں

پیہم سجود، پائے صنم پر، دمِ وداع
مومن! خدا کو بھول گئے؟ اضطراب میں

○

اگر غفلت سے باز آیا، جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے، تو کیا کی؟

ہوئے آغازِ اُلفت میں ہم افسوس
اُسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی

شبِ وصل عدو کیا کیا جلا ہوں
حقیقت کھل گئی روزِ جزا کی

کہا ہے غیر نے تم سے میرا حال
کہے دیتی ہے بے باکی ادا کی

تمھیں شورِ فغاں سے میرے کیا کام
خبر لو اپنی چشمِ سرمہ سا کی

مجھے اے دل تری جلدی نے مارا
نہیں تقصیر اُس دیر آشنا کی

جفا سے تھک گئے، تو بھی نہ پوچھا
کہ تو نے کس توقع پر وفا کی؟

کہا اس بت سے 'مرتا ہوں' تو مومن!
کہا 'میں کیا کروں؟' مرضی خدا کی

○

دل قابلِ محبت جاناں نہیں رہا
وہ ولولہ، وہ جوش، وہ طغیاں نہیں رہا

ٹھنڈا ہے، گرم جوشیِ افسردگی سے جی
کیسا اثر؟ کہ نالہ و افغاں نہیں رہا

کرتے ہیں اپنے زخمِ جگر کو رفو، ہم آپ
کچھ بھی خیالِ جنبشِ مژگاں نہیں رہا

دل سختیوں سے، آئی طبیعت میں نازکی
صبر و تحملِ قلقِ جاں نہیں رہا

غش ہیں، کہ بے دماغ ہیں، گل پیرہن نمط
از بس دماغِ عطرِ گریباں نہیں رہا

آنکھیں نہ بدلیں شوخ نظر، کیوں کہ اب کہ میں
مفتونِ لطفِ نرگسِ فتاں نہیں رہا

ناکامیوں کا گاہ گلہ، گاہ شکر ہے
شوقِ وصال و اندُہِ ہجراں نہیں رہا

بے کاریِ امید سے، فرصت ہے رات دن
وہ کاروبارِ حسرت و حرماں نہیں رہا

بے سیرِ دشت و بادیہ، لگنے لگا ہے جی
اور اُس خراب گھر میں، کہ ویراں نہیں رہا

نیند آگئی فسانۂ گیسو و زلف سے
وہم و گمانِ خوابِ پریشاں نہیں رہا

مومن! یہ لافِ الفتِ تقویٰ ہے کیوں؟ مگر
دلّی میں کوئی دشمنِ ایماں نہیں رہا؟

○

تھی وصل میں بھی فکرِ جدائی تمام شب
وہ آئے بھی تو نیند نہ آئی تمام شب

واں طعنہ تیربار یہاں شکوہ زخم ریز
باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب

رنگیں ہے خون سر سے وہ ہاتھ آج کل رہے
جس ہاتھ میں وہ دستِ حنائی تمام شب

تالو سے یاں زبان سحر تک نہیں لگی
تھا کس کو شغل نغمہ سرائی تمام شب؟

یکبار دیکھتے ہی مجھے غش جو آگیا
بھولے تھے وہ بھی ہوش ربائی تمام شب

مرجاتے کیوں نہ صبح کے ہوتے ہی ہجر میں
تکلیف کیسی کیسی اٹھائی تمام شب

گرمِ جواب شکوۂ جورِ عدو رہا
اُس شعلہ خو نے جان جلائی تمام شب

کہتا ہے مہروش تمھیں کیوں غیر گر نہیں
دن بھر ہمیشہ وصل جدائی تمام شب

دھر پاؤں آستاں پہ کہ اس آرزو میں آہ
کی ہے کسی نے ناصیہ سائی تمام شب

مومن میں اپنے نالوں کے صدقے کہ کہتے ہیں
اُس کو بھی آج نیند نہ آئی تمام شب

○

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو؟
وہی، یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو؟

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر، وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے، وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبہ رو، تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان، شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی، کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو، ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا، وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

○

شب غم فرقت ہمیں کیا مزے دکھلائے تھا
دم رکے تھا سینے میں کم بخت جی گھبرائے تھا

یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا
تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا

بل بے عیاری عدو کے آگے وہ پیاں شکن
وعدۂ وصل آج پھر کرتا تھا اور شرمائے تھا

سن کے میری مرگ بولے مرگیا اچھا ہوا
کیا برا لگتا تھا جس دم سامنے آجائے تھا

بات شب کو اس سے منع بے قراری پر بڑھی
ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا

کوئی دن تو اس پہ کیا تصویر کا عالم رہا
ہر کوئی حیرت کا پتلا دیکھ کر بن جائے تھا

ہوگئی مدو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی
مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

○

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم
تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم

اگر نہ ہاتھ میں اس دلربا کے دل دیتے
تو دل پہ ہاتھ سدا دھر لیا نہ کرتے ہم

اگر نہ دام میں زلف سیہ کے آجاتے
تو یوں خراب و پریشاں پھرا نہ کرتے ہم

اگر نہ لگتی چپ اس بدگماں کی شوخی سے
تو بات بات میں مضطر ہوا نہ کرتے ہم

اس آفتِ دل و جاں پر اگر نہ مرجاتے
تو اپنے مرنے کی ہر دم دعا نہ کرتے ہم

اگر نہ آنکھ تغافل شعار سے لگتی
تو بیٹھے بیٹھے یہ یوں چونک اٹھا نہ کرتے ہم

نہ ہوش کھوتے اگر اس پری کی باتوں پر
تو آپ ہی آپ یہ باتیں کیا نہ کرتے ہم

اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھا جاتا
تو بات بات پہ یوں رو دیا نہ کرتے ہم

نہ لگتی آنکھ تو دن رات سوتے ہی رہتے
کسی کی چاہ نہ کرتے تو کیا نہ کرتے ہم

اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت، آہ
تو ایک ایک کے منھ کو تکا نہ کرتے ہم

جو غم بتوں کا نہ ہوتا تری طرح مومن
تو دیکھ چرخ کو ہے ہے خدا نہ کرتے ہم

○

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج، راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا؟

نارسائی سے دم رُکے تو رُکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر؟
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا

کس کو ہے ذوقِ تلخ کامی لیک
جنگ بن کچھ مزا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرضِ مضطر؟ اے مومن!
صنم آخر، خدا نہیں ہوتا

○

پردے میں ہے رشک ماہ میرا
کیوں کر نہ ہو دن سیاہ میرا

کیا مرنے کے بعد پاؤں پھیلائے
ہے مقبرہ خواب گہ میرا

اس سد سکندری کو توڑدو
آئینہ ہے سنگ راہ میرا

بس آپ میں آؤ تم کہ شاید
ہو دل میں گزار گاہ میرا

میں کشتہ شہید بے دیت ہوں
ہے شوق ستم گواہ میرا

دیکھا تو نے کہ رنگ بدلا
اے شوخ فسوں نگاہ میرا

مرنا نہیں اختیار کی بات
خود جرم ہے عذر خواہ میرا

اے دوستو ہاتھ سے چلا میں
قابو میں نہیں دل آہ میرا

اے چارہ گر اب تو پھینک تبرید
ہے حال بہت تباہ میرا

ناصح انصاف تو ہی کر یار
دل دینے میں کیا گناہ میرا

ماخذ: وکی پیڈیا و مختلف ذرائع

شفیق الرحمٰن

ادارہ

اردو کے طنزیہ مزاحیہ نثری ادب میں شفیق الرحمٰن کو جو مرتبہ حاصل ہے اس تک کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکا ہے۔ وہ اپنے انداز نگارش کے موجد بھی تھے اور منتہی بھی۔ شفیق الرحمٰن کا اصل مرتبہ یہ ہے کہ وہ اردو کے پہلے خالص مزاح نگار تھے۔ ان کی تحریروں میں طنز کہیں آتا بھی ہے تو وہ خاصا ڈھکا چھپا رہتا ہے اور اس کی تلخی پر وہ مزاح کے دبیز پردے ڈالے رہتے ہیں۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ شفیق الرحمٰن کی تحریریں پھلجھڑی کی طرح ہوتی ہیں جو ہر طرف رنگ بکھیر کر بجھ جانے کے بعد بھی آنکھوں میں چمک چھوڑ جاتی ہیں۔

اردو کے بعض نقاد جن میں ڈاکٹر وزیر آغا بھی شامل تھے، شفیق الرحمٰن کی تحریروں کے زیادہ قائل نہیں، اور وہ انھیں محض ایک طرح کا لطیفہ نویس کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن شفیق الرحمٰن کے مزاح کی لطافت اور باریکیوں سے لطف اندوز ہونے والوں کا ایک بڑا حلقہ ہے، جس کی بدولت آج بھی شفیق الرحمٰن کو ایک منفرد مزاح نگار مانا جاتا ہے۔ مشتاق یوسفی جیسے بلند پایہ طنز و مزاح نگار نے بھی ان کی عظمت کو سلام کرتے ہوئے قبول کیا کہ انھوں نے شروع میں شفیق الرحمٰن کے انداز میں لکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

شفیق الرحمٰن نے اردو میں ہلکے پھلکے رومانی افسانوں سے لکھنے کی شروعات کی تھی اور بعد میں مارک ٹوین اور اسٹیفن لی کاک کی طرح قارئین کی تفریح طبع کے لیے ان میں لطیف مزاح کی آمیزش کرنے لگے۔ مغربی مزاحیہ ادب کا اثر ان کی تحریروں میں صاف نظر آتا ہے۔ انھیں شاعری کی بھی گہری سمجھ تھی اور عروض سے واقفیت رکھتے تھے جو گاہ بگاہ لکھی ہوئی ان کی تفریحی نظموں اور غزلیہ اشعار سے بخوبی عیاں ہے۔ نثر میں پیروڈی کی بھی اعلیٰ ترین مثالیں انھوں نے چھوڑی ہیں جن میں، تزک نادری، قصہ حاتم طائی بے تصویر، قصہ چہار درویش، قصہ جہاز باد سندھی اور قصہ پروفیسر علی بابا شامل ہیں۔ لطیف مزاح سے لبریز ان کے رومانی افسانوں کی ایک پوری سیریز مختلف کتابوں میں ملتی ہے۔ اس طرح کے سیریل افسانے لکھنے والے بھی وہ اردو کے پہلے ادیب ہیں۔ ان سیریل افسانوں میں رضیہ، روفی عرف شیطان، حکومت آپا، مقصود گھوڑا، رستم، بڈی، ننھا وغیرہ ان کے دل چسپ کردار ہوا کرتے تھے۔

شفیق الرحمٰن 9 نومبر 1920 کو روہتک کے نزدیک ایک چھوٹے سے قصبے کلانور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے بہاول پور میں پائی۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے انھوں نے 1942 میں ایم بی بی ایس مکمل کیا اور 1952 میں ایڈن برا (انگلینڈ) سے ٹراپکل میڈیسین اور پبلک ہیلتھ میں پوسٹ گریجویشن کی سند حاصل کی۔

لیکن لکھنا انھوں نے طالب علمی کے ابتدائی زمانے میں ہی شروع کر دیا تھا۔ ماہنامہ خیام میں ان کی مزاحیہ کہانیاں چھپا کرتی تھیں۔ ان کی کہانیوں کا پہلا انتخاب 'کرنیں' میڈیکل کالج میں داخلے سے پہلے ہی 1938 میں چھپ گیا تھا۔ اس کے بعد ان کی کتابیں شگوفے، لہریں، مدوجزر، پرواز، حماقتیں، مزید حماقتیں، پچھتاوے، دجلہ (سفرنامہ) انسانی تماشا ('اے ہیومن ٹریجڈی' کا ترجمہ) اور دریچے کے عنوانات سے شائع ہوئیں۔ ان کی تحریریں پڑھ کر بیگم حجاب امتیاز علی نے لکھا تھا، ''وہ اپنی روانی میں بلا تکلف ننھی منی پھلجھڑیاں چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ان کمیاب لوگوں میں سے ہیں جن کی خوش طبعی اپنے اوپر بلا تکلف ہنس سکتی ہے۔'' کچھ اسی طرح کے تاثرات کرشن چندر کے تھے جنھوں نے کہا تھا، ''شفیق الرحمٰن کے افسانے پڑھ کر شوخ رنگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، سرخا سرخ، نارنجی، یاقوتی اور زعفرانی۔''

شفیق الرحمٰن مزاجاً ایک رومانوی افسانہ نگار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مزاح کے ساتھ ساتھ ان کی کتابوں میں رومان کی فضا بھی پائی جاتی تھی۔ ان کو اصل شہرت افسانوں کے دوسرے مجموعے شگوفے سے ملی، جس میں کرداروں کی دل برداشتگی اور پھر بکھرنے کے حوالے سے بڑا جذباتی مگر مقبول اظہار بیان شامل کیا گیا تھا۔ اس مجموعے کے ایک افسانے، ساڑھے چھ میں شفیق الرحمٰن کا وہ کردار شیطان متعارف ہوتا ہے جو بعد میں ان کے افسانوں اور مزاحیہ مضامین کا مستقل کردار بن گیا۔

ان کے افسانوں کے مزید دو مجموعوں مدوجزر اور پچھتاوے میں بھی عمومی اسلوب رومانی ہے، مگر اب کرداروں کے پس منظر میں صرف مناظر فطرت نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ دجلہ ان کا طویل افسانہ ہے، جس سے انھیں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح حماقتیں اور مزید حماقتیں کے مضامین اور افسانوں کو بھی اردو قاری کبھی نہیں بھول سکتے۔ شفیق الرحمٰن نے ریٹائرڈ زندگی کے آخری کئی سال گوشہ نشینی میں گزارے اور 19 مارچ 2000 کو راولپنڈی میں سفر آخرت اختیار کر لیا۔ پس ماندگان میں ان کے تین بیٹے عتیق، خلیق اور امین ہیں۔ شفیق الرحمٰن اگرچہ آج ہمارے بیچ نہیں مگر ان کی شگفتہ تحریریں آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں زندہ ہیں۔

ماخذ: وکی پیڈیا، کرنیں

ریویو

شفیق الرحمٰن

ایک دن ہمارا تعارف ایک ریویو باز حضرت سے کرایا گیا جو ریویو کرنے کے لیے دور دور تک مشہور تھے۔ پوچھیے مت ہمارا کیا حال ہوا اس وقت۔ لیکن ہماری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب وہ صاحب ہفتے بھر میں ہمارے دوست بن گئے۔ وہ سچ مچ ایک نارمل انسان تھے۔ پہلے تو ہم ہچکچاتے رہے۔ آخر ایک دن ہم نے ڈرتے ڈرتے ریویو زنی کا ذکر چھیڑ دیا۔ ان کی تعریفیں بھی کیں کہ ایسے اچھے ریویو کر لیتے ہیں۔ اپنی کمزوریاں ظاہر کیں کہ جب کوئی کتاب پڑھتے ہیں تو طربیہ حصے پر ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جاتے ہیں اور حُزنیہ حصے پر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ اور ہمیں ہر کتاب پسند آجاتی ہے۔ اور ہمارا دل اس قدر کمزور ہے کہ وہ کسی پر ریویو نہیں کرسکتا۔ اس پر وہ حضرت بڑے زور سے ہنسے اور بہت دیر تک ہنستے رہے۔ جب ہنس چکے تو رونے لگے۔ بالکل الف لیلہ کے اس شہزادے کی طرح جو پرستان میں کسی دیو یا شاید کسی پری کو دیکھ کر ہنسا تھا پھر رو پڑا تھا۔ وجہ پوچھی تو بولے تمھاری جہالت پر رونا آرہا ہے۔ تمھاری بے خبری پر ہنس رہا ہوں۔

بڑی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ آخر انھوں نے ایک سوال کیا۔

''کیا تم بھی ریویو باز بننا چاہتے ہو؟''

ہمارا دل دھڑکنے لگا۔ کہاں ریویو بازی اور کہاں ہم! ہم نے سر جھکا لیا اور شرما کر رہ گئے لیکن انھوں نے کچھ ایسی حوصلہ افزا باتیں کیں کہ ہمیں یقین ہوگیا کہ ریویو کرنا بہت آسان کام ہے۔

''لیکن آپ کو مطالعہ بہت کرنا پڑتا ہوگا؟'' ہم نے پوچھا۔

''مطالعہ؟— کیسا مطالعہ؟— اور کیوں مطالعہ؟''

''آپ پہلے ایک کتاب کو کئی مرتبہ پڑھتے ہوں گے تب جا کر کہیں ریویو کرتے ہوں گے۔ نہایت وسیع مطالعہ ہوگا آپ کا۔''

''لاحول ولاقوۃ! اگر مطالعہ کرکے ریویو کرنے لگے تو ہو چکے ریویو— مطالعہ کون مسخرہ کرتا ہے۔''

''ہیں! تو کیا سچ مچ—!''

''ہاں! سچ مچ میں کتابیں نہیں پڑھتا۔ اگر ذرا سی مشق ہو جائے تو کتاب کو دیکھ کر یا سونگھ کر ریویو کے صفحے کے صفحے لکھے جاسکتے ہیں۔''

اس کے بعد وہ ہمارے استاد بن گئے اور ہم ان کے شاگرد۔ انھوں نے ہمیں یہ فن سکھانا شروع کیا۔ محض چند ہفتوں کی تعلیم کے بعد ہم نے بھی ریویو بازی شروع کر دی۔ سب سے پہلا ریویو ہم نے ایک دیوان پر کیا۔ (دیوان وہ کتاب ہوتی ہے جس میں شعر ہی شعر ہوتے ہیں) یہاں ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے ایک شعر بھی نہیں کہا اور نہ فی الحال کوئی ارادہ ہے اور نہ ہی شعروں کی کوئی پہچان ہے۔ پھر بھی ہم نے ریویو کر دیا اور وہ ریویو اس قدر مقبول ہوا کہ ہم بیان نہیں کرسکتے۔ ہمارے پاس ریویو کے لیے دھڑا دھڑ کتابیں آنا شروع ہوگئیں۔

وہ ریویو کچھ اس طرح تھا—

''موجودہ شاعری آج کل جس دشوار اور کٹھن منزل سے گزر رہی ہے اس کا بیان ہماری طاقت سے باہر ہے۔ یہ دشوار و پُرخطر راستہ جس میں جگہ جگہ رکاوٹیں ہیں، نہایت بیہودہ راستہ ہے۔ ہمارے خیال میں موجودہ شاعری کو کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ خیر، اب جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

اب مثال کے طور پر شاعر موصوف کے دیوانِ مذکور میں سے ایک نظم پیش کرتے ہیں۔ اس میں شاعر نے ایک نہایت مشکل مضمون کو بڑی خوبی سے نباہا ہے۔ پرانی شاعری میں اس خیال کو ہرگز نہیں بیان کیا جاسکتا تھا لیکن جدید شاعری نے ہمارے لیے نئی راہیں کھول دی ہیں۔ نظم ملاحظہ ہو:

لڑ رہی ہیں بلیاں!
اُف بلّیاں
بل
لیاں
باغ میں اس وقت شاید لڑ رہی ہیں بلّیاں!
دُھندلکا ہے شام کا
وقت ہے آرام کا
کام کا
انعام
کا

اور لڑ رہی ہیں بلّیاں!
ہوں گی شاید چار یہ
یا تین ہوں
لیکن ذرا سا یہ شبہ، دل میں ہے میرے بڑھ گیا کہ
بلّیاں یہ پانچ ہیں۔
اور چھ تو ہو سکتی نہیں!
اور چاندنی سی رات ہے
اور چاند ہے نکلا ہوا
اور چاندنی ہے چار سو
اور چار دن کی چاندنی
اور پھر اندھیری رات ہے!
کیا کہہ رہا تھا میں بھلا
افوہ! ابھی تو یاد تھا
اس حافظے کو کیا ہوا
کم بخت سے سمجھے خدا
ہاں مجھ کو یاد آ ہی گیا
کہ لڑ رہی ہیں بلّیاں!
باغ میں اس وقت شاید لڑ رہی ہیں بلیاں!

کیا بات ہے، سبحان اللہ! جزاک اللہ! مرحبا! دیکھا آپ نے؟ اگر نہیں دیکھا تو پھر دیکھیے۔ مزاح و متانت کا امتزاج، رومان و حقیقت کا عجیب و غریب اتصال، شاعر نے کیا ہلکی پھلکی اور دُبلی پتلی نظم کہی ہے:

بلیوں پر آپ نے آج تک کوئی نظم پڑھی؟ غالباً نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو بلیوں سے بے حد عقیدت ہے اور ہونی بھی چاہیے۔

ذرا تصویر بنایئے۔ چاندنی رات، باغ کا ایک تنہا گوشہ، شاعر کا بے چین دل اور کہیں دور سے بلیوں کے لڑنے کی آواز۔ اُف خدایا! کیا کوئی اور چیز اس سے زیادہ رومان انگیز ہو سکتی ہے؟ شاعر کو یہ بھی یقین نہیں کہ یہ بلیاں ہی ہیں! اس نے لفظ شاید کو استعمال کر کے نظم کو نامعلوم بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت باغ میں کتے ہی بھونک رہے ہوں لیکن شاعر کو بلیاں ہی معلوم ہوتی ہیں۔ پھر شاعر یہ بھی نہیں جانتا کہ ان بلیوں کی تعداد کیا ہے۔ کتنی مزیدار بات ہے۔ لیکن اسے یہ یقین ضرور ہے کہ چھ سے کم ہیں۔ چاندنی میں شاعر کو اندھیری راتیں یاد آتی ہیں۔ جب باغ میں اندھیرا ہوگا، اور بلیاں بھی نہیں لڑیں گی۔ بے ثباتیِ عالم کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ لیکن انتہائی کمال شاعر نے وہاں دکھایا ہے جہاں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہاں وہ اپنے حافظے کو کوستا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ

> سارے نئے ادب میں لے دے کر ایک شفیق الرحمن صاحب ہیں جنھوں نے تفریحی ادب کی طرف توجہ کی ہے۔ یہ شگفتگی، یہ لاابالی پن، یہ مچلتی ہوئی جگمگاہٹ، بس انھی کا حصہ ہے۔
> (محمد حسن عسکری)

اکثر لوگ ایسے وقت اپنے حافظے کو کوستے ہیں۔ یہاں ہم حقیقت نگاری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اسی سلسلے میں ہم ایک اور شاعر کی غزل پیش کرتے ہیں (یہ ہم اپنی طرف سے کرر ہے ہیں)۔ پرانی شاعری میں بندشیں بہت تھیں اور ہم جذبات کا اظہار کرتے وقت گھُٹ کر رہ جاتے تھے لیکن جدید شاعری میں بڑی وسعت ہے یہاں تک کہ جو کچھ ہم بولتے ہیں اسے براہِ راست شعروں میں منتقل کیا جا سکتا ہے مثلاً ''اماں ٹھہرو بھی سہی'' یا ''ارے ارے'' اور ''اُوں ہوں'' کو بھی قافیہ (یا ردیف) لکھ سکتے ہیں۔

اب ہم اپنے محترم دوست ازہر صاحب کی ایک غزل پیش کرتے ہیں۔ ہم نے جہاں چ چ لکھا ہے اُسے آپ چچ چچ پڑھیے جو اظہارِ افسوس پر منہ سے نکل جاتا ہے:

قصۂ قلبِ ناتواں چ چ — دُکھ بھری ہے یہ داستاں چ چ
ہر حسیں شکل پر خود آ جانا — خود ہی پھر نالہ و فغاں چ چ
تیر کھانا ہر اک کی نظروں کے — اور دینا دُہائیاں چ چ
فصلِ گُل میں غمِ آشیانے کا — گلۂ آمدِ خزاں چ چ
در جاناں پہ خود ہی جا جا کے — کھانا درباں کی گالیاں چ چ
اک تو یہ دل کی بے تکی باتیں — اس پہ تخیلِ شاعراں چ چ
الغرض شیخ جی محبت کی — ہے کچھ ایسی ہی داستاں چ چ

کیا کوئی ایسی غزل آج سے پچاس سال پہلے کہہ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ یہاں ہمیں دو شعر اور یاد آ گئے:

جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے
جگر کی چوٹ اُوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے

لفظ 'نہیں' نے شعر کو چار چاند لگا دیے۔ کیا معصومیت پیدا ہو گئی۔ سبحان اللہ! دوسرا شعر ہے:

کہیں کرتا ہے کوئی یوں جفائیں نازنیں ہو کر
نہیں کرتا ہے کوئی یوں جفائیں نازنیں ہو کر

وغیرہ وغیرہ

غرض یہ کہ اس قسم کا ریویو ہم نے کیا تھا۔ ریویو کوئی پچاس صفحات کا ہوگا۔ اور وہ دیوان کل چالیس صفحے کا تھا۔ ریویو اس قدر مقبول ہوا کہ بس۔ اسے موجودہ دور کا بہترین ریویو قرار دیا گیا اور ہمارا نام ہر جگہ مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے جو ریویو کرنے شروع کیے ہیں تو ایک ایک دن میں آٹھ آٹھ کتابیں بھگتا دیں۔ کتاب کو دو تین منٹ پڑھا اور ریویو کر دیا۔ کتاب کو سونگھا اور ریویو کر دیا۔ کتاب کو دور سے دیکھا اور ریویو کر دیا۔ ایک پر تو ہم نے بغیر دیکھے ریویو کر دیا جو حسبِ معمول بے حد مقبول ہوا۔

لیکن ہمیں وہ سانحہ یاد تھا جو ہمارے پرانے دوست پر گزر را تھا، چنانچہ ہم ان سے ملے اور کہا اب ایک کتاب لکھیے پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھیے۔ میں ایسا ریویو کروں گا کہ اگلی پچھلی ساری کسر نکل جائے گی۔ انھوں نے معذرت کی اور بولے مجھے اب نہ کتابیں لکھنے کی فرصت ہے نہ پڑھنے کی۔ ہم نے پوچھا آپ کا کوئی دوست کتاب لکھ رہا ہو، لکھ چکا ہو یا لکھنے کا ارادہ رکھتا ہو تو ہمیں بتا دیجیے۔ وہ بولے میں دریافت کروں گا۔ انھوں نے جب دوستوں سے پوچھا تو سب نے معذرت کی لیکن وعدہ کیا کہ وہ اپنے دوستوں سے پوچھیں گے۔ اور جب انھوں نے اپنے دوستوں سے پوچھا تو وہ بھی معذرت کر گئے۔ غرضیکہ اسی طرح یہ پیغام دور دور تک پہنچ گیا۔ آخر ایک صاحب ہم سے ملنے آئے جو ہمارے دوست کے دوست کے دوست تھے۔ انھوں نے از راہِ کرم ہمیں اس دکان کا پتہ بتایا جہاں سے ہم ان کی کتاب خرید کر اس پر ریویو کر سکتے تھے۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ چلتے وقت وہ بولے ''ذرا خیال رکھیے گا۔'' ہم نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ بے فکر رہیے۔''

ہم نے شام کو کتاب خریدی اور علی الصبح ریویو لکھ کر پریس میں بھیج دیا۔ وہ ریویو کچھ ایسا مقبول ہوا کہ ان کی کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔

اس ریویو کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو۔ (کچھ حصہ اس لیے کہ ہمارے ریویو بے حد طویل ہوتے ہیں)۔

''یہ اور وہ'' حضرت آب تربوزی کے دو افسانوں کا مجموعہ۔ لکھائی دیدہ زیب، چھپائی زرق برق۔ کاغذ سفید اور چکنا۔ دیباچہ از حضرت بدنصیب مجذوبی۔ مصنف کی تین تصویریں شامل ہیں۔ ضخامت ستر صفحے۔ قیمت صرف پونے چار روپے جو زیادہ نہیں۔

مصنف نے صرف دو افسانے لکھ کر اردو ادب میں ایسا نام پیدا کیا ہے جو کوئی اور ادیب دو افسانے لکھ کر ہرگز پیدا نہیں کر سکتا۔ ان گنے گنائے صفحات میں زندگی کی وہ تفسیریں پیش کی گئی ہیں کہ پڑھنے والا عش عش کرنے لگتا ہے۔ حسن و عشق کی گھاتیں، چوری چوری کی ملاقاتیں، نفرت و عداوت کے قصے، دیوانی اور فوجداری کے قضیے، زمین کاشت کرنے کے نئے نئے طریقے، جانوروں اور پرندوں کے متعلق دلچسپ باتیں، کھانوں کی ترکیبیں، کیا

ہے جو اس کتاب میں نہیں۔

پہلے افسانے میں جہاں ہیرو اور ہیروئن اونٹ پر سوار ہوکر بھاگ جاتے ہیں وہاں مصنف کی حساس طبیعت اور تیز نگاہیں اونٹ کو نظرانداز نہیں کردیتیں۔ مصنف اونٹ کے متعلق لکھتا ہے:

''اونٹ ایک مستطیل نما جانور ہے جس کا ہر کونہ زاویہ قائمہ ہے۔ اونٹ کی گردن اس کے دھڑ سے پینتالیس درجے کا زاویہ بناتی ہوئی دفعتاً جسم سے مل جاتی ہے اور لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اونٹ کی پیٹھ پر ایک اُبھری ہوئی نوک دار چیز ہوتی ہے جسے کوہان کہتے ہیں یہ اونٹ کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اونٹِ خورد اور اونٹِ کلاں۔

اونٹ کی گردن اس لیے لمبی ہے کہ اس کا سر اس کے جسم سے خاصا دور ہے۔

اونٹ ایک شریف الطبع، شریف النسل، مخبوط الحواس اور مہمان نواز جانور ہے۔ اس کا ذکر دنیا کی ہر مذہبی کتاب میں موجود ہے۔

اونٹ کو عربی میں شُتر اور انگریزی میں کیمل کہتے ہیں۔ پنجاب میں ایک شہر کیمل پور بھی ہے۔

اونٹ کی طبیعت میں انکسار پایا جاتا ہے۔ وہ مغرور بالکل نہیں ہوتا۔ شاید اس لیے کہ اس کے پاس مغرور ہونے کی کوئی چیز ہی نہیں۔

''اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی'' غلط کہاوت ہے۔ یہ اونٹ پر تہمت ہے، سراسر بہتان ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ پانی پیتے وقت اونٹ کی گردن بالکل سیدھی ہوجاتی ہے اور خطِ مستقیم بناتی ہے۔ اونٹ ہفتوں تک ناشتہ کیے بغیر رہ سکتا ہے۔ اسے صحرائی جہاز کا خطاب دیا گیا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ جب وہ دور سے اونٹ کو دیکھتے ہیں تو انھیں جہاز یاد آجاتا ہے؟ لیکن جہاز کو دیکھ کر انھیں کیا یاد آتا ہے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں۔ اونٹ جب چھوٹا ہوتا ہے تو بھی تقریباً اتنا ہی بڑا ہوتا ہے جتنا ایک بڑا اونٹ۔

اس کی سواری سے صحت بہت اچھی رہتی۔ ورزش کی ورزش ہوجاتی ہے اور سوار سمندر کی سطح سے خاصا بلند رہتا ہے۔ اونٹ کی چال بڑی متوالی ہوتی ہے، چنانچہ ایک گویّے نے اونٹ کو چلتے دیکھ کر اپنا مشہور راگ ''رم جھم رم جھم چال تمھاری'' گایا تھا اور اونٹ نے سنا بھی نہیں۔

اونٹ کبھی کبھی صحرا میں ناچتا بھی ہے لیکن اکیلے ہی اکیلے۔ جنگل میں اونٹ ناچا کس نے دیکھا۔

اونٹ کو ایک دُم عطا ہوئی ہے۔ نصف جس کے نصف دُم ہوتی ہے۔ لیکن دُم کی اہمیت

شفیق الرحمٰن کے مضامین ملک کے موجودہ ذوق کو آسودہ کرنے والے ہیں۔ ان کا مزاج محض مذاق کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اچھی خاصی رائے زنی پائی جاتی ہے اور ندرت وجدت بھی۔
(نیاز فتح پوری)

اس قدر اہم نہیں کیونکہ بغیر دُم کے اونٹ بھی پائے جاتے ہیں۔ زرد رنگ کا اونٹ زرد ہوتا ہے اور بھورا اونٹ بھورے رنگ کا ہوتا ہے۔

اونٹ پر دنیا کے مشہور ترین شعرا نے شعر کہے ہیں۔ ایرانی ادب میں اونٹ اور بلبل دونوں کا ذکر ہے۔ ہندوستان میں بھی اونٹ نواز شاعر گزرے ہیں۔

ایک شعر ہے:

اونٹ ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

ایک اور شعر ہے:

گیا ہے اونٹ کوئی اس طرف سے
پتا دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

ایک گیت ہے:

اے اونٹ کہیں لے چل

اور لطف یہ ہے کہ ایک مکمل اونٹ بننے میں فقط تین سال لگتے ہیں۔''

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ حقیقت نگاری کی حد ہوگئی۔ مصنف کی نگاہیں کہاں کہاں جا پہنچتی ہیں۔ کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ پھر ایک جگہ مصنف نے شادی کا نازک مسئلہ اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ ہم داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

یہاں ہمیں ایک کہانی یاد آگئی۔ کسی نے سقراط سے پوچھا۔ ٹھہریے شاید بقراط سے پوچھا تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ ممکن ہے کہ جالینوس یا فیثاغورس ہی سے پوچھ لیا ہو۔ بہرحال اسی قسم کے ایک پرانے عقلمند سے کسی نے پوچھا کہ جناب! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے مشورہ دیجیے کہ کر بیٹھوں یا کنوارا رہوں؟ جواب ملا کہ برخوردار شادی کروگے تو بھی پچھتاؤ گے اور جو کنوارے رہو گے تو بھی پچھتاؤ گے۔

پھر ایک چینی عالم (چین کے عالم، آپ کہیں برتن ورتن نہ سمجھ لیں) ہشت ہشت سے اس کے شاگرد چونگ چینگ چانگ نے پوچھا کہ اے استاد کیا یہ سچ ہے کہ شادی شدہ حضرات کنواروں سے زیادہ دیر زندہ رہتے ہیں اور ان کی عمریں طویل ہوتی ہیں؟ استاد نے فوراً جواب دیا— اے پیارے شاگرد! وہ اصل میں طویل نہیں ہوتیں بلکہ انھیں محسوس ہوتی ہیں کہ بے حد طویل ہیں۔

اسی طرح مشہور چینی سیاح چیاؤں میاؤں ہینگ نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ شادی شدہ انسان درحقیقت نصف انسان ہوتا ہے۔

پھر مصنف نے ہمارے سماج کا مذاق اڑایا ہے۔ ہماری معاشرت پر وہ خوب ہنسا ہے۔ ہمارے تعلیمی معیار پر وہ لکھتا ہے: ''ہمیں امتحان میں پاس ہونے کے لیے 33 فیصد نمبر درکار ہیں۔ یعنی اگر تین سوالوں میں سے ایک کا جواب صحیح ہو تو ہم معیار پر پورے اترتے ہیں اور کامیاب قرار دیے جاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے سامنے ایک اُلّو بٹھا دیا جائے اور پوچھا جائے کہ یہ کیا ہے؟ ہم کہہ دیں کہ یہ خرگوش ہے تو ہمیں دوبارہ سوچنے کو کہا جاتا ہے۔ پھر ہم کہہ دیں کہ یہ قُمری ہے۔ ہمیں ایک اور موقع ملتا ہے اور اگر ہم تیسری مرتبہ کہہ دیں کہ یہ کچھ اُلّو نما پرندہ ہے جس کی ہر بات سے اُلّو پن ٹپکتا ہے تو ہم پاس ہوجاتے ہیں۔ اب اس فی صد کو ہی لیجیے۔ ہر روز پڑھتے ہیں کہ یہاں دس فی صد آدمی کمزور ہیں۔ اس کلاس میں پندرہ فی صد بچے بیمار رہتے ہیں۔ اچھا اب فرض کیجیے کہ ایک مکان میں دس آدمی رہتے ہیں اور ان میں اتفاق سے ایک کا انتقال ہوجاتا ہے۔ اگر آس پاس کوئی ریاضی

داں ہوئے تو حساب لگا کر فوراً کہہ دیں گے کہ اس مکان میں باقی جو نو آدمی ہیں اُن میں سے ہر ایک کا دس فی صد انتقال ہو چکا ہے اور جس غریب کا انتقال ہوا ہے وہ نوے فی صد تندرست ہے۔ خیر، یہ تو کچھ بھی نہیں، سب سے عجیب و غریب چیز اکائی کا قاعدہ ہے۔ ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک اڑھائی فٹ لمبا کتا جس کی دم ڈیڑھ فٹ لمبی ہے، سارے دن میں وہ اپنے پنجوں سے چھ مربع فٹ زمین کھود ڈالتا ہے۔ تو ایک پندرہ میل لمبا کتا جس کی دم نو میل لمبی ہو، ایک نہر سویز کو دو سال ایک مہینہ دو دن اور پونے چار گھنٹے میں کھود دے گا۔''

مصنف کا مطالعہ بے حد وسیع ہے۔ باتوں باتوں میں وہ دور دور تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر فوراً آ جاتا ہے۔ جہاں ہیروئن ہیرو کے انتظار میں گاجریں کھا رہی ہے، وہاں وہ گاجروں کے متعلق لکھتا ہے:

''گاجروں کو اچھی طرح نہیں توڑا جاتا۔ تبھی گاجروں کی ایک بہت بڑی مقدار ضائع ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں گاجریں کم ہوتی جارہی ہیں۔ اگر حالات اسی طرح رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہم گاجروں کو ترسیں گے۔ گاجروں کو توڑنے کا بہترین وقت وہ ہے جب وہ نہ بہت کچی ہوں نہ بہت پکی۔ نہ بہت ملائم ہوں نہ بہت سخت۔ نہ بہت میٹھی ہوں نہ بہت پھیکی۔

گاجریں توڑنے والے گاجروں کے درخت پر چڑھ جائیں۔ ایک لمبے سے رسّے کی مدد سے وہ بآسانی چڑھ سکتے ہیں۔ ویسے احتیاط کرنا چاہیے کیونکہ گاجروں کا درخت کافی چکنا ہوتا ہے اور پھسلنے کا ڈر رہتا ہے۔ نیچے زمین پر چادریں بچھا دی جائیں اور درخت کی ٹہنیاں خوب زور سے ہلائی جائیں۔ گاجریں نیچے چادروں پر جا گریں گی۔''

ذرا سوچیے تو سہی کہ رومانی افسانوں میں ایسی مفید باتیں کون بتاتا ہے۔ یہ کسی کسی کا کام ہے۔

مصنف نے نئے نئے الفاظ اختراع کیے ہیں جو یقیناً بہت جلد ہمارے ادب میں عام ہو جائیں گے۔ چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

چھاس: پیاس کے وزن پر چھار بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پیاس پانی کی ہوتی ہے اور چھاس چائے کی۔ مثلاً کوئی سہ پہر کو کہے بھئی مجھے سخت چھاس لگی ہے۔

پوشیدہ غنچی: یعنی چھپ کلی۔ چھپکلی ویسے بھی غیر مانوس سا نام تھا۔

دستی: ہاتھی۔ ہاتھی غیر رومانی چیز معلوم ہوتی تھی۔

قمریا: چندیا۔ یہ کہنا کہ اس کی چندیا پر ایک بھی بال نہیں، کتنا غیر رومانی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی جگہ یہ کہ اس کی قمریا پر ایک بھی بال نہیں، کس قدر بہتر ہے۔

اب ہم چند رومانی سین پیش کرتے ہیں۔ مصنف نے کمال چابکدستی سے یہ سین پیش کیے ہیں۔ دوسرے افسانے کا ایک مختصر سا حصہ ہم نقل کرتے ہیں:

''ایک نہایت خوش نما باغ میں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ باغ میں ایک بھی پھول نہیں تھا۔ پھر بھی نہ جانے خوشبو کہاں سے آ رہی تھی۔ وہاں بہت سی سڑکیں تھیں۔ ہر سڑک ساڑھے دس فٹ چوڑی اور سو فٹ لمبی تھی۔ سو فٹ کے بعد وہ فوراً ایک اور سڑک سے مل جاتی۔ اس طرح سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ہر سڑک پر دو رویہ درخت کھڑے جھوم رہے تھے۔ ایک ایک لائن میں چالیس چالیس درخت تھے۔ ہر درخت کی پچاس پچاس ٹہنیاں اور ہر ٹہنی پر پانچ پانچ پرندے بیٹھے گا رہے تھے۔ سارے باغ کے پرندے ایک وقت ایک سُر گاتے تھے۔ ہر سات منٹ کے بعد سُر تبدیل ہو جاتی تھی۔''

مصنف نے نئے نئے الفاظ اختراع کیے ھیں جو یقینا بہت جلد ھمارے ادب میں عام ھوجائیں گے۔ چند الفاظ ملاحظہ ھوں:
چھاس: پیاس کے وزن پر چھار بھی ھے۔ فرق صرف اتنا ھے کہ پیاس پانی کی ھوتی ھے اور چھاس، چائے کی۔ مثلاً کوئی سہ پھر کو کھے بھئی مجھے سخت چھاس لگی ھے۔
پوشیدہ غنچی: یعنی چھپ کلی۔ چھپکلی ویسے بھی غیرمانوس سا نام تھا۔
دستی: ھاتھی۔ ھاتھی غیر رومانی چیز معلوم ھوتی تھی۔
قمریا: چندیا۔ یہ کھنا کہ اس کی چندیا پر ایک بھی بال نھیں، کتنا غیررومانی معلوم ھوتا ھے۔ اس کی جگہ یہ کہ اس کی قمریا پر ایک بھی بال نھیں، کس قدر بھتر ھے۔

یہ پڑھ کر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور بے چینی بڑھ جاتی ہے۔ مصنف لکھتا ہے۔ ''ہیروئن نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ''میں ایک ماہ سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ کی جرابیں مختلف رنگ کی ہوتی ہیں۔ آپ ہر روز ایک پاؤں میں سرخ جراب پہن کر آتے ہیں اور دوسرے میں سبز۔''

ہیرو نے ایک گھٹنے پر جھک کر اپنا ایک ہاتھ دل پر رکھا اور نہایت دردناک لہجے میں بولا: ''میں تمھیں کس طرح بتاؤں کہ یہ دو مختلف جرابیں نہیں بلکہ جرابوں کا ایک جوڑا ہے۔''

ہیروئن نے شرما کر کہا۔ ''بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟''

''بالکل ایسا ہی ایک جوڑا ہمارے گھر میں پڑا ہوا ہے۔''

بس اس سے زیادہ ہم اور کچھ نہیں لکھیں گے۔ باقی آپ کتاب میں پڑھیے۔ ہم اس فقرے پر اپنا ریویو ختم کرتے ہیں کہ ہمارے ادب میں ایسی کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔

خیر، ریویو تو بے حد مقبول ہوا لیکن ساتھ ہی لوگوں کو طرح طرح کی غلط فہمیاں ہو گئیں۔ ایک تو یہ کہ ہم ہمیشہ ریویو میں تعریفیں ہی کرتے ہیں اور مصنف کو اٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم ہر کتاب پر ریویو لکھ مارتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز ہمیں ایک خط ملا جس میں ایک صاحب نے بڑی بے نیازی سے ہمیں لکھا تھا ''اپنی کتاب کی تین کاپیاں بذریعہ وی پی بھیج رہا ہوں۔ ان میں سے ایک پر ریویو کر دیجیے۔ اگلے ہفتے تک ریویو چھپ جانا چاہیے۔ مجھے بہت جلدی ہے اور میں زیادہ سے زیادہ آپ کو دس دن کی مہلت دے سکتا ہوں۔ جن جن پرچوں میں آپ ریویو چھپوائیں ہر ایک کی ایک کاپی مجھے بھیجیں۔

ہمیں بے حد غصہ آیا۔ ساری رات کتاب پر ضائع کر دی۔ دوسرے روز مندرجہ ذیل ریویو پریس میں بھیج دیا۔

سلطانہ اور دیگر افسانے—از حضرت شتر بے مہاری۔

کاغذ کھردرا، لکھائی بے کار، چھپائی اور بھی بے کار، گٹ اَپ سرے سے غائب۔ سب سے پہلے تو ہمیں اس کتاب کا نام بالکل پسند نہیں آیا۔ اس نام سے فوراً سلطانہ ڈاکو یاد آ جاتا ہے۔ کتاب میں تیرہ افسانے ہیں۔ تیرہ کا عدد نہایت منحوس ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے افسانوں پر نحوست برس رہی ہے۔

صفحات کی تعداد چار سو بیس ہے جو نہایت خطرناک ہندسہ ہے۔ کاغذ نہ صرف کھردرا ہے بلکہ ردّی میں خریدا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ڈھائی روپے قیمت بہت زیادہ ہے۔ ہمارے خیال میں تو اس مجموعے کی قیمت آٹھ دس آنے کافی تھی۔

یہ مجموعہ قلندر علی، قلندر علی اینڈ قلندر علی نے چھاپا ہے جو ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ انھیں لوگ اکثر پسند نہیں کرتے۔ اس کارخانے کے مالک کا بڑا لڑکا اس وقت جیل میں ہے اور چھوٹا لڑکا اس قدر جواری ہے کہ کیا کہا جائے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ —

اوہ معاف کیجیے۔ ہاں! تو کتاب کا ٹائٹل ایک فلمی سین کا چربہ ہے۔ یہ سین فلم 'رباعیاتِ علی بابا' سے لیا گیا ہے جہاں مِس طوطا مینا، ماسٹر پہلوان کا انتظار کر رہی ہیں۔ ویسے یہاں مس طوطا مینا کو بے حد موٹا دکھایا گیا ہے کاش کہ مس موصوفہ اُسے دیکھیں اور قلندر حضرات پر دعویٰ کردیں تاکہ ان کی ساری مستی اور قلندری کافور ہوجائے۔ مصنف نے اپنی تصویر بھی شامل کی ہے۔ کاش کہ وہ کسی عقلمند سے مشورہ کرتے تاکہ یہ نوبت ہی نہ آتی۔ تصویر میں بے شمار خامیاں ہیں۔ مصنف کا ایک کان بڑا ہے اور دوسرا برابر ہے یا یوں کہ ایک کان اوسط ہے اور وہ اس کان سے چھوٹا ہے جو بڑا ہے اور وہ بڑا کان اس چھوٹے کان کے مقابلے میں محض اس لیے بڑا دکھائی دیتا ہے کہ چھوٹا کان باوجود اوسط درجے کا ہونے کے اس کان سے جو— معاف کیجیے۔ تصویر دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ مصنف نے کئی دنوں سے حجامت نہیں بنوائی۔ اس کی ٹائی کی گرہ غلط ہے۔ اس کے سوٹ میں بے شمار سلوٹیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج تک استری نہیں کیا گیا ہے۔ یا کسی گھڑے میں سے نکالا گیا ہے۔ مصنف نے ٹائی، کالر بٹن کے بغیر ہی لگائی ہے۔ ہمارے دل میں شبہ سا پیدا ہوگیا ہے کہ کہیں یہ سوٹ کسی اور کا تو نہیں۔

دیباچہ ہے تو سہی لیکن دیباچہ لکھنے والے کا نام نہیں لکھا گیا۔ اس سے ہمارا اندازہ ہے کہ دیباچہ خود مصنف ہی نے دھر گھسیٹا ہے۔ اس میں نہ مصنف کے متعلق کچھ لکھا ہے نہ اس کی تحریروں کے متعلق۔ محض اِدھر اُدھر کی باتیں لکھی ہیں۔

اب رہی کتابت، سو کاتب نے آخری صفحے پر اپنا نام، محلّہ، شغل، شہر اور وہاں کی آب و ہوا— سب کچھ لکھ مارا ہے جو نہایت بری بات ہے۔ کاتب نے جگہ جگہ غلطیاں کی ہیں۔ اس نے کئی جگہ بالم کو سالن اور سیاں کو سویاں لکھ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت کاتب کو سخت بھوک لگ رہی تھی۔ ایک جگہ حور شمائل نازنین کو چور شمائل نازنین لکھ کر افسانے کا بیڑہ غرق کردیا ہے۔ کاتب نے محاورے بھی غلط لکھے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ 'سانپ بھی نہ مرے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جائے'— 'اُلٹا کوتوال چور کو ڈانٹے'— 'کتا دیکھے گا تو ضرور بھونکے گا' وغیرہ وغیرہ۔

کتاب کے آخر میں چند اشتہارات دیے گئے ہیں

شفیق الرحمن محض مزاح نگار ہی نہیں، وہ زندگی کی پُرسوزی سے اتنے ہی قریب ہیں جتنے اس کے طربیہ پہلو سے۔ فرق یہ ہے کہ زندگی کے چاشنی دار غم نے ان کے بلند تخلیقی جذبات کو مشتعل نہیں کیا بلکہ ان کی رومانی کہانیوں کو مزاح کی سنہری لہر نے عظیم تر بنا دیا ہے۔

(سید احتشام حسین)

جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک دکان کے منیجر صاحب نے اشتہار دیا ہے:

''کسی دوسری دکان پر جا کر دھوکا نہ کھائیے—
ہمارے ہاں تشریف لائیے۔''

دوسرا اشتہار کتوں کے متعلق ہے۔ دو کتے فروخت کے لیے ہیں۔ اشتہار ہے:

''دو موٹے تازے کتے، ایک سیاہ دوسرا سفید، نہایت وفادار اور سمجھ والے، رات کو خوب بھونکتے ہیں۔ جو دے دو بڑے شوق سے کھا لیتے ہیں۔ بچوں کو خاص طور

پر پسند کرتے ہیں۔''

اب رہا افسانوں کے متعلق۔ سو ان میں ایک بھی ایسا نہیں جسے افسانہ کہا جاسکے۔ جگہ جگہ غیر ملکی ادب سے چوری کی گئی ہے۔ پلاٹ، مکالمے، اشعار، منظر، غرض یہ کہ ہر چیز غیر ملکی ہے۔

پہلے افسانے میں جہاں ہیرو بغیر لیمپ کے سائیکل چلاتا ہوا پکڑا جاتا ہے، یہ کسی مشہور انگریزی ناول سے نقل کیا گیا ہے۔ چوتھے افسانے میں جہاں ہیرو کی پٹائی ہوتی ہے اور ہیروئن سے پِٹ پِٹ کر اس کا برا حال ہوجاتا ہے، یہ حصہ ہو بہو رُوسی ناول 'پول پول پوف' سے ماخوذ ہے۔ آخری افسانے میں جہاں ہیرو کے کپڑے چرا لیے جاتے ہیں اور شبے میں وہ خود گرفتار کرلیا جاتا ہے، وہ حصہ مشہور فرانسیسی شاہکار ''لافش ڈی فُش'' سے لیا گیا ہے اور چھٹے افسانے میں جب ہیروئن کا دماغ خراب ہوجاتا ہے اور وہ چیخیں مارتی ہوئی جنگل میں جا پہنچتی ہے اور وہاں ایک ریچھ کو ہیرو سمجھ کر اس کے کان کاٹ لیتی ہے، یہ ساری کہانی مشہور چینی ادیبہ مس پِنگ پانگ کی معرکتہ الآرا کتاب 'میاؤں میاؤں' کا ترجمہ ہے۔

قصہ مختصر، ساری کی ساری کتاب اِدھر اُدھر سے چرائی گئی ہے۔ ہیرو کا حلیہ بیان کرتے وقت مصنف فرماتے ہیں۔ ''اس کی عمر ہوگی کوئی بیس اور پینتالیس کے درمیان۔'' بھلا بتائیے تو سہی کہاں بیس اور کہاں پینتالیس۔

افسانوں کے پلاٹ بالکل پھُسپھُسے ہیں۔ جہاں انھیں کسا ہوا ہونا چاہیے تھا وہاں ڈھیلے ہیں اور جہاں ڈھیلا ہونا چاہیے تھا وہاں کس دیے گئے ہیں۔

ایک جگہ لکھا ہے کہ ''عین رات کے بارہ بجے میل ٹرین ڈونگہ بونگہ سے چلی اور سیدھی دیولالی جاکر ٹھہری۔'' اوّل تو ڈونگہ بونگہ لائن پر کوئی میل ٹرین نہیں چلتی۔ دوسرے یہ کہ ڈونگہ بونگہ نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ہے اور دیولالی، جی آئی پی ریلوے میں پھر رات کے بارہ بجے ڈونگہ بونگہ کے اسٹیشن پر نہ کوئی ٹرین آتی ہے نہ وہاں سے کہیں جاتی ہے۔ اسی طرح مصنف نے سردی کے موسم میں آم کھائے ہیں اور گرمیوں میں کپاس کے کھیت دیکھے ہیں۔ پہاڑوں پر کھجور کے درختوں کا ذکر ہے اور ریگستانوں میں آبشاروں کا۔

سچ مچ ہمیں یہ کتاب پڑھ کر بڑی وحشت ہوئی۔

اگر مصنف کی یہ پہلی کتاب ہے تو انھیں صبر کرلینا چاہیے۔ اگر دوسری ہے تو حفاظت سے کام لینا چاہیے۔ اگر تیسری یا چوتھی ہے تو ان کی حالت پر افسوس ہے۔

ہم اب تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ آخر شتر بے مہاری صاحب نے یہ افسانے لکھے کیوں؟ اگر لکھے بھی تو کتابی صورت میں کیوں ترتیب دیے؟ اور یہ کتاب انھوں نے کیوں چھپوا دی؟ شتر صاحب اس دنیا میں آئے کیوں؟ شتر صاحب اب تک زندہ کس لیے ہیں!—''

کچھ اس قسم کا تھا وہ ریویو۔

(شفیق الرحمن کی کتاب 'لہریں' کے ایک مضمون 'ریویو' سے ایک اقتباس)

■

ماخوذ: 'لہریں'، مصنف: شفیق الرحمن، اشاعت: جنوری 1995، ناشر: ماورا پبلشرز، 3 بہاولپور روڈ، لاہور

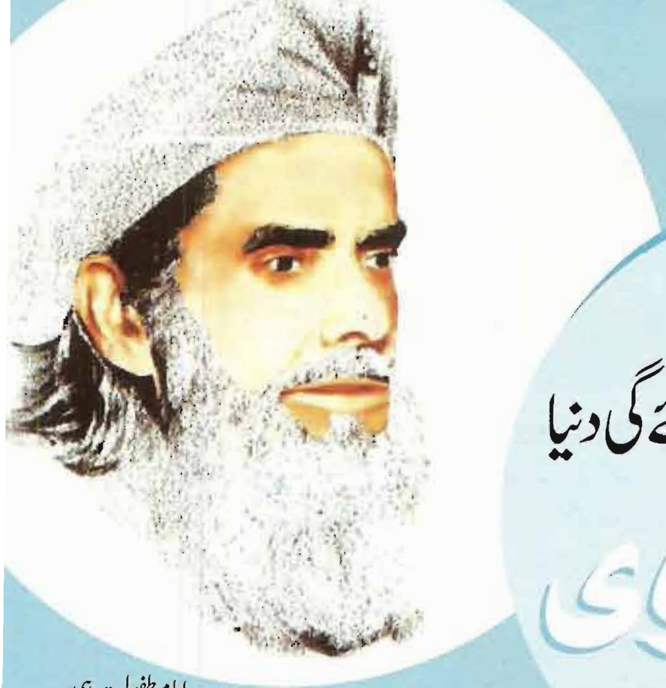

انگریزی سے ترجمہ: شاہد اختر انصاری

ہمیں کس طرح بھول جائے گی دنیا

بہزاد لکھنوی

آج کی اردو نسل کے لیے بہزاد لکھنوی ایک نیا نام ہوسکتا ہے لیکن ایک زمانہ تھا کہ ملک کے گلی کوچوں اور ادبی محفلوں میں لوگ ان کے اشعار گاتے، گنگناتے تھے اور پورے ملک میں اس نام کی دھوم تھی۔ ہر اس گھر میں جہاں گراموفون مشین موجود ہوان کی غزلوں کے ریکارڈ۔ سکندرآباد کے مشہور ترین قوال کلن خاں سے لے کر غزل گوئی کی ملکہ بیگم اختر عرف اختری بائی فیض آبادی تک اس دور کے ہر مشہور مغنی اور گویتے نے ان کی غزلیں گائی تھیں۔ مشاعروں میں ان کے ترنم اور خوش الحانی کے چرچے تھے۔ فلموں کے لیے ان کے لکھے ہوئے بہت سے نغمے آج تک مقبول ہیں۔ اور جہاں تک نعت گوئی کا تعلق ہے تو اس دور میں میلاد کی کوئی محفل بہزاد لکھنوی کی وجد آفریں نعتوں کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔

سردار حسین بہزاد لکھنوی کی پیدائش 1895 میں لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ آبا و اجداد کا تعلق اور شجرۂ نسب ہندوستان کے بادشاہ شہاب الدین محمد غوری سے ملتا ہے۔ تاہم روحانیت وتصوف کے شجرے کے مطابق ان کا سلسلہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ، غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت علیؓ کے توسط سے پیغمبر اسلام آنحضرت محمد مصطفیٰؐ سے جاملتا تھے۔ وہ مذہبی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد سجاد حسین ایک پاک طینت مذہبی انسان اور شاعر بھی تھے۔ چراغ تخلص کیا کرتے تھے۔ حضرت بہزاد کی پرورش و پرداخت میں ان کی والدہ کا ہاتھ تھا۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا 9 سال کی عمر سے کی۔ ابتدائی تعلیم کلکتہ میں پائی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے۔ بہزاد لکھنوی کو کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ مثلاً عربی، فارسی،

> بہزاد لکھنوی کی حیات میں ھی 33 مجموعہ کلام منظرعام پر آچکے تھے جن میں ثنائے حبیب، کیف سرور، نعت حضور، ذکر حضور، نقش بہزاد، نغمات بہزاد، نغمہ نور، موج کوثر، چراغ طور، وجود حال، نغمہ روح، کرم بالائے کرم، فیضان کرم، کفر و ایمان شامل ھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے فلموں کے لیے گیت بھی لکھے۔ فلم 'آگ' کا یہ مقبول دوگانا 'سولہ برس کی بھئی عمریا' جسے شمشاد بیگم اور رام گانگولی نے گایا تھا آج بھی لوگوں کی یادوں میں م حفوظ ھے۔ اسی فلم کا ایک اور نغمہ جسے مکیش نے اپنی جادو بھری پرسوز آواز میں پیش کیا تھا آج تک ھٹ ھے۔

انگریزی، ہندی، بنگالی اور فرانسیسی۔ ان کی عملی زندگی کی شروعات محکمہ ریلوے سے ہوتی ہے۔ بہزاد لکھنوی کو بظاہر اختلاج قلب کا عارضہ تھا چنانچہ اس ملازمت کو وہ زیادہ عرصے جاری نہ رکھ سکے۔ بعد کے دنوں میں حضور صلعم سے ان کی بے پناہ عقیدت بھی دل کی دھڑکن کے بے قاعدہ ہونے کی صورت میں متشکل ہونے لگی۔ ایام طفولیت ہی سے وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور متقی و پرہیز گار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فلمی دنیا سے بھی انھوں نے جلد ہی قطع تعلق کرلیا تھا۔ اختلاج قلب کے مرض سے وہ اس قدر متاثر رہنے لگے کہ اکثر ان پر غشی کے دورے پڑتے اور حال کی کیفیت طاری ہوجاتی۔ کئی بار اسی عالم میں وہ اشعار بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ یہی حالات انھیں خانقاہ بے نیازی بریلی شریف لے گئے جہاں انھیں بالآخر کسی قدر روحانی و قلبی سکون میسر آیا۔ ورنہ صورت حال یہ تھی کہ جب انھیں خانقاہ میں لایا گیا تو وہ حالت جنون میں اپنے کپڑے پھاڑ رہے تھے اور چار آدمی انھیں قابو میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی عالم اضطرار میں رات بھر ان کی زبان سے حق ہو، اللہ ہو کا ورد جاری رہتا تھا۔ اگرچہ ذہنی انتشار سے انھیں نجات مل گئی لیکن کپڑے پھاڑنے کی عادت بدستور جاری تھی۔ ان کی گردن کے چاروں طرف کپڑے لپیٹ دیے جاتے تھے۔ جب ذہنی توازن بگڑتا تو وہ ان ہی کپڑوں کو جھٹکے دیا کرتے تھے۔ اپنے پیرو مرشد کی نگرانی میں بہزاد لکھنوی تیزی سے روبصحت تھے اور بہت جلد صحت یاب ہوکر معمول کی زندگی پر لوٹ آئے۔

انھوں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کی اور دہلی و بمبئی کے اسٹیشنوں پر اسکرپٹ رائٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ تقسیم وطن کے بعد وہ پاکستان ریڈیو کراچی سے وابستہ ہوگئے اور صبح کی نشریات میں دس سال تک نعت خوانی کرتے رہے۔ انھوں نے دو مرتبہ حج وعمرہ کا فریضہ ادا کیا۔ پاکستان مہاجرت کے بعد ریڈیو پاکستان کراچی سے جذبات سے لبریز ان کی نعتوں سے صبح کی نشریات شروع ہوتی تھیں اور مشاعروں میں بھی جاتے

انتخاب کلام بہزاد لکھنوی

نعت نبیؐ

اللہ اللہ عشق کا کعبہ نظر آنے لگا
اے تصور! گنبد خضرا نظر آنے لگا

اب نگاہیں ہو چلیں میری حقیقت آشنا
چار جانب مجھ کو وہ روضہ نظر آنے لگا

عشق احمدؐ ہوگیا ہے جب سے دل میں ضوفگن
مجھ کو اپنی زیست کا منشا نظر آنے لگا

جو یقیں والے ہیں ان کو تو یقیں آ ہی گیا
بس گماں والوں نے پوچھا کیا نظر آنے لگا

انؐ کی رحمت دیکھ کر انؐ کی غلامی کے طفیل
اب تو مجھ کو غیر بھی اپنا نظر آنے لگا

انؐ کا درسِ زندگی دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں
دل کو مہمل سا غمِ دنیا نظر آنے لگا

برکتیں بہزاد ہیں یہ سب درودِ پاک کی
قلب کی رگ رگ میں عشق انؐ کا نظر آنے لگا

غزل

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے
ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے

اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے

میں ڈھونڈ رہا ہوں مری وہ شمع کہاں ہے
جو بزم کی ہر چیز کو پروانہ بنا دے

آخر کوئی صورت بھی تو ہو خانۂ دل کی
کعبہ نہیں بنتا ہے تو بت خانہ بنا دے

بہزاد ہر اک جام پہ اک سجدۂ مستی
ہر ذرّے کو سنگ در جانانہ بنا دے

غزل

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

اے دل کی خلش چل یوں ہی سہی چلتا تو ہوں ان کی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آجائے

اے رہبر کامل چلنے کو تیار تو ہوں پر یاد رہے
اس وقت مجھے بھٹکا دینا جب سامنے منزل آجائے

ہاں یاد مجھے تم کرلینا آواز مجھے تم دے لینا
اس راہ محبت میں کوئی درپیش جو مشکل آجائے

اب کیوں ڈھونڈھوں وہ چشم کرم ہونے دو ستم بالائے ستم
میں چاہتا ہوں اے جذبۂ غم مشکل پس مشکل آجائے

اس جذبۂ غم کے بارے میں اک مشورہ تم سے لیتا ہوں
اس وقت مجھے کیا لازم ہے جب تم پہ میرا دل آجائے

غزل

ہمیں کس طرح بھول جائے گی دنیا
کہ ڈھونڈھے سے ہم سا نہ پائے گی دنیا

مجھے کیا خبر تھی کہ نقش وفا کو
بگاڑے گی دنیا بنائے گی دنیا

محبت کی دنیا میں کھویا ہوا ہوں
محبت بھرا مجھ کو پائے گی دنیا

ہمیں خوب دے گی فریب محبت
ہمارے نہ دھوکے میں آئے گی دنیا

قیامت کی دنیا میں ہے دل فریبی
قیامت میں بھی یاد آئے گی دنیا

رلا دوں میں بہزاد دنیا کو خود ہی
یہ مجھ کو بھلا کیا رلائے گی دنیا

تھے جن کا اہتمام ان کی وفات تک وردسعیدی کیا کرتے تھے۔ ان مشاعروں میں جگر مرادآبادی، اسرارالحق مجاز اور جگن ناتھ آزاد جیسے ہندوستان کے چوٹی کے شعرا کی بھی شرکت ہوتی تھی۔

بہزاد لکھنوی کا انداز بڑا والہانہ تھا اور وہ اشعار بہت ہی دلکش انداز میں پڑھا کرتے تھے۔ قدرت نے انھیں لحن داؤدی عطا کیا تھا اور ان کی آواز سامعین کو مسحور کردیتی تھی۔

بہزاد لکھنوی کی شاعری سادگی، دلکشی پاکیزگی و گہرائی کا نادر نمونہ ہے۔ ان کی شاعری میں کسی فلسفے یا مخصوص نظریے کی تقلید و تلقین نہیں ملتی تاہم مصرعوں میں ابہام جا بجا موجود ہے۔ بہزاد کی شاعری میں رومانیت کے علاوہ جنسی اظہار کا بھی نرالا انداز ملتا ہے۔

ان کی شاعری جذبات سے لبریز، سوز و گداز، قلبی واردات سے بھری پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سامعین بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ اگرچہ لکھنؤ سے ان کی وابستگی رہی ہے لیکن ان کی شاعری میں لکھنویت کی جھلک نہیں پائی جاتی۔ ابہام کے باوجود ان کی شاعری میں ایک عزم اور استحکام ملتا ہے۔ انداز و بیان عمدہ اور لفظوں کے انتخاب میں خوبصورتی ملتی ہے۔ ان کے یہاں شاعری میں داخلیت کا عنصر بھی ملتا ہے۔ روزمرہ کے لفظوں کے استعمال میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ ان تمام خوبیوں کے ماسوا جو چیز ان کی شاعری کو عظمت بخشتی ہے۔ وہ ان کی شاعری کی غنائیت ہے۔

بہزاد لکھنوی کی حیات میں ہی 33 مجموعہ کلام منظر عام پر آچکے تھے جن میں ثنائے حبیب، کیف سرور، نعت حضور، ذکر حضور، نقش بہزاد، نغمات بہزاد، نغمہ نور، موج کوثر، چراغ طور، وجود حال، نغمہ روح، کرم بالائے کرم، فیضان کرم، کفر و ایمان شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے فلموں کے لیے گیت بھی لکھے۔ فلم 'آگ' کا یہ مقبول دوگانا 'سولہ برس کی بھئی عمریا' جسے شمشاد بیگم اور رام گانگولی نے گایا تھا آج بھی لوگوں کی یادوں میں محفوظ ہے۔ اسی فلم کا ایک اور نغمہ جسے مکیش نے اپنی جادو بھری پرسوز آواز میں پیش کیا تھا آج تک ہٹ ہے۔ گیت کے بول اس طرح ہیں:

زندہ ہوں اس طرح کہ غم زندگی نہیں
جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں

فلم 'ادا' کے لیے بہزاد لکھنوی کا لکھا ہوا گیت 'جس دل میں بسانا چاہا تھا اس دل میں اپنے بسا نہ سکے' طلعت محمود نے گایا تھا اور کافی مشہور ہوا تھا۔ خوبصورت آواز میں پیش کیا۔

بہزاد لکھنوی کو اپنی شاعری کی پیش کش پر عبور حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ امیجری کا ہنر بھی ملتا ہے۔ ان کی غزلیں اور نعت خوانی انھیں اردو ادب میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ ایک بہترین نعت خواں کی حیثیت سے بہزاد ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ ان کی وفات 1974 کراچی میں ہوئی اور ان کا مقبرہ درگاہ سخی حسن کراچی کے شمال میں واقع ہے۔

مضمون بشکریہ: urduyouthforum.org

□

Dr. Shahid Akhtar, 38/7, Noor Nagar
Jamia Nagar, Okhla, Delhi- 110025

لوک گیتوں کی زبان اور مضامین

اطہر علی فاروقی

جب ہم لوک گیت کہتے ہیں تو سننے والا گاؤں کے گیت سمجھتا ہے اور ہندی میں گرام گیت کے لفظ نے اس کی تائید اور بھی زیادہ کردی۔ اس میں شک نہیں کہ لوک گیت دیہی سماج کے ترجمان ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو لوک گیتوں اور کتابی گیتوں یا شہری گیتوں کو پوری طرح الگ الگ رکھنا دشوار سا ہوجاتا ہے بجز اس کے کہ لوک گیتوں کی زبان کتابی گیتوں کی زبان سے بہت کچھ مختلف اور جدا ہوتی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ شہر کو دیہات سے یا دیہات کو شہر سے بالکل جدا کردینا ناممکن سا ہے شہر اور دیہات میں ہمیشہ لین دین رہا ہے۔ شہریت نہ تو کسی چہار دیواری میں محدود ہے اور نہ دیہاتی زندگی پر کوئی ایسی پابندی ہے کہ وہ شہر کی طرف نہ دیکھے۔

کجری یا کجلی، لاؤنی اور خیال کا شمار لوک گیتوں میں ہے آج سے کوئی 40 سال پیشتر جب میں بنارس میں تھا تو دیکھتا تھا کہ جہاں کہیں اور جب کبھی ان گیتوں کا اکھاڑا جمتا تو اچھے خاصے پڑھے لکھے شہری لوگ اس جشن میں شرکت کرتے۔ کجری گانے والیوں کی برجستہ گوئی، ان کے طنز، (پھٹکے بازی) دیہی الفاظ کی رنگارنگی مزاحیہ طرز ادا، فقرے بازی، چٹکلے اور ان سب سے زیادہ گانے والوں کے تاؤ بھاؤ، گانے والیوں کے ناز و انداز شہریوں کو اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

صرف یہی ہوتا تو غنیمت تھا، بلکہ یہ بھی ہوا کہ کتابی گیت کاروں اور شہری شاعروں کی ذہنیتیں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ زبیر رضوی ایک مشہور اردو گیت کار ہیں۔ سواگ کے عنوان سے ان کا ایک گیت ہے۔ کسی نوجوان عورت کا شوہر باہر سے آتا ہے وہ بناؤ سنگار کرنے میں اپنی کسی سہیلی کو شریک کرتی ہے:

آو سکھی ری آؤ سکھی ری الجھی زلف بنا دو
ماتھے اوپر بندیا لگاو مست نین چمکادو
پپیہا بولے کوئلیا کوکے پوَن یہ گنگنائے
کہ پیتم آرہے ہیں نین مُسکائے

یہی جذبہ ایک لوک گیت میں پڑھیے۔ بات یہاں بھی سواگت کی ہے کسی نوجوان عورت کی سہیلی نے اس کو خبر دی کہ اس کے ساجن آگئے ہیں اور سہیلی پوچھتی ہے:

مہاری سکھی ری! کیا اوڑھوگی کیا پہروگی
کیا کی مانگ بھراؤ گی

نوجوان عورت تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہتی ہے:

کہو تو سکھی ری سب رنگ پہروں، پچ رنگ پہروں
کہو تو چلوں میلے بھیس

سہیلی کے چہرے کا رنگ دیکھ کر اب نوجوان عورت جواب دیتی ہے:

مشرو پہروں گی سیالو اوڑھوں گی
موتیاں مانگ بھراؤں گی

(سہارن پور)

ایسے ہی موقع کا ایک دوسرا گیت پڑھیے:

دو تر کرے سنگار پہنا دھانی جوڑا
مسرو تمان کھینچ لیا انگیا کا ڈورا
کرتی پہنی سمال اوڑھنی شال دوشالا
کرن پھول اور جھمکے پہنے چندر کلی کا ہار
کنگن پہنے سوالاکھ کے جھانجھن کی جھنکار
بال بال میں موتی پیچے ڈالا عطر پھلیل
چابے پان جمالی مِسّی رہی آئینہ دیکھ
رہی آئینہ دیکھ حسن کو خوب نِکھارا
ماتھے پر بندا چمکے گلے چمک رہی مسال

اتنا بن سنور کر وہ اپنے پریتم کے سامنے جارہی ہے مگر کس طرح؟

سہج سہج پگ دھرن پے چلے چتر کی چال

ایسی حالت دیکھ کر اس کے پریتم کا کیا حال ہورہا ہے:

چلے چال چتر کی کنور نرکھے پرچھائیں
دیکھ چاندنی چھپی کالی گھٹا جھک آئی

کتابی دنیا کا ایک مشہور گیت کار دلّی کی عورتوں

کے ملبوسات دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے'

ساری، لہنگے اور غرارے   پتلی کمریا بل کھا کھا جائے
بندیا چمکے پایل، جھومر اور ہاتھوں کے کنگن
منہدی، کاجل، چوڑی، غازہ، اور بازو کے جوشن
اتنی چیزیں دیکھ کے للچائے گوری کا من

اور وہ محسوس کرتا ہے:

دلی شہر ہے یارو اب   تو اندر کا دربار
چست قبائیں پہن کے جوبن دکھلائے ہر نار

اب یہی تصویر آپ ان ٹکڑوں میں ملاحظہ فرمایئے جوان پڑھ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ ''دوتر کرے سنگار...'' میں اس کی ایک جھلک آپ دیکھ چکے ہیں۔

ہریالا بنا مرا سوہے رے
نجر لگ جائے نا   اللہ نجر لگ جائے نا
سر پر پگڑی سوہے   کلغی پہ سہرا سوہے   رے
نجر لگ جائے نا   اللہ نجر لگ جائے نا
ململ کا جامہ ریشم کا ٹیکا   پیروں جوتا سکلاتی سوہے   رے
نجر لگ جائے نا   اللہ نجر لگ جائے نا
گلے میں ہنسلی سینے پہ ڈھلنا   ہاتھ میں کنگنا سوہے   رے
نجر لگ جائے نا   اللہ نجر لگ جائے نا

کتابی دنیا کا گیت کار بیسویں صدی میں دلی کی عورتوں کو بلاؤز اور جمپر کے بجائے 'چست قبائیں' پہنے ہوئے دکھاتا ہے لیکن عوامی گیتوں میں اپنے دور کے ملبوسات اور زیورات ہی نظر آتے ہیں۔ ایک لوک گیت میں جمپر اس طرح دکھایا گیا ہے:

بیل بیچ دے بھینس بیچ دے ساری جھمپر لادے
جے بس کی ترے بات نئیں مہارے گھر اں کندا دے
(سہارن پور)

ان گیتوں کے مطالعے سے اتنا اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ لوک گیت دیہی سماج سے رشتہ رکھنے کے باوجود شہری گیت کاروں کو بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکے اور ترسیل جذبات اور کیفیات کی ترجمانی میں اردو گیت کار لوک گیتوں کے طرز ادا کی پیروی کر رہا ہے اور وہ تشبیہات اور استعاروں سے کام لیتا ہے جو گرد پیش کی زندگی سے مستعار ہیں۔ یہ انداز فکر سید مقبول حسین احمد پوری، اندرجیت شرما، فرید مطلبی، آرزو لکھنوی، میراجی، زبیر رضوی وغیرہ کے گیتوں میں بڑی آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ بات صرف ہمارے گیتوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ آپ بنگلا گیتوں کا مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ دشرتھ رائے کی پانچالی اور کسی گان پر لوک گیت کار کے انداز فکر کا کتنا گہرا اثر ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ زبان میں الفاظ اور افعال وغیرہ بھی وہی لیے جا رہے ہیں جو لوک گیتوں میں استعمال ہو رہے۔

زبان کا مسئلہ اگرچہ نازک ہے لیکن اگر آپ اس میں تھوڑی سی لچک پیدا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو یہ مسئلہ بڑی سہولت سے حل ہوسکتا ہے۔ آپ غور فرمایئے کہ آپ کے سامنے دکن کی اردو ہے۔ میر اور سودا کی اردو، ناسخ اور آتش کی اردو، انیس اور دبیر کی اردو، سرسید اور محمد حسین آزاد کی اردو، ڈاکٹر اقبال اور مرزا غالب اور عہد حاضر کی اردو، ساتھ ہی ساتھ متروکات کی ایک طویل فہرست اور ان کے اصول بھی ہیں۔ ہم اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اردو زبان کے مختلف ادوار کے الفاظ، افعال اور لب و لہجے میں ایک نمایاں فرق رہا ہے اور یہ فرق تو آج بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بہار پنجاب، دکن، راجستھان، اودھ، یوپی وغیرہ کی اردو کا لب و لہجہ ان کے علاقوں کی غمازی کرتا ہے۔ ہم کو اور آپ کو اس کا بھی احساس ہے کہ اردو کے شاعروں، ادیبوں اور زبان دانوں نے بہت سے الفاظ بازاری اور ثقیل قرار دے کر معیاری اردو زبان کے دائرے سے خارج کر دیے ہیں مگر لوک گیتوں کی زبان چونکہ علاقائی اور مقامی ہوتی ہے۔ ان میں اس قسم کے الفاظ برابر موجود ہیں اور غالباً موجود رہیں گے۔

اردو والوں نے کھڑی بولی کے علاوہ دوسری لہجاتی بولیوں اور تحتانی زبانوں کو بھی منہ نہیں لگایا اور شعر و ادب میں جگہ نہیں دی البتہ گیت ضرور لکھے حضرت امیر خسرو و لمیر، خادم، وغیرہ کے گیت اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ برج بولی سنگیت کی زبان رہی ہے اور اسی لحاظ سے انھوں نے اُسے اختیار کیا۔

اپنے صوبے کی تحتانی بولیوں میں اسما، صفات، ضمائر اور افعال کی مروجہ صورتوں میں سے صرف کھڑی بولی کے اسما، صفات، ضمائر اور افعال کو اختیار کیا گیا، مثلاً:

(1)	(2)	(3)	
ساجن	سجنا	سجنوا	
ندی	ندیا	ندیوا	
باور	بدرا	بدروا	
چھوٹا	چھٹکا	چھٹکوا	
بڑا	بڑکا	بڑکوا	بڑوار
لالا	للکا	للکوا	
گیا	گوا	گو	گئل۔گیلا
آتا ہے	آیت	آوتے	آوت،
آوے گا	آئب	ائی ہئی	
میں	موں	موں	
میرا	مورا	مہارا	

آج کے اردو گیت کاروں کی ذہنیت کا اندازہ کیجیے کہ وہ نمبر 2 کے اسما اور کبھی کبھی اور کہیں کہیں نمبر 3 کے اسما بے تکان استعمال کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ انھیں اس کا احساس ہے کہ سنگیت پر نمبر 2 اور نمبر 3 کے اسما کھڑی بولی کے اسما اور صفات کی بہ نسبت آسانی سے رکھے جاسکتے ہیں اور یہ وہ لوچ اور نزاکت پیدا کرسکتے ہیں جو موسیقی کے سرگم اور گیتوں کا تقاضا ہے۔

بدریا، نگریا، نندیا، سنوریا، سجنوا، ندیا وغیرہ بلکہ بعض گیتوں میں افعال بھی تحتانی زبانوں کے مل جاتے ہیں، جو لوک گیتوں میں آتے ہیں:

میت موہے ناسی ملن میلا میں

کتابی اردو گیتوں کے ساتھ ساتھ لوک گیت فلمی گیتوں پر بھی اثر انداز ہو رہے ہیں:

میں میکے چلی جاؤں گی تم دیکھتے رہیو

اور:

سنوریا سے موسے ناہیں بنی رے
بلاؤ ڈولیا میں تو میکے چلی رے
ہم دونوں کی تکرار میں جھمکا گرو رے

اور:

بریلی کے بازار مورا جھمکا گرو رے
ساون بیتا جائے پیا نہیں آئے

اور:

تری دو ٹکیوں کی نوکری سرا لاکھوں کا ساون بیتا جائے

اور بہتیرے ایسے فلمی گیتوں اور لوک گیتوں کو سامنے رکھیے تو اندازہ ہوگا کہ لوک گیت دیہی سماج سے رشتہ رکھنے کے باوجود شہری سماج میں رہنے بسنے والے گیت کاروں کو متاثر کر رہے ہیں اور وہ لوک گیتوں کی زبان اور انداز فکر اپنا رہے ہیں۔

لوک گیتوں کے مضامین

لوک گیتوں میں کیا ہوتا ہے اور ان کے مضامین کیا ہیں؟ اس کا جواب تو لوک گیتوں کا تفصیلی مطالعہ ہی دے سکتا ہے پھر بھی سرسری طور پر آپ یوں سمجھ لیجیے کہ لوک گیت دیہی زندگی کے بھرپور ترجمان ہیں بچے کی پیدائش سے لے کر موت تک جو کچھ رسمی طور پر ہوتا رہتا ہے گیتوں میں سب کچھ ملتا ہے۔

بچہ ابھی پیدا نہیں ہوا۔ حاملہ کی کیا کیا خواہشات ہوتی ہیں وہ کیا چاہتی ہے سب کچھ آپ کو ملے گا۔ ساس بہو کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھتی ہے بہو تیرا دل کیا چاہتا

ہے وہ املی، نارنگی، جامن، لیمو، لڈو، پیڑا، کھیر، ملائی کی فرمائش کرتی ہے۔ ماں لڑکے سے کہتی ہے جا کہیں سے نارنگی توڑ لا۔ وہ جاتا ہے اور پکڑا جاتا ہے۔ اس کی بہن جب سنتی ہے تو بھاوج کو طعنہ دیتی ہے اور یہیں سے نند بھاوج کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ آپ دو بد گیت سنیے آپ کے سامنے سب کچھ آ جائے گا۔

بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے ننہال والوں کو خصوصیت سے اطلاع دی جاتی ہے اور:

میں نے چھپوا دیے اخبار للا تیرے ہونے کے
بہرئی بجنی بدھائی ہم سب مل   رنگ رنگ سریاں گاویں
چھاتی دھلائی کٹوری لونگی   تو لٹ دھلائی روپیا
پاؤں دھلائی کی چیری لونگی   تو خصم چڑھن کو گھوڑا
نندیا جو آئے گی کاجل لگا دے گی
نندیا چھنار کنگنا لینے آئی   کرتا بھی لائی ٹوپی بھی لائی
درزی خصم سنگ لائی   نندیا چھنار بدھاوا لائی

سریاں، سوہر، سہلو گیت پڑھیے بچے کی پیدائش کے سارے رسومات آپ کے سامنے ہوں گے پھر آپ پالنے پر جھولتے ہوئے بچے کو سلانے یا بہلانے کے لیے یہ میٹھے میٹھے بول سنائی دیں گے:

چندا ماما دور کے للا کو دیکھیں گھور کے
آجاری نندیا آ کیوں نہ جا
مرے للنا کی آنکھوں میں گھل مل جا

اس کے بعد شادی کی نوبت آتی ہے۔ منگنی سے لے کر بنا، بنی، دھن چھوا، دنت رنگا، ٹونا اور گالیاں تک سنائی دیں گی۔ رخصتی کے گیت بڑے دردناک ہوتے ہیں جن کو بابل کہتے ہیں:

مورے بنے کو مت دیکھو   نجر لگ جائے گی
بنا پہنے جوڑا جوڑے پہ جامہ سوہے
ٹیکے پہ نجریا لگ جائے گی   نجر لگ جائے گی
نازک ہے نادان ترے بازو بند ڈھیلے بنری
ماتھے ترے ٹیکا سوہے لڑیاں ہیں انمول تیری
نازک ہے نادان...

خوانگی زندگی میں ساس بہو کی کشمکش، نند کے طعنے، چغل خوری، ساس سسر کے رعب داب کی کہانی، ماں، باپ، بھائی کی پیار بھری یاد، میکے جانے کی خواہش، شوہر سے بے پناہ محبت بہو کے صبر و شکر کا جذبہ، اور اسی طرح کی بہتیری باتیں معلوم ہوں گی۔

کے من کوٹوں بھیا کے من پیسوں رے نا
ساس کھانچی بھر بسنا منجاوے رے نا
ساس پنیا پاتال سے بھراوے رے نا
بھیا کے من ریندھوں رسوئیا رے نا

اس سلسلے میں شادی بیاہ اور دوسری تقریبوں پر کھانے کی ایک طویل فہرست ملے گی۔ دیہاتیوں کی سیر چشمی دیکھیے کہ بعض کھانے شاید خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں مگر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کے لیے رنگ رنگ کے کھانے پیش کرنے کے آرزومند رہے ہیں عام کھانوں میں ساٹھی کے چاول، مونگ کی دال، ستو، سکھرن، مٹھا، گڑ، گھی، ودھ دہی، گھی کی پوری، کچوری، کڑھی، دہی بھات، سویا میتھی کا ساگ اور آلو پاڑ، اچار، کھٹائی یہاں تک تو غنیمت تھا مگر گیتوں میں عجیب عجیب نام آتے ہیں ایک گیت جو تلسی داس گمنوار کا بنایا ہوا ہے اس کی رو سے کھانوں کے نام پڑھیے:

مال پوا، پوچی پیڑا، برفی، لڈو، امرتی، کھاجا، گپ چپ، مکھن برا، جلیبی، پیٹھا، اندرسا، بوندی، بتاشا، کھرچن، کھویا، پکوڑی، پاپڑ، رس گلا، ترکاریوں میں ساگ پات سے لے کر کوئی ایسی نہیں جس کا ذکر نہ ہو۔ پھلوں اور میوہ جات میں جو چیز جہاں کی مشہور ہے۔ وہیں سے منگائی گئی ہے سلہٹ کی نارنگی، پریاگ کا امرود، کاشی کا لنگڑا، اس ضمن میں لکھنؤ کی دسہری، اور ملیح آباد کا سفیدہ ذکر سے محروم رہ گیا ہے۔

یہی حال ملبوسات اور زیورات کا ہے۔ لہنگا، لگرا، اوڑھنی، دوپٹا، پٹو، شال، دوشالا، چنزی، انگیا، جھلیا، کرتی، چولی، دھوتی، انگوچھا، پاگ، پگڑی، پکیا، ٹپکا، انگا، انگرکھا، جامہ، جھنگھرا۔

زیورات میں ٹیکا، بندیا، جھومر، کیٹا، کٹھیا، ہار، گلوبند، بُندا، بجلی، نتھ، کیل، بیر، بازو بند، نونگا، چوڑی، چھنی پچھیلا، کردھنی، پایل، جھانجھ، انوٹ، بچھوئے وغیرہ۔

موسمی گیتوں میں آپ کو ساون کی بہاریں، کالے کالے بادل، رم جھم بارش، بجلی کی تڑپ، کوندھے کی چمک، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا وغیرہ کے بیانات ملیں گے۔

کوڑیاں کھول دو ساجن   موری لال چنریا بھیگی جائی

موسمی گیتوں میں ساونی اور بارہ ماسوں کو خاص مقام حاصل ہے۔ ساونیاں عورتوں اور بارہ ماسے مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور کجری دونوں گاتے ہیں، جس کے اکھاڑے جمتے ہیں۔ جھٹکے بازیاں ہوتی ہیں، طنز و مزاح کے جذبات منظر پر آتے ہیں۔

جھولا پڑا ہے اور عورتیں پینگیں لے لے کر الاپ رہی ہیں:

کاگا اڑ اڑ جا دَکھنا   جہاں مورے بنا براج ہے
جھک جارے بدرا   برس کیوں نہ جائے
سن لے موری یک بتیا   مورے بیرن سے کہیو جائے
ساون آیو بہنا دیکھے راہ   اُہی کو آئی لئی جائے
برنا کی چمکے اودی پگیا
بہنی کی چمکے دھنی چنریا
جٹھانی سناوے کج بول
کیا تیرا برنا پھٹھس نا چنریا
بھیا مزارے سبز رنگ پہنا دے چوریاں
کالے رنگ میں ناپہروں منرا ساون آیو رے
نیلے رنگ میں ناپہروں نندرنگ بھایو رے
بھیا منرارے پہنادے سبز رنگ چوڑیا

ان گیتوں میں دیہی عورتوں کے وہ عقائد جھلکتے ہیں جن کا مذہب سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو، مگر ان کے لیے مذہب سے کم نہیں۔ کوئی منت مراد پوری ہوئی ہے۔ چھٹی چھلا ہے یا بارات کی تقریب، نہا دھو کر پاک صاف ہو کر، اچھے کپڑے پہن کر بیٹھ جاتی ہیں۔ کونڈے یا کٹھار میں گندھا آٹا رکھا ہے، کڑھائی چولھے پر رکھی ہے۔ ایک نے

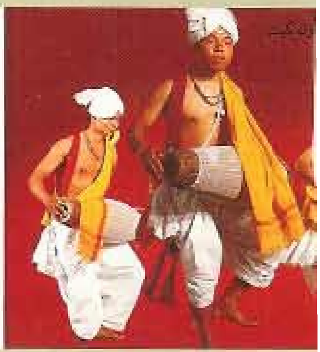
...لوک گیت

اُڑیا لوک گیت

گجراتی لوک گیت

گلگلا ڈالا۔ ڈھولک ٹھنکی اور یہ بول گونجنے لگے:

الّاہ میرے ہمیں نہ دل سے بھول
مولا میرے ہمیں نہ دل سے بھول

اور یہ التجا ختم نہ ہوئی تھی کہ یہ بول سنائی دیے:

جوئیں جن بیتوں الّاہ تیرے آؤں کی جونیا
زلفن سے گلیاں بڑھور رے بیتوں

رات رات بھر جاگ کر اسی طرح کے گیت گاتی رہتی ہیں اور گاتی ہوئی مسجد کے طاق بھرنے جاتی ہیں۔ رت جگا اور خدائی رات جس میں خدا کی یاد گیت گا گا کر کی جاتی ہے۔

کسی بزرگ خدا رسیدہ کا عُرس ہے۔ گاگریں آرہی ہیں اور چادر چڑھائی جارہی ہے اور قوال ہارمونیم کے سروں پر یہ بول نکال رہا ہے:

یہ چادر فاطمہ کی ہے جو میلی ہو نہیں سکتی

رنگ شریف، قال اور قوالی گیتوں کے وہ اقسام ہیں جو عوام میں بے حد مقبول ہیں۔ دھوبیوں کے سروں، گھوسیوں کے چہکروں، کہری، لاونی، خیال، چکووں کے پچڑوں میں آپ کو وہ گیت ملیں گے جنھیں آپ نعت اور منقبت کے پاس رکھ سکتے ہیں۔

دہے شہدائے کربلا کے مصائب اور دشمنوں کے ظلم وتشدد کے ترجمان ہوتے ہیں:

چھن چھن رن بیچ چلے تروریا
الّاہ رے چلے تروریا
سید کے کٹ گئے بازو
الّاہ رے کٹ گئے بازو
منہ بیچ تھامے کھڑے توریا
الّاہ رے تھامے کھڑے توریا

گیتوں میں حسن وعشق کے جذبات، ہجر کی تڑپ، وصال کی آرزو، معشوقانہ ناز وانداز سبھی قسم کے مضامین ملیں گے:

لل کے جھولو آپہ اسک بھیو دل جانی
تورے گورے گلوا پے قربان
تیرے ماتھے کی ٹکلیا مارے جان

اسلام میں ذات پات کی تفریق نہ ہونے کے برابر ہے، مگر ہندوستانی اور خصوصیت سے اپنے راج کے مسلمانوں میں پیشوں کے لحاظ سے بھتیری ذاتیں بن گئی ہیں اور انھیں پشت اقوام کے گروہ میں ڈال دیا گیا۔ پیشہ ورذاتوں میں گدیوں کے چہکروں گھوسیوں کے برہوں، ماور اور دفالیوں کے سہلوں، بزقصابوں اور بقرقصابوں کے بیچپروں، دھوبیوں، بنجاروں، میواتیوں وغیرہ کے گیتوں کے مضامین میں ایک عجیب سا تنوع ہے۔ جہاں نعت ومنقبت (سمروں) سے لے کر مثنوی طرز کی عشقیہ داستانیں، غازی میاںؒ اور دوسرے اولیاء اللہ کی کشمکشوں وغیرہ تک کے مضامین ملیں گے۔ ساکھاؤں میں سیاسی جنگوں، 1857 اور اسی قسم کے دوسرے ہنگاموں اور حادثات کے بیانات ملیں گے۔ یہ بات ہمارے لوک گیتوں کے ساتھ ہی موقوف نہیں ہے۔ ہندوسان کی دوسری زبانوں کے لوک گیتوں کا بھی یہی حال ہے۔ بنگلا زبان میں الکاپ گیت اور جاری (زاری) گیت پڑھیے آپ کو انگریزوں کے ظلم وستم، نیز بغاوت وغیرہ کے مضامین ملیں گے۔ جاری ہمارے صوبے کے دہوں اور شہیدیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ جاری کا ایک ٹکڑا پڑھیے:

چل چل چل بے سمرقندے جابو
اِجدے ماریا بے سموورے بھاسابو
سا باس ساباس ساباس بھائیو

(چلو ہم سب مل کر سمرقند چلیں۔ اور اجدے (یزید) کو مار کر سمندر میں پھینک دیں، شاباش بھائیو شاباش)

یہاں کے دہوں کے مثل بنگلا جاریوں میں بھی بعض باتیں الٹ پلٹ کر کہی گئی ہیں۔ جاری کار، دمشق یا کربلا کے بجائے سمرقند جاتا ہے۔

لوک گیت کار اس معاملے میں بڑا حساس نظر آتا ہے اور وہ معمولی معمولی ہنگامی حادثات کو گیتوں کا روپ دے دیتا ہے۔ کوئی پچاس باون سال پیشتر ایک فرقہ وارانہ فساد ہوگیا لوک گیت میں اس کا روپ دیکھیے:

کٹھن لڑائی مڑھیا ہوگئی املی مجہت کے درمیان
الّاہ اکبر نعرہ ماریں سب دل تڑی بڑی ہو جائیں
ہوآں سے بھاگے سب دل سنگھ بھوانی پہنچے جائے
ہوآں سے بھاگے سب حلوائی کھنجا کوٹ پہ لوٹو جائے
دھیرے دھیرے پکّھا آویں اپنا حال لگے کہان
انچ کے لاٹھی ان کے ماریں وہ تو گرد برد ہو جائیں
یہاں کی باتیں کیتنی چھوڑو تکتے کا سنو جوال
دولوٹ لین بھنگن نے سب دیوتلیا ماں دئی بہائے
سن سن اینٹیں چالیں اڑدھا چلے بیچ میدان
جو اڈھا ہاتھی کے لاگے چنگھر چنگھر رہ جائیں

لوک گیتوں کے افراد

ساس تو اِے بھیّا بڑھیا ڈوکریا
آج مرئے کی کالھ رے
نندی تو اِے بھیّا بن کی کوکلا
آج اُڑے تو کی کالھ رے
جٹھانی تو اِے بھیّا کاری بدریا
چھن برسے چھن گھام رے
دیورانی تو اِے بھیّا کونے کی بکریا
چھن نکرے چھن بیٹھے رے

(اودھی لوک گیت)

ساس تو بیرا چولھے کی آگ
نند جھاوں کی بے جلی . . .
سورا تو بیرا کالا سا ناگ
دیور سانپ سنپولیا
جیٹھا تورے بیرا بچھو کا ڈنک
اپلے پاتھن ڈس جائے جی
راجا تورے! بیرا منہدی کا پیڑ
کدی رچے رے! کدی نا رچے

(کوروپردیش۔ کھڑی بولی کا لوک گیت)

□

ماخذ: اترپردیش کے لوک گیت **مصنف:** اظہر علی فاروقی، سنہ اشاعت: 1981، دوسرا اڈیشن: 1998، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اختر الواسع

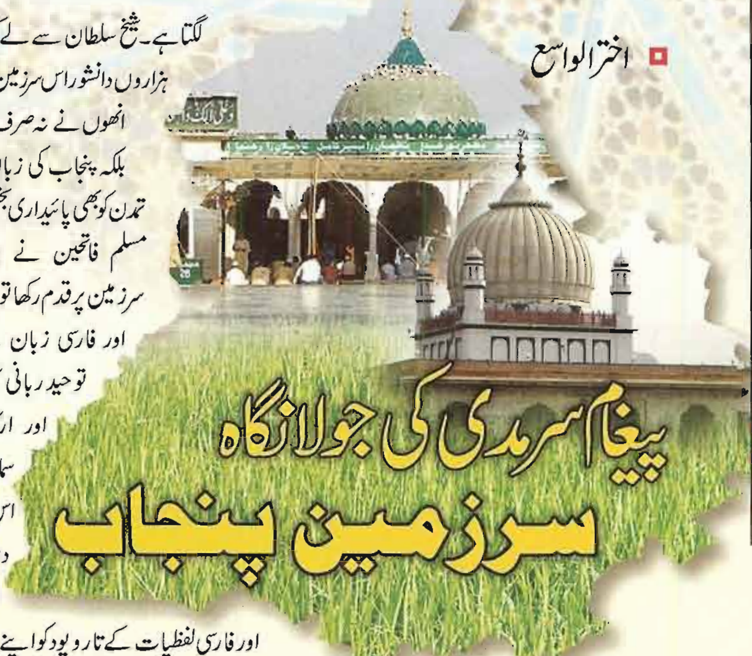

پیغام سرمدی کی جولانگاہ
سرزمین پنجاب

پنجاب کی سرزمین کو پانچ دریاؤں کا آب زلال سیراب کرتا ہے اور اس آب زلال کے جلو میں فکر و آگہی اور عرفان و وجدان کے نئے سوتے بھی پھوٹتے ہیں دریاؤں کا پانی زمین کو زرخیز بناتا ہے اور وہ زرخیزی ذہن و دل کو بالیدگی عطا کرتی ہے اور اس بالیدگی سے اس فکر تازہ کی نمو، جلوہ گر ہوتی ہے جو قدیم ہندوستان کی استعاراتی زبان میں سرسوتی کی نمود کہلاتی ہے اور اس فکر تازہ کے تخیل سے رگ وید کے ملکوتی زمزموں کی نمود ہوتی ہے پنجاب کے اس زرخیز ذہن کو وہ ملکوتی اور پائیدار بلند خیالی عطا ہوئی جس کی منور فضا ہمیشہ نور و نکہت اور علم و عرفان سے روشن ہو رہی اور ثنائے ربانی دلنواز نغموں سے روح کو تازگی عطا کرتی رہی۔

پنجاب کی اس سرزمین کو علم و عرفان سے کچھ خاص مناسبت ہے اس لیے یہاں جیسے زندہ دل اور بیدار مغز دانشور پیدا ہوئے ان کی نظیر کہیں اور نظر نہیں آتی۔ یہاں ہم اساطیری روایات سے قطع نظر دیکھتے ہیں کہ پانی (Panini) جیسا زیرک یہیں پیدا ہوا جس نے علم و عرفان کی وہ جوت جگائی جو آج بھی روشن ہے یہاں روحانیت اور جوگ کی قدیم ترین روایت موجود ہے یہاں بھگت پون مل جیسے درویش نے جنم لیا اور پنجاب میں اسلام کی آمد کے بعد تو جیسے اس سرزمین کو متاع گم شدہ مل گئی ہو اس کے بعد یہاں علما صوفیہ، دانشور اور شاعروں کی اتنی بڑی تعداد اور ہر زمانے میں ان کی نمود نظر آتی ہے کہ بے ساختہ دل عظمت پنجاب کے ترانے گانے لگتا ہے۔ شیخ سلطان سے لے کر علامہ اقبال تک ہزاروں دانشور اس سرزمین پر پیدا ہوئے اور انھوں نے نہ صرف خاک پنجاب کو بلکہ پنجاب کی زبان اور پنجاب کے تمدن کو بھی پائیداری بخشی۔

مسلم فاتحین نے جب پنجاب کی سرزمین پر قدم رکھا تو اپنے ساتھ، عربی اور فارسی زبان لے کر آئے اور توحید ربانی کا بے مثال تصور اور ارکان اسلامی کی سماجی دولت لے کر اس سرزمین پر وارد ہوئے پنجاب کی فضاؤں نے عربی اور فارسی لفظیات کے تار و پود کو اپنے دامن میں سمیٹ کر نیا آہنگ عطا کیا جو اور آگے چل کر دہلی پہنچتے پہنچتے اردو زبان جیسی خوبصورت زبان میں ڈھل گیا۔

گیارہویں اور بارہویں صدی میں ایسے شواہد ملتے ہیں کہ زبان پنجابی ہے لیکن لفظیات فارسی ہے اور بولنے والے مسلمان ہیں اس سے بڑھ کر لاہور کے ایک عظیم دانشور مسعود سعد سلمان کے بارے میں تمام تذکرہ نگاروں نے بھی اور ان کے پہلے متبع امیر خسرو نے بھی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ انھوں نے ہندوی زبان میں ایک دیوان لکھا تھا۔ جو یقیناً پنجابی زبان میں ہوگا چوں کہ وہ خود پنجاب میں تھے اور اس وقت ہر مقامی بولی ہندوی کہلاتی تھی۔ اس طرح بوعلی شاہ قلندر جیسے عظیم صوفی اور فارسی کے بے مثال شاعر کے ملفوظات میں کچھ ہندوی جملے ملتے ہیں جو دراصل پنجابی ہیں۔ مثلاً ایک جملہ ہے ''ترکا کچھ سمجھ دا ہے'' یہ خالص پنجابی جملہ ہے اور اردو کی اولین نمود ہے۔

ہندوستان کے ساتھ عربوں کے روابط قدیم زمانے سے چلے آرہے تھے اور ساحلی علاقوں میں ان کی بستیاں بھی عہد رسالت سے ہی قائم تھیں لیکن یہ بستیاں زیادہ تر تاجر پیشہ عربوں کی تھیں اور روابط کی نوعیت بھی تاجرانہ ہی تھی۔ عرب اور ہندوستان کے علمی روابط کا آغاز سندھ اور پنجاب سے ہوتا ہے۔ سندھ میں راجہ داہر کی فوج میں عرب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ملازم تھی اور سندھ کے فتح ہوجانے کے بعد ان مسلمانوں کی ایک جماعت پنجاب میں آکر آباد ہوگئی اس طرح پنجاب میں عرب اہل علم کی آمد شروع ہوئی اور اسلامی روحانیت اور احسان کے رجحانات بھی پنجاب میں اپنا اثر و نفوذ دکھانے لگے۔

بغداد میں نویں اور دسویں صدی ہجری میں تصوف کا ارتقا شروع ہوا اور اس کے بعد رفتہ رفتہ بغداد کے باہر بھی تصوف پھیلنے لگا اور تشنگان روحانیت تصوف کے دامن میں اپنی روحانی سیرابی حاصل کرنے لگے۔ تصوف کی ایک عظیم شخصیت حضرت داتا گنج بخش لاہوری متوفی 1080ھ لاہور تشریف لائے داتا گنج بخش ایک عظیم صوفی اور ہندوستان میں تصوف اور روحانیت کے بانی تھے داتا صاحب کا ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ تصوف کا ذخیرہ ان سے پہلے عربی زبان میں تھا اس لیے تصوف و روحانیت کی روایت بھی عرب علاقوں میں ہی رائج تھی اور عرب کے باہر اس روایت کا نفوذ زیادہ نہیں تھا۔ عام لوگوں تک تصوف کی رسائی نہیں تھی اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ تصوف کی روایت عربی زبان میں تھی اور عام لوگ عربی زبان سے واقف نہیں تھے۔ حضرت داتا گنج بخش شیخ ابوالحسن علی الہجویری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تصوف کی اس روایت کو عرب علاقے اور عربی زبان کے دائرے سے باہر نکال کر عوام تک پہنچایا اور یہ امتیاز اسی خاک پنجاب کو حاصل ہے کہ یہ عظیم کارنامہ ایران و افغانستان میں نہیں بخارا و سمرقند میں نہیں، تبریز و اصفہان میں نہیں بلکہ پنجاب کی اس سرزمین پر انجام پایا کہ تصوف کی روایت کو خواص کے دائرے سے نکال کر عوام تک پہنچایا اور فارسی زبان میں تصوف کی پہلی کتاب لکھی گئی۔ کشف المحجوب فارسی زبان میں تصوف کی پہلی کتاب ہے جو لاہور میں لکھی گئی۔

حضرت داتا گنج بخش صرف پنجاب نہیں پورے ہندوستان بلکہ پورے مشرق کے وہ عظیم صوفی ہیں جن کے کارناموں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور صوفیہ کرام نے ہمیشہ ان کے آستانے کو عظمت و حرمت کے ساتھ یاد کیا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہندوستان تشریف لائے تو پہلے لاہور کے اس مبارک آستانے پر جبہ سائی کی۔ علامہ اقبال نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے فارسی شعر میں اس طرح اظہار عقیدت کیا ہے:

سید ہجویر مخدوم امم
مرقد او پیر سنجر را حرم

''سید ہجویری جو امتوں کے مخدوم ہیں ان کا مرقد پیر سنجر یعنی خواجہ معین الدین چشتی کے لیے حرم کا درجہ رکھتا ہے۔''

بلکہ خود حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے اس آستانے کی تعریف اس طرح کی ہے

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

''حضرت گنج بخش، دنیا کا فیض ہیں اور نور خدا کے مظہر ہیں وہ ناقصوں کے لیے پیر کامل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور کاملوں کے رہنما ہیں۔''

علامہ اقبال نے خاک پنجاب کو بھی خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی آمد سے پنجاب کی سرزمین زندہ ہوگئی علامہ کا شعر ہے:

خاک پنجاب از دم او زندہ گشت
صبح ما از مہر او تابندہ گشت

''پنجاب کی مٹی ان کے وجود سے زندہ ہوگئی اور ہماری صبح اس آفتاب سے روشن ہوگئی۔''

حضرت داتا گنج بخش کی فیض رسانی تو خاک پنجاب کو ایسی حاصل ہوئی کہ آج تک ان کے وجود سے اس خاک کو زینت اور فیض رسانی ہے لیکن خاک پنجاب نے اور بھی گہر ہائے آبدار پیدا کیے جن میں ایک اہم نام حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کا ہے حضرت بابا صاحب نے انسان دوستی اور روحانیت کی جوت ایسے وقت میں جلائی جب وہاں اس کی سخت ضرورت تھی بابا فریدالدین کے وجود سے خاک پنجاب ایک مرتبہ پھر جگمگا اٹھی اور اس کی روشنی میں انسانیت کا بھولا ہوا درس لوگوں نے پھر سے یاد کیا۔ انھوں نے بتایا کہ جو تجھے اذیت دے تو اس کے جواب میں اس کو اذیت نہ پہنچا اور اپنے دشمن کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کی۔ انسانی زندگی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انسان کو پیدا ہونے میں تو چاہے چھ مہینے لگتے ہوں لیکن مرنے میں صرف ایک لمحہ لگتا ہے موت آتے ہی یہ جسم خاک کا ڈھیر ہوجاتا ہے اس لیے زندگی جب تک ہے اس کو غفلت میں نہ گزاریں۔ اور آنے والے وقت کی تیاری کریں۔

بابا فریدالدین کا ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ جس طرح داتا صاحب نے تصوف کو فارسی زبان میں منتقل کر کے اس کا دائرہ فارسی بولنے والوں تک وسیع کیا تھا اس طرح داتا صاحب نے اپنی تعلیمات کے لیے پنجابی زبان کو اختیار کر کے تصوف اور روحانیت کی روایت کو ہندوستان کی سرزمین پر عام کیا اور خاک پنجاب کو اس روشنی سے منور کیا ان کا کلام لوگوں کے دلوں کو چھو گیا اور ان کی تربیت سے ہزاروں تشنگان روحانیت نے سیرابی حاصل کی۔ اجودھن کی سرزمین کا خمیر وہ بابرکت خمیر ہے جس نے آگے چل کر ہندوستان کی تہذیب کو مالا مال کیا بابا فریدالدین کے پنجابی کلام کو آدی گرنتھ صاحب میں جگہ ملی اور اس طرح سکھ اور مسلم روایات میں یگانگت اور ہم آہنگی کی فضا قائم ہوئی۔ ان کے خلیفہ حضرت نظام الدین اولیا نے اس روایت کو پورے ہندوستان میں پھیلایا اور امیر خسرو جیسے عظیم المرتبت انسان کی تربیت کی جو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا سب سے درخشندہ ستارا ہے۔

بابا فریدالدین کے بعد اس سرزمین پر حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتی نے اس روحانیت کو اپنے انداز واسلوب اور اپنی وسعت ظرفی کے ذریعے سینچا اور فصیح و بلیغ زبان کے ذریعے عام کیا اور لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے اپنی عظمت کے نقوش چھوڑ گئے۔

پنجاب کے دوسرے صوفیہ حضرت شمس الدین ترک نارنولی حضرت فخرالدین لاہوری، سید احمد ترمذی، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی، حضرت میاں میر لاہوری جیسے متعدد صوفیہ گزرے ہیں جنھوں نے اپنے علم و حکمت اپنی روحانیت سے اس سرزمین کو عظمتیں عطا کیں اور ان کا وجود پنجاب کی عظمتوں کا ضامن ہے۔

پنجاب کے صوفیہ کا ذکر ہو اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کا تذکرہ نہ کیا جائے تو ناانصافی ہوگی پنجاب کی سرزمین پر جنم لینے والے یہ واحد صوفی ہیں جن کا فیضان مشرق و مغرب دونوں طرف پھیلا اور جن کی جوت جس طرح آج ہندوستان کو منور کررہی ہے اسی طرح افغانستان، تاجکستان، آذربائیجان، ترکی بلکہ مصر تک میں روشن ہے اور ان کے مکتوبات سے آج بھی ہر جگہ فیض اٹھایا جاتا ہے اور ان کے نام اور کام پر یورپ کے ملکوں میں اور امریکہ میں بھی مسلسل ریسرچ و تحقیق کا کام جاری ہے۔

پنجاب کے صوفی شعرا شاہ حسین، عبداللہ عبدی، ہیر رانجھا کے تخلیق کار وارث شاہ، بابا بھلے شاہ، شیخ بہاء الدین برناوی، حاجی محمد نوشہ پنجابی، شیخ عثمان جالندھری اور بکٹ کہانی کے مصنف افضل پانی پتی جیسے لوگ شامل ہیں جنھوں نے علم و دانش اور عرفان و حکمت کے اسرار و رموز کی اپنی شاعری کے ذریعے ایسی عقدہ کشائی کی ہے کہ جس میں خدا کی بزرگی، انسانی ذات کی نفی اور اس کائنات میں موجود ہر شے کی تکریم اور معنویت کا غیر معمولی سبق ملتا ہے۔ ان شعرا نے نہ صرف پنجابی زبان کو شہرت دوام بخشی اس کے واسطے سے تصوف، روحانیت اور عشق حقیقی کے پیغام کو بھی پنجاب میں عام کیا۔

پنجاب کی زندہ دل اور زرخیز سرزمین سے ایک ایسی صدا بھی بلند ہوئی جو روحانیت، جوگ اور فنائیت کے اس مقام تک پہنچی کہ شاید اس کے اوپر اور کوئی بلندی نہیں ہے اور وہ وہی شخصیت ہیں جن کے بارے میں پنجاب کے قومی شاعر علامہ اقبال نے کہا تھا:

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

اس مرد کامل یعنی گرونانک دیو مہاراج نے پنجاب کی اس روحانی روایت کو درجہ کمال تک پہنچایا اور توحید ربانی اور مساوات انسانیت کا جو درس مختلف صوفیہ اور صلحا دے رہے تھے اس کو یکجا کر کے پنجاب کے خمیر سے ایک پوری قوم تشکیل دے ڈالی۔ بابا نانک کا پیغام اتنا دلنشیں، پراثر اور دیرپا تھا کہ مرور ایام کے ساتھ اس کی عظمت میں مزید روشنی آتی گئی اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ پیغام ملکوں اور زبانوں کی سرحد سے بھی پار ہوگیا۔

پنجاب کی سرزمین میں سانجھے چولہے سے سانجھی سنسکرتی تک کے جو مناظر اور مظاہر ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں وہ شمولیت پسندی مذہبی رویوں میں بھی بخوبی دیکھنے کو مل سکتی ہے وفاداری بشرط استواری جس کو صوفیہ کی غالب اکثریت اصل ایمان قرار دیتی ہے وہ ہمیں گرو ارجن سنگھ دیوجی مہاراج کے یہاں عملی طور پر اس وقت مجسم نظر آتی ہے جب گولڈن ٹیمپل کی بنیاد رکھنے کے لیے قادریہ سلسلے کے عظیم صوفی بزرگ میاں میر کو وہ لاہور سے بلاتے ہیں۔

یا پھر خود گروگرنتھ صاحب اس شمولیت پسندی کے جذبے کا ایک لازوال نمونہ ہیں جس میں بلاتخصیص مذہب و ملت ذات پات اور علاقے کی تفریق سے اوپر اٹھ کر طریقت کے اصولوں، بھکتی کی پرمپرا اور گرووں کی روایت کو نہ صرف یکجا کردیا گیا ہے بلکہ برصغیر میں علم و عرفان کی تمام بصیرتوں کا عطر گروگرنتھ صاحب کی صورت میں موجود ہے۔

پنجاب میں تصوف اور روحانیت کے معماروں کا یہ مختصر سا تذکرہ ہے اس کا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ خاک پنجاب نے کیسے کیسے درشاہوار پیدا کیے جنھوں نے مختلف اوقات میں اس سرزمین پر اور اس کے واسطے سے پورے ملک بلکہ بیرون ملک تک روحانیت اور انسانیت کا پیغام پہنچایا ان کے دم سے اس خاک کو وہ عظمتیں ملیں کہ شاید ہندوستان کا کوئی اور خطہ پنجاب کا ہم سر نہیں ہے۔

پنجاب کی زرخیز زمین نے زمانہ ماقبل از تاریخ سے آج تک اس ملک کی تہذیب و ثقافت، تمدن اور روحانی روایت کے فروغ میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے اور تصوف و روحانیت کے یہ معمار دراصل عظمت پنجاب کے ضامن ہیں جنھوں نے یہ غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔

□

Prof. Akhtarul Wasey
Professor, Deptt. of Islamic Studies & Hony. Director, Zakir Husain Institute of Islamic Studies JMI, (A Central University) New Delhi - 110025
Vice-Chairman, Delhi Urdu Academy (Govt. of NCT Delhi)

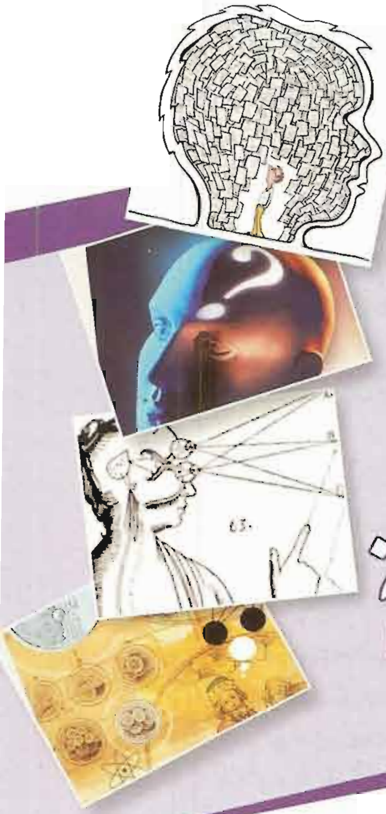

ریحانہ سلطانہ

تاریخ کی تعریف اور فلسفیانہ نظریاتِ تاریخ

تاریخ کو عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ماضی کے واقعات کو ایک مرتب اور منظم طریقے سے بیان کرنے کا فن ہے اور یہ عظیم ہستیوں اور بادشاہوں کے حالات اور جنگی واقعات کو بیان کرتی ہے۔

تاریخ کا یہ نظریہ عام طور پر سبھی تسلیم کرتے ہیں، لیکن دراصل گہرائی سے مطالعہ کرنے پر تاریخ کا جو نظریہ سامنے آتا ہے اس میں طبقاتی جدوجہد کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور تاریخ کا مادی نظریہ جسے کارل مارکس نے بتایا حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔

تاریخ کا مادی نظریہ Theory of Historical Materialism یہ بتاتا ہے کہ تاریخ کے ہر عہد میں جو تصادم ہوتے ہیں وہ مادی وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے ہوئے ہیں جیسا کہ جدید عہد میں جنگِ عظیم اول اور جنگِ عظیم دوئم میں ہوا، پیداواری وسیلوں پر قبضہ کرنے کے لیے جنگیں ہوئی ہیں اور پیداوار کا سب سے بڑا وسیلہ زمین تھی۔ زیادہ سے زیادہ زمین پر قبضہ کرنے کے لیے اور دولت لوٹنے کے لیے محمود غزنوی، محمد غوری، بابر، اکبر، شاہجہاں، اورنگ زیب نے زیادہ تر حملے کیے اور اس کے بعد انگریزوں نے نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال، بہار اور اڑیسہ پر قبضہ کرلیا۔

1856 میں اودھ پر قبضہ کر کے نواب واجد علی شاہ کو گرفتار کر کے کلکتہ بھیج دیا، آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ کو قید کر کے رنگون بھیج دیا تھا۔

ٹیپو سلطان پر حملہ کر کے انھوں نے میسور پر قبضہ کرلیا، سکھوں پر حملہ کر کے پنجاب پر قبضہ کرلیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام مادی ذرائع، پیداواری وسائل دولت اور زمینوں پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان سے کچا مال روئی اور لوہے وغیرہ انگلینڈ بھیج دیا کرتے تھے اور وہاں سے تیار کیا گیا کپڑا اور لوہے کا سامان اونچے داموں پر ہندوستان میں فروخت کیا جاتا تھا، اس طرح سے انگریزوں نے بے شمار دولت کمائی اور برطانیہ دنیا کا امیر ترین ملک بن گیا۔

تاریخی طاقتوں اور تاریخی شخصیات کے ذریعے جو واقعات رونما ہوچکے ہیں، وہ اس وقت کے حالات، حادثات اور موقعوں کے مطابق تھے لیکن یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ حالات اگر دوسرے ہوتے تو ان کے علاوہ بھی اور دوسرے واقعات ہونا ممکن تھے، تاریخ میں عروج و زوال ضرور آتے ہیں لیکن تاریخ کا سفر آگے کی طرف ہی ہوتا رہتا ہے۔ یہ سفر ایک سیدھی لکیر میں نہیں ہوتا، یعنی اس میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں کبھی کوئی قوم یا ملک عروج حاصل کرتا ہے اور کبھی کسی کا زوال ہوجاتا ہے اور دوسرے ملک اور قومیں عروج پر آجاتی ہیں۔ تاریخ کا یہ کھیل ہمیشہ جاری رہتا ہے، لیکن اس عروج و زوال کے کچھ اسباب ضرور ہوتے ہیں۔ انسان کی غلطیاں اور کمزوریاں پانسا پلٹ دیتی ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ ایک طاقتور دھارے کی طرح ایک خاص سمت میں سفر کرتی ہے اور اس دھارے کے خلاف تیرنے والے تباہ اور فنا ہوجاتے ہیں، تاریخ کے دھارے کو کوئی شخص نہیں روک سکتا، وہ جس سمت میں بہہ رہا ہے، افراد کو بھی اسی سمت میں چلنا پڑتا ہے، یہ کہا جاتا ہے کہ:

"History is the march of God on earth."

یہ تاریخ، یہ زمانہ، خدا کا بنایا ہوا ہے، اس کی سمت بھی اسی نے مقرر کی ہے، اسی لیے خدا کہتا ہے کہ زمانے کو برا مت کہو، زمانہ ہم نے بنایا ہے، تاریخ اسی سمت کی طرف سفر کرتی ہے، جس طرف خدا اسے لے جانا چاہتا ہے، اسی طرح مذہب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ:

"History's course is predetermined."

جسے مذہب قضا وقدر کہتا ہے:

یورپین ملکوں نے اٹھارہویں صدی میں صنعتی میدان میں زبردست ترقی کی تھی، نئی نئی ایجادیں کی، نئے نئے اسلحہ ایجاد کیے، ہوائی جہاز ایجاد کے بعد ایک زبردست ہتھیار ان کے پاس آگیا، جس نے جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا، تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں زندگی بہت سادہ تھی اور جب کھیتی کرنے کا زمانہ آیا، شکاری زندگی کا خاتمہ ہوا تو انسان ایک جگہ رہنے لگا، جنگلوں میں بھٹکنا چھوڑ دیا اور شکار کے پیچھے مارے مارے پھرنا اس نے بند کردیا، اس نے بڑے بڑے کھیت بنائے، اس میں اناج اگائے اور اسے کھانے سے فراغت حاصل کی، اس

نے گھر بنائے، جس میں وہ سکون سے رہنے لگا، اس کے بعد دولت، جائیداد اور صنعتوں نے اس کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ایک انقلابی دور شروع ہوا، یہ زیادہ تر ان جگہوں پر شروع ہوا جہاں بڑی بڑی ندیاں تھیں، جن کے کنارے عظیم تہذیبوں نے جنم لیا، مثلاً دریائے نیل کے کنارے مصری تہذیب کا ارتقا ہوا اور دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے کنارے میسوپوٹامیا اور بے بی لون کی تہذیبوں نے جنم لیا، گنگا جمنا اور سندھ کے کنارے آریہ تہذیب وجود میں آئی، چین میں ہوانگ ہونڈی کے کنارے چینی تہذیب کا ارتقا ہوا اور اسی عہد میں تحریری زبان وجود میں آئی اور تاریخیں لکھی جانے لگی، قدیم دور کا عظیم ترین تاریخ داں Herodotus یونان کا رہنے والا تھا، اس عہد میں یونانی تہذیب نے زبردست ترقی کی اور یورپین تہذیب کی بنیاد اسی یونانی تہذیب پر رکھی گئی جس نے جمہوریت کو فروغ دیا۔

بودان اور گروٹی اس (Grotius) نے فلسفۂ تاریخ کو پیش کیا، Bodin ایک فرنچ قانون داں تھا، اس نے جو تفسیر فلسفۂ تاریخ پر لکھی اس کا نام ہے، Method an Socialism Historitarun جس کے معنی ہیں تاریخ سمجھنے کا آسان طریقہ۔ اس کے فلسفۂ تاریخ کا بہت گہرا اثر پڑا، اس نے بتایا کہ جغرافیائی حالات قومی کردار سے تاریخ کا کتنا گہرا تعلق ہے، اس نے لوگوں کو سیاسی اداروں اور جماعتوں کی تاریخ اور ان کے تدریجی ارتقا کی طرف متوجہ کیا اسی لیے اس کا شمار تاریخی نقطۂ نظر کے بانیوں میں کیا جاسکتا ہے، اس نے بتایا ہے کہ تاریخ میں انسانی زندگی اور تاریخی اداروں میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ہوتی رہنی چاہیے کیونکہ انسانی فطرت کا یہی تقاضہ ہے اور انسان شروع سے ہی تنزل کی طرف نہیں بلکہ ترقی کی طرف گامزن رہا ہے، مملکت کے قیام کے بعد ہی پختہ اصول جود میں آئے اور مملکت کا وجود گونا گوں ضرورتوں کی وجہ سے عمل میں آیا اور اس کے قیام میں جبر و تشدد اور قوت کو خاصا دخل ہے۔ مملکت کی پہچان متقدر اعلیٰ کی قوت سے ہوتی ہے۔

تاریخ ان متقدرِ اعلیٰ کی جدوجہد اور کشمکش سے پیدا ہوتی ہے۔ قانون سازی کا اختیار بھی متقدرِ اعلیٰ کو حاصل ہے۔ Thomas Hobbes کی تصنیف Leviathan 1691 میں شائع ہوئی، اس نے بتایا کہ تاریخ سازی کا کام انسان ہی کرتا ہے کیونکہ اس کے پاس عقل اور فہم کی بیش بہا دولت ہے، تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو انسان کی سرشت، جبلت اور سیرت کی عام خصوصیات کا علم ہوتا ہے، اس کے خیال میں قدرت نے تمام انسانوں کو ذہنی اور جسمانی قوت کے لحاظ سے یکساں بنایا ہے، کیونکہ سب کی قابلیت برابر ہوتی ہے اس لیے ان کی خواہش بھی برابر ہوتی ہے اور سب ان کے پورے ہونے کی امیدیں بھی برابر رکھتے ہیں، انسان میں مقابلے کی عادت ہوتی ہے اور وہ دوسرے انسانوں سے اپنی بڑائی اور برتری منوانا چاہتا ہے، اس کے لیے جدوجہد اور کشمکش اور جنگ کرتا ہے لیکن وہ دائمی جنگ کے حالات کو اچھا نہیں سمجھتا، اسے ختم کرنا چاہتا ہے، اس لیے وہ مملکت کے قیام کو ضروری سمجھتا ہے اور اس کی سیاسی تنظیم پر توجہ دیتا ہے، اس لیے انسانی سرشت میں خوف و لالچ کو بنیادی خصوصیات بتایا ہے، وہ یہ تسلیم نہیں کرتا ہے کہ انسان بنیادی طور پر شریف ہوتا ہے۔

تاریخ کا مادّی نظریہ Theory of Historical Materialism یہ بتاتا ھے کہ تاریخ کے ہر عہد میں جو تصادم ہوئے ہیں وہ مادی وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے ہوئے ہیں جیساکہ جدید عہد میں جنگ عظیم اوّل اور جنگِ عظیم دوئم میں ہوا، پیداواری وسیلوں پر قبضہ کرنے کے لیے جنگیں ہوئی ہیں او ر پیداوار کا سب سے بڑا وسیلہ زمین تھی۔ زیادہ سے زیادہ زمین پر قبضہ کرنے کے لیے اور دولت لوٹنے کے لیے محمود غزنوی، محمد غوری، بابر، اکبر، شاھجھاں، اورنگ زیب نے زیادہ تر حملے کیے اور اس کے بعد انگریزوں نے نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال، بہار اور اڑیسہ پر قبضہ کرلیا۔

تاریخ اسی کشمکش، جدوجہد اور جنگوں کا نام ہے، فلسفۂ تاریخ ہمیں بصیرت عطا کرتی ہے، Thally نے Kant کے خیالات کو پیش کرتے ہوئے، انسان کی عقل و فہم اور اس کے Pure-reason کو اہم قرار دیا اور انسانی آزادی کو اہمیت دی اور یہ بتایا کہ انسان فطری قوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہوا نہیں ہے، جب انسان اپنے دماغ سے کام لیتا ہے تو وہ اپنے اعمال کا ایک ایسا جال بنتا ہے، جس میں اسباب و نتائج شامل ہوتے ہیں اور انسان اپنی جبلتوں، خیالات، تربیت اور تعلیم اور اپنی سرشت کے مطابق کام کرتا ہے، لیکن اس کے اعمال کی اصل بنیاد عقل اور فہم پر منحصر ہے اور انسان جذبات سے بعد میں کام لیتا ہے۔ (A History of Philosophy by Frank Thally P, 434)

Kant کا تاریخ کا نظریہ اپنی جگہ درست ہے لیکن Herder نے زیادہ تر Nationalism کے مسئلے پر توجہ دی، تاریخ میں نیشنلزم کی اہمیت کو اجاگر کیا اور نیشنلزم ہی جرمنی کی آئیڈیلزم (Idealism) اور ہیگل کی فلاسفی کی بنیاد ہے۔

ہیگل کا تاریخی نظریہ یہ ہے:

"Contradiction is the root of all life and movement that the principal of contradiction rules the world again, everything tends to change to pass over into its opposites." (A History of Philosophy of Rank Thally p 479)

ہیگل نے تمام ارتقا کو Dialectical Method کے ذریعہ بتایا، جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ:

"We begin with an abstract universal concept 'thesis'. This concept gives rises to a contradiction 'antithesis'. The Contradictory concepts are reconciled in the third concept thesis which therefore is the union of the other to which is called 'synthesis'. (A History of Philosophy by Frank Thally P. 481)

اس طرح ہیگل کا تاریخی نظریہ یہ ہے کہ دو متضاد خیال یا دو چیزوں کے ٹکرانے سے تیسرا خیال یا تیسری چیز پیدا ہوتی ہے، ایک نئی صورتِ حال دو متضاد چیزوں کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ نئی صورت حال پھر دو متضاد ٹکڑوں میں تقسیم ہوجاتی ہے، اس طرح تاریخ کا سفر جاری رہتا ہے۔

ہیگل نے تاریخی ارتقا کا جو نظریہ دیا وہ کائناتی اصول ہے اور آفاق کی ہر ایک شئے پر نافذ ہوتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سچ ہوجاتی ہے کہ دو متضاد قوتیں ٹکراتی ہیں اور ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوجاتی ہے۔

ہیگل کے اس تاریخی نظریے کا گہرا اثر پڑا، اس نے جس Idealism کو اختیار کیا اور ایک مطلق

Absolute Idea کا تصور دیا، اس نے جرمن، تاریخ اور سیاست پر گہرے اثرات ڈالے، جرمنی میں نازی پارٹی اور اٹلی میں فاشسٹ پارٹی کا جنم ہوا جس نے مطلق العنان حاکم کا تصور دیا، جس کی وجہ سے جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی کا عروج ہوا اور ان دونوں نے دوسری جنگِ عظیم کو شروع کیا اور انگلینڈ، فرانس، امریکہ کی اتحادی ملکوں سے جنگ کی، اتحادی ملکوں میں پھر روس بھی شامل ہوگیا، چونکہ ہٹلر نے روس پر سخت حملہ کیا تھا اور آخر میں روس نے ہی مشرق کے محاذ سے جرمنی پر حملہ کیا اور مغربی محاذ سے اتحادی ملکوں انگلینڈ، فرانس اور امریکہ نے حملہ کیا، جرمنی اور اٹلی کو شکست دی، اس طرح ہیگل کا جو تاریخی نظریہ تھا وہ غلط ثابت ہوا، دنیا نے ایک نئی کروٹ لی، مطلق العنان ڈکٹیٹروں کا زمانہ ختم ہوا اور جمہوریت یعنی Democracy کو عروج حاصل ہوا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیگل کے تاریخی تصور نے کارل مارکس کے تاریخی نظریات کو قوت پہنچائی۔ مارکس نے ہیگل سے ہی جدلیات کا تصور لیا لیکن اس میں زبردست تبدیلی کر کے جدلیاتی تصور کے بجائے جدلیاتی مادیت کا وہ نظریہ دیا جس نے تاریخ کا رخ ہی بدل دیا اور ادب و سیاست کو بھی جس نے بے حد متاثر کیا، ہیگل نے تصور یا خیال کو پہلے سب سے اوپر رکھا اور مادہ میں تبدیلی خیال کے ذریعے قرار دی، لیکن مارکس کا کہنا تھا کہ پہلے مادہ کا وجود ہوتا ہے اور ہر خیال مادے کا رہینِ منت ہوتا ہے، اس کی دلیل یہ تھی کہ ابتدا میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا ذہن سادے کاغذ کی طرح ہوتا ہے، اس میں کوئی خیال نہیں ہوتا ہے، وہ جس گھر میں پیدا ہوتا ہے، اس کے ماحول سے ہی سب کچھ سیکھتا ہے، اگر کسی ہندو کے گھر میں پیدا ہوتا ہے تو وہ بڑا ہوکر پوجا کرتا ہے، تلک لگاتا ہے اور گوشت نہیں کھاتا اور اگر کوئی مسلمان کے گھر پیدا ہوتا ہے تو وہ نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے، اگر اس کی صحبت خراب ہے یا اس کے ماں باپ گالیاں دیتے ہیں، چوری کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں تو وہ بچہ بھی یہ سب سیکھ لے گا، اگر اس کے ماں باپ عالم ہیں، شریف ہیں تو بچہ بھی ویسا ہی بنے گا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ماحول خیالات پیدا کرتا ہے، اس کی یہ بھی دلیل تھی کہ اگر ایک بچے کے سامنے جو بالکل معصوم ہے آگ کا انگارہ ڈال دیا جائے یا جلتی ہوئی موم بتی اس کے سامنے رکھ دی جائے، چونکہ اس نے کبھی آگ دیکھی نہیں ہے، اس لیے وہ انگارے کو پکڑے گا اور جب ہاتھ جلے گا تو اس کا تصور اس کے ذہن میں پہنچے گا کہ یہ آگ ہے جلا دیتی ہے، پہلے سے اس کے ذہن میں یہ خیال نہیں تھا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مادے سے خیال پیدا ہوتا ہے اور اصلی ترقی مادی ترقی ہوتی ہے، روحانی ترقی نہیں ہوتی، کیونکہ روح جیسی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں، جس کا کوئی وجود ہی نہیں اس کی ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مارکس نے لکھا تھا:

"It is not the consciousness of man that determine his existence but on the contrary it is his social existence that determines his existence."

> تاریخ ان مقتدرِ اعلیٰ کی جدوجہد اور کشمکش سے پیدا ہوتی ہے۔ قانون سازی کا اختیار بھی مقتدرِ اعلیٰ کو حاصل ہے۔ Thomas Hobbes کی تصنیف Leviathan 1691 میں شائع ہوئی، اس نے بتایا کہ تاریخ سازی کا کام انسان ہی کرتا ہے کیونکہ اس کے پاس عقل اور فہم کی بیش بہا دولت ہے، تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو انسان کی سرشت، جبلت اور سیرت کی عام خصوصیات کا علم ہوتا ہے، اس کے خیال میں قدرت نے تمام انسانوں کو ذہنی اور جسمانی قوت کے لحاظ سے یکساں بنایا ہے، کیونکہ سب کی قابلیت برابر ہوتی ہے اس لیے ان کی خواہش بھی برابر ہوتی ہے اور سب ان کے پورے ہونے کی امیدیں بھی برابر رکھتے ہیں

اس کا مطلب یہ ہوا کہ شعور وجود کو متعین نہیں کرتا بلکہ سماجی وجود شعور کو متعین کرتا ہے، مارکس نے ہی تاریخ کا وہ نظریہ دیا جسے تاریخی جبریت کہتے ہیں، یعنی تاریخ کے دھارے کو کوئی بھی اپنی مرضی کے مطابق تبدیل نہیں کرسکتا بلکہ تاریخی دھارا اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ وہ افراد قوموں اور ملکوں کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کردیتا ہے، تاریخ اور وقت کے متعلق یہ جبریہ نظریہ بتاتا ہے کہ It is the march of God on earth۔ مارکس کا تاریخی نظریہ بتاتا ہے کہ سماج کی بنیاد معاشیات پر رکھی گئی ہے اور تاریخ کا وہ نظریہ بھی پیش کیا جسے Economic Interpretaton of History یعنی تاریخ کا معاشی نظریہ کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق سماج کی بنیاد معاشیات پر رکھی گئی ہے اور اس کی جو بالائی عمارت ہے، یعنی Super Structure، وہ قانون، ادب، سیاست، رسم و رواج اور معاشی بنیاد پر ہی کھڑی رہتی ہے، جیسے ہی معاشی بنیاد بدلتی ہے، یہ بالائی عمارت یعنی ادب، سیاست، قانون، رسم و رواج، معاشرت، تہذیب سب کچھ بدل جاتا ہے، جو نہیں بدلتے ہیں، انھیں تاریخ پیچھے چھوڑ دیتی ہے اور تاریخ کے کوڑے دان میں انھیں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ افراد ہوں یا اقوام سبھی کو بدلتی ہوئی معاشیات کا ساتھ دینا پڑتا ہے، ورنہ وہ پسماندہ ہوجاتے ہیں اور پیچھے ڈھکیل دیے جاتے ہیں، کیونزم کا یہ تاریخی نظریہ سائنٹفک نظریہ ہے اور اسی لیے تاریخ میں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔

شوپن ہار Schopenhauer کا تاریخی نظریہ "The world as will and Idea" اور نیتشے Nietzsche کا تاریخی نظریہ "The will to power." اب اتنا اہم نہیں رہا، لیکن بینتھم اور مِل، ہاربٹ اسپنسر اور کارل مارکس کا تاریخی نظریہ زیادہ اہمیت اختیار کر گئے ہیں، تاریخی شعور حقائق کی بنیاد پر کھڑا رہتا ہے، لیکن حقائق کی تعبیر، تفسیر اور تشریح کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے، کچھ فلاسفر اور تاریخ داں حقائق پر ہی زور دیتے ہیں۔

ان تمام نظریات سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخی حقائق کو ہر ادیب اور فلاسفر اپنے نظریے سے دیکھتا ہے اور اپنے ذہن، اپنے معیار اور اپنے ماحول، تربیت، علم۔ پسند اور ناپسند کو اس میں ضرور شامل کردیتا ہے۔ لیکن حقائق کو بالکل بدلا نہیں جاسکتا، مثلاً یہ تاریخی حقیقت ہے کہ 1947 میں تقسیم وطن کی وجہ سے پاکستان ایک علیحدہ وطن بنا، فسادات ہوئے، اور اب ان فسادات کے بارے میں کس کا کیا مقصد تھا، کون اس کا ذمہ دار تھا، مسلم لیگ اور کانگریس نے تقسیم وطن میں کیا حصہ لیا، اس پر الگ الگ رائے ہوسکتی ہے۔

اردو میں قرۃ العین حیدر نے اپنے نظریہ سے تاریخ کو دیکھا اور ان کے تاریخی شعور کا معیار اور ان کی سمت کا اندازہ لگانے کے لیے ان کا ناول 'آگ کا دریا' بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

■

Dr. Rehana Sultana, Faculty Associate, Gautam Buddha University, Greater Noida

راغب اختر

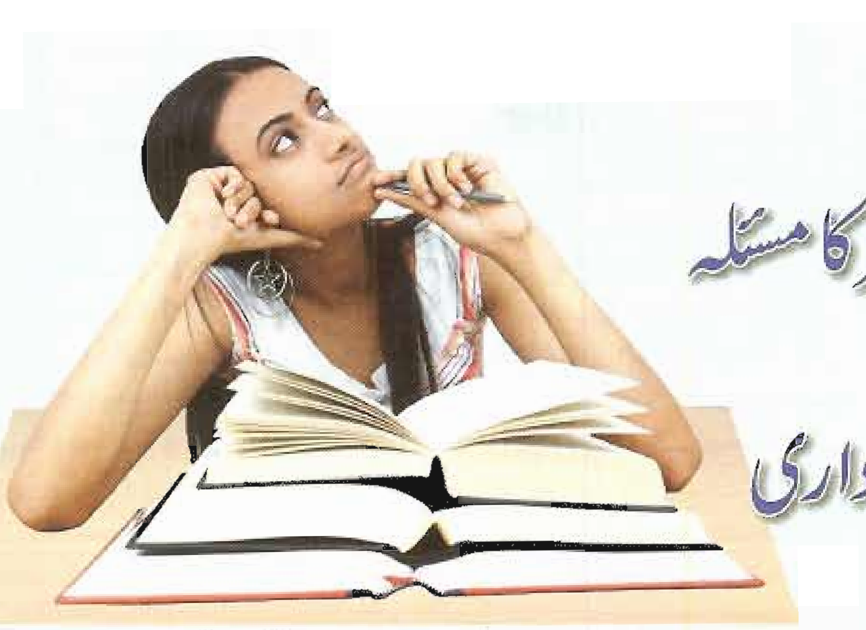

نئی نسل کے کیریئر کا مسئلہ اور والدین کی ذمے داری

ہم جس دور میں جی رہے ہیں یہ دور ایک پیچیدہ دور ہے جہاں مختلف قدریں ایک دوسرے میں ضم ہیں اور انسان کسی بھی واضح نقطۂ نظر تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ ایسے میں زندگی گزارنے کے لیے وسائل اور وسائل کی فراہمی کے لیے روزگار ایک اہم مسئلہ ہے جس پر موجودہ دور میں بہت زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ہندوستانی معاشرہ ہر چند کہ یورپ اور امریکہ جیسی طرز زندگی کا متمنی نظر آتا ہے تاہم اس کی فکر ابھی ان معاشروں سے میل نہیں کھاتی۔ ابھی بھی ہمارے معاشرے میں کسی کام کو چھوٹا یا بڑا سمجھنے کی سوچ موجود ہے اور اسی حوالے سے اس کام کے کرنے والے کا معاشرے میں مرتبہ بھی۔

بدلتے اقدار سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ہمارے لیے یہ بھی اہم ہے کہ ہم بچوں کی پرورش میں زیادہ سے زیادہ منہمک ہوں اور ساتھ ہی ہمیں ان کی نفسیات کو بھی نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کے اوپر مزید دباؤ ڈالنے کی جگہ ان کی زندگی کو بہتر بنانے میں ہم ان کی مدد کرسکیں۔ بچہ اپنے ابتدائی ایام سے ہی اپنی دلچسپی کسی خاص شعبے میں ظاہر کرتا ہے جو اکثر دیرپا نہیں ہوتی اور پھر وہ اپنی دلچسپی کا میدان بدل لیتا ہے لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شعبے میں اس کی دلچسپی دیرپا ہوتی ہے تاہم اس کے والدین یا دیگر بزرگ اس کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بچے کی پسند کے شعبے سے متعلق وسائل مہیا کیے جائیں تاکہ وہ ابتدا سے ہی اپنے ذہن کو متعلقہ شعبے سے ہم آہنگ کر سکے۔ مثال کے طور پر اگر بچہ ایک خاص عمر کے بعد بھی طبی علوم سے متعلق سوالات کرتا ہے یا اس میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتا ہے تو والدین کو چاہیے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اس کے سوالات کے جواب دیں بلکہ اسے اس شعبے سے متعلق مختلف ساز و سامان بھی مہیا کریں تاکہ وہ اپنی دلچسپی کو فروغ دے سکے اور اس کو باضابطہ کیریئر آپشن میں بدل سکے۔ دوسرا دور بچے کی تعلیم سے متعلق ہے جہاں بچے کو یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص شعبے میں اپنا کیریئر بنانے کے لیے کس قدر اہل ہے۔ یہاں بھی والدین کو چاہیے کہ وہ سب کچھ بچے پر ہی نہ چھوڑ دیں بلکہ اسے اس کے سبجکٹ سے متعلق معلومات فراہم کریں تاکہ حصول تعلیم اس پر بار نہ ہو بلکہ ایک دلچسپ مشغلہ ہو۔ یہ بات ذہن نشین کرنا بے حد ضروری ہے کہ اکثر بے حد ذہین بچے ایک خاص عمر کے بعد مطالعے سے جی چرانے لگتے ہیں اور زیادہ تر یہ معاملہ بچے کی اور تعلیمی نصاب کے فرق سے پیدا ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ والدین نصاب کی کتابیں خود پڑھ کر بچے سے اس پر گفتگو کریں۔ گاہے گاہے اس کی Answer Sheet بھی دیکھیں اور اگر اسے کہیں وقت پیش آ رہی ہے تو اس کی مدد اس کی سرزنش کے بغیر کریں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک منزل کے بعد ماں باپ بچے کی مدد سے قاصر ہوں کیوں کہ بچہ جس شعبے میں دلچسپی رکھتا ہے والدین اس شعبے سے نابلد ہوں ایسے میں کسی اتالیق کا انتظام کیا جانا چاہیے لیکن اتالیق کے ساتھ والدین مسلسل رابطے میں رہیں اور بچے سے بھی یہ معلوم کرتے رہیں کہ آیا وہ اپنے نصاب کو وقت پر پورا کر پا رہا ہے یا نہیں۔

والدین کے لیے یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ بچوں کے مستقبل سے متعلق فیصلہ کرتے وقت ان کی پسند کا خیال رکھا جائے نہ کہ اپنی پسند کا۔ ہوسکتا ہے بچہ اپنے لیے جس شعبے میں روزگار تلاش کر رہا ہو وہ آپ کو پسند نہ ہو لیکن آپ اس کے ساتھ مل کر اس شعبے سے متعلق معلومات فراہم کریں اور جس حد تک ممکن ہو اسے اس کی پسند کا کیریئر چننے میں مدد کریں۔ اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ آپ کے پسند کے شعبے میں اگر وہ بادل ناخواستہ چلا بھی جاتا ہے تو اس کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس کے حصے میں ایک اوسط درجے کا کیریئر آئے گا اس کے برعکس اگر وہ اپنی پسند کے شعبے سے جڑتا ہے تو وہ اس شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دے سکتا ہے جو اس کی ذات ہی نہیں ملک و قوم کے بھی مفاد میں ہوگا۔ والدین کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مستقبل سے متعلق بچے کو اپنی رائے کا اظہار کرنے دیں اور بوقت ضرورت اسے اپنا مشورہ بھی دیں تاکہ اسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ایک سے زیادہ شعبوں میں دلچسپی لے اور کئی بار ایک شعبے سے اس کی دلچسپی جلد ہی ختم ہو جائے جو ایک فطری فعل ہے تاہم یہ جاننے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ آیا ایسا اس نے اس شعبے سے متعلق مطالعہ کرنے کے بعد کیا ہے یا صرف کسی دوست یا شناسا کے کہنے سے کیا ہے۔ بچے کو اس بات پر آمادہ کریں کہ جس شعبے میں اس کی دلچسپی ہے اس سے متعلق تحقیق کرے تاکہ اس کے مستقبل کے حوالے سے اس کا ایک واضح Vision ہو۔

نوجوانوں کے لیے یہ دور اپنے اندر روزگار کے بے شمار مواقع بھی رکھتا ہے لیکن اس کا انحصار نوجوان نسل پر ہے کہ وہ ان سے کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔ کچھ تو

روزگار کے روایتی وسائل ہیں ہی لیکن بعض غیر روایتی مواقع بھی یہ دور فراہم کرتا ہے جن کے بارے میں صدفی صد یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کامیاب ہوں گے ہی تاہم اگر کامیابی ملتی ہے تو آپ کو اس میدان میں پہلے داخل ہونے کا فائدہ ضرور ہوگا۔ مثال کے طور پر ہم Hotmail کے بانی سبیر بھاٹیا کو لیں جس نے کمپیوٹر کے شعبے میں ہی ایک نئی ٹکنالوجی پر کام کیا اور ایک بے حد کامیاب پروفیشنل کے طور پر ہم اسے جانتے ہیں۔ کنسلٹنسی (Consultancy) اور ایونٹ مینجمنٹ (Event Management) کے میدان کی بھی مثال دی جاسکتی ہے جو حال ہی میں ایک انڈسٹری کے طور پر ابھر کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔

کیریئر کے تعین کے سلسلے میں نوجوانوں کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ ایک بار اپنا احتساب کریں کہ خود ان کے اندر کس کام کی بہتر صلاحیت ہے۔ پھر وہ تحقیق کریں کہ جس شعبے میں وہ اپنے لیے روزگار کے مواقع تلاش کر رہے ہیں اس سے متعلق تعلیم کا حصول کس طرح ممکن ہے۔ کیونکہ بعض صلاحیتوں کو پوری طرح اسی وقت بروئے کار لایا جاسکتا ہے جب اس سے متعلق کوئی سند ہمارے پاس ہو۔ ایسے میں ضروری ہے کہ متعلقہ شعبے میں کورسز فراہم کرنے والی متعلقہ جامعات اور اداروں کی تفصیل سے واقفیت ہو۔ بعض شعبوں میں کورسز کے لیے وسائل کی بہت زیادہ ضرورت نہیں ہوتی لیکن بعض کورسز کے لیے خطیر رقم کی ضرورت ہوتی ہے ایسے میں طالب علموں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات کی بھی تحقیق کریں کہ وہ جو کورس کرنا چاہ رہے ہیں اس کی تکمیل کے لیے ریاستی یا مرکزی حکومت کے ذریعے انھیں قرض مل سکتا ہے یا نہیں کیونکہ بشمول IIM اور IIT بہت سے ایسے ادارے اور جامعات ہیں جن کے اہلیتی امتحان میں کامیابی کی صورت میں بہت ہی آسان شرطوں پر حکومتی قرض دستیاب ہے۔ حکومت کی یہ پالیسی اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ کسی ذہین طالب علم کو محض وسائل کی تنگی کی وجہ سے کسی میدان میں اپنی قسمت آزمانے سے محروم نہ رہنا پڑے۔

آج اس بات سے آگاہی بھی ضروری ہے کہ کسی خاص سبجیکٹ یا فیلڈ میں کیریئر کے کیا مواقع ہیں اور اس کے لیے بہتر تعلیم کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ خاص شعبہ جات اور ان کے ذیلی شعبوں کی نشاندہی درج ذیل جدول میں کی گئی ہے:

ہیومنیٹیز Humanities	کیمیا Chemistry	طبیعات Physics	حیاتیات Science Life	ریاضی Mathematics
تعلیم (Teaching)	کیمیکل انجینئرنگ (Chemical Engineering)	ایسٹروفزکس (Astro Physics)	سیلولر بایولوجی (Cellular Biology)	سوفٹ ویئر انجینئرنگ (Software Engineering)
جرنلزم (Journalism)	ایگریکلچرل کیمسٹری (AgriculturalChemistry)	بایوفزکس (Bio Physics)	مولیکولر بایولوجی (Molecular Biology)	بینکنگ (Banking)
اسکرپٹ رائٹنگ (Script Writing)	بایوکیمسٹری (Bio Chemistry)	فائبر اوپٹیکل فزکس (Fiber Optical Physics)	فزیولوجی (Physiology)	تعلیم: Teaching)
بشریات (Anthropology)	کیٹالیسس (Catalysis)	فلوئڈ فزکس (Fluid Physics)	مائکروبایولوجی (Micro Biology)	مینجمنٹ (Management)
آرکیولوجی (Archeology)	انوائرنمنٹل کیمسٹری (Environmental Chemistry)	جیوفزکس (Geo Physics)	انڈسٹریل بایولوجی (Industrial Biology)	معاشیات (Economics)
این جی او مینجمنٹ (NGO Management)	فورنسک کیمسٹری (Forensic Chemistry)	میٹریل فزکس (Material Physics)	بایوٹکنولوجی (Biotechnology)	اقتصادیات (Commerce)
لائبریری سائنس (Library Science)	جیو کیمسٹری (Geo Chemistry)	میڈیکل، ہیلتھ فزکس (Medical Health Physics)	جینیٹکس (Genetics)	اسٹیٹکس (Statistics)
نفسیات (Psychology)	ان آرگینک کیمسٹری (Inorganic Chemistry)	مولیکولر فزکس (Molecular Physics)	فورنسک سائنس (Forensic Science)	بایوانفورمیٹکس (Bio Informatics)
سماجیات (Sociology)	میٹریل سائنس (Meterial Science)	نیوکلیئر فزکس (Nuclear Physics)	پلانٹ پیتھولوجی (Plant Pathology)	
سیاسیات (Political Science)	میڈیسنل کیمسٹری (Medicinal Chemistry)	اوپٹیکل فزکس (Optical Physics)	اوشینوگرافی (Oceanography)	
	آئل اینڈ پٹرولیم (OilandPetroleum)	پلازما فزکس (Plasma Physics)	بایوکیمسٹری (Biochemistry)	
	پلپ اینڈ پیپر کیمسٹری (Pulp Chemistry)	تعلیم (Teaching)	بایوانفورمیٹکس (Bio Informatics)	
	ٹکسٹائل کیمسٹری (Textile Chemistry)		انوائرنمنٹل سائنس (Environmental Science)	
	واٹر کیمسٹری (Water Chemistry)		ہرپیٹولوجی (Herpetology)	
			نیوروسائنس (Neuro Science)	

درج بالا جدول میں کیریئر کے جن ممکنہ مواقع کا حوالہ دیا گیا ہے وہ پوری طرح اپنے سبجکٹ کا احاطہ نہیں کرتے اور اس مضمون میں ان کا احاطہ کر پانا ممکن بھی نہیں ہے کیونکہ ان میں سے ہر سبجیکٹ کے لیے ایک طویل مضمون درکار ہے جس میں متعلقہ شعبے میں روزگار کے مواقع پر ہی بات نہ کی جائے بلکہ اس سے متعلق تعلیم کے حصول اور جامعات کے حوالے سے بھی بات کی جائے۔ یہ بھی بتایا جائے کہ ملک اور بیرون ملک میں اس شعبے میں روزگار کے مواقع کتنے ہیں۔ تعلیم پر کتنا خرچ آئے گا اور سرکاری یا غیر سرکاری طور پر حصول تعلیم کے لیے قرض حاصل کرنے کا طریقہ کار کیا ہوگا۔

□

Raghib Akhtar, 169, Sabarmati Hostel, JNU, New Delhi - 1100 67

مصنف: سدرشن وششٹ   مترجم: رشدیٰ خاتون

ہندی کہانی

ماں اور موبائل

کہانی بہت ہی ٹریڈیشنل ڈھنگ سے شروع ہوئی:

آج وکل بہت خوش تھا۔ چیڑ کے جنگل سے ہو آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی، چیڑ کے پتے دھیرے دھیرے ہل رہے تھے، ہوا ٹھنڈی اور خوش نما تھی۔ کہتے ہیں، چیڑ کے پتوں سے چھن کر آتی ہوئی ہوا ٹی بی کے مریضوں کے لیے بہت فائدے مند ہوتی ہے۔ وِکل نے ایک نظر پتا جی پر ڈالی، ان کی پیشانی پر سیاہ دھبے پڑ گئے تھے، ہاتھوں کی نسیں پرانے ربر کے پائپ کی طرح لٹکی ہوئی تھیں۔ جسم چھوہارے کی مانند سوکھنے لگا تھا۔ اس کے پرانے نائٹ سوٹ میں وہ اور بھی دبلے لگ رہے تھے۔ لفافہ جیسے کپڑوں میں وہ ایسے لگ رہے تھے جیسے کھیت میں بجوکا۔ وہ اچانک جھنڈے کی طرح لہرائے اور گرنے سے بچتے ہوئے بیٹھ گئے۔ آنگن کے کونے میں رکھے ہوئے اونچے پتھر پر وہ ٹانگوں میں سر دے کر پنجوں کے بل دھوپ سینکنے کے لیے اکڑوں بیٹھا ہے۔ گھر کے کام سے فارغ ہو کر ایسے ہی ماں بھی پرانی گدڑی سی بن جاتی تھی۔ آں ں... پتا نے کمزور مرغے کی طرح گردن اٹھائی اور دھیمی آواز میں جماہی لی۔ وکل کا بھی اچانک منہ کھل گیا... ایک دم ہوشیار ہو گیا۔ پتا جی نے جماہی لی ہے، اسے نہیں لینی چاہیے...

کوئی بھی مدیر ایسی گھسی پٹی شروعات دیکھ کر بغیر آگے بڑھے کہانی کوڑے دان میں پھینک دے گا۔ پہلے تو مدیر تک پہنچ ہی نہیں پائے گی۔ ماتحتین میں بھی کئی نائب مدیر، کار گزار مدیر ہوتے ہیں، جیسے گورنمنٹ میں سکریٹری کے ماتحت ایڈیشنل، نائب اور جوائنٹ سکریٹری رہتے ہیں۔ اس کے کہانی کردار کے پاس نہ لینڈ لائن ہے اور نہ موبائل، نہ ای میل ہے نہ کمپیوٹر، نہ ٹی بی۔ ہاں ٹی بی کا مریض ضرور ہے۔ آج بھی خبریں اس تک افواہوں کی طرح پہنچتی ہیں۔ فون کرنے اور چٹھی ڈالنے اسے پانچ کلومیٹر پیدل جانا پڑتا ہے اور ادھر بھارت نے پہلا سٹلائٹ چاند پر بھیج دیا ہے۔ چلو، ایک پچھڑی ہوئی کہانی ہی سہی، پریم چندی عہد کی حقیقت پسندی ہی سہی، لکھنا تو ضرور ہے، اس نے فیصلہ لیا۔ چھپ بھی گئی تو کون سا دھاکا ہوگا۔ ایک دم آئی گئی ہو جائے گی۔ کوئی یاد نہیں رکھے گا کہ وکل نام سے بھی کوئی کہانی لکھتا رہا ہے۔ دوست اب بھی ہنستے تھے، اس زمانے میں کوئی قصہ کہانی پوچھتا سنتا ہے کیا! اس ساری کشمکش کے دوران اس نے لکھنا شروع کیا:

پتا جی ویسے بے عیب تھے۔ تمباکو بیڑی سگریٹ نہ پیتے ہوئے بھی انھیں ٹی بی ہو گئی۔ کوئی کہتا، ماں سے لگی۔ ماں کے خاندان میں یہ بیماری تھی۔ ماں کو انھوں نے آخر تک اپنے سے دور نہیں کیا۔ پتا جی میں کچھ عادتیں تھیں جنھیں بری کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً — وہ دن میں بھی سوئے رہتے۔ بہت سست اور آہستہ آہستہ چلتے، بولتے بھی آہستہ جیسے کوئی دوسرا سن نہیں سکتا یا سن کر بھی ان سنا کر دیتا۔ دوکان سے سیدھے گھر اور گھر سے سیدھے دکان۔ کسی بات پر کسی کو کچھ نہیں کہتے۔ بہت سی باتیں، بہت سے کام وہ ٹال دیتے۔ بہت مرتبہ تو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے وغیرہ وغیرہ۔

وہ بالکل الگ بننا چاہتا تھا۔ صبح سویرے اٹھ جاتا۔ روز ورزش کرتا۔ کبھی کبھی دو مرتبہ بھی نہاتا۔ دن میں کبھی نہیں سوتا۔ ہمیشہ صاف ستھرے اور پریس کیا ہوا کپڑے پہنتا۔ جوتے چمکانے کے لیے جیب میں رومال کے علاوہ الگ سے ایک کپڑا رکھتا۔ ضرورت نہ ہونے پر بھی تیز چال سے چلتا جیسے نیتا لوگ ٹی وی میں چلتے ہیں۔ بلند آواز میں بولتا، چاہے بولنا ضروری نہ ہو۔ پتا جی کی عادتیں اس نے ایک چیلنج کی طرح قبول کی۔ سب سے بڑا چیلنج تھا چست درست، اور تندرست رہنا۔

بھاگ دوڑ سے ایک رات وقت نکال کر اچانک گھر گیا تو پتا جی نارمل لگے۔ بخار نہیں تھا، کھانسی بھی کم تھی۔ کمزور تو پہلے سے ہی تھے۔ چاچی کبھی کبھی ان کی تھالی میں کھانا ڈال دیتیں۔ چاچا کا بھرا پرا خاندان تھا، بیٹا، بہو، پوتے پوتیاں۔ گھر میں بچوں کی کلکاریاں گونجتی لیکن ان کے پاس کوئی نہیں آتا۔ پتا جی کا کمرہ پیچھے کے حصے میں گھر سے منسلک ہونے کے باوجود بھی بالکل الگ تھا۔ پتا جی نے یہی کمرہ لیا جس میں وہ پہلے سے رہا کرتے تھے۔ گھر کا آنگن آگے کی طرف تھا جہاں سورج کی کرنیں پڑتی تھیں۔ پیچھے کی طرف نالہ تھا اور اس پار چیڑ کا جنگل۔ کمرہ الگ ہوتے ہوئے بھی گھر میں بولنے، بچوں کے ہنسنے، رونے کی آوازیں آتیں جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے پورے خاندان کے ساتھ رہ رہے ہیں۔

کمپنی والے ایک پل بھی ٹکنے نہیں دیتے تھے۔ سرکاری دفتروں کی طرح صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ وہاں تو صبح حاضری لگانا ضروری ہوتا ہے بس۔ دن بھر ادھر ادھر گھومتے رہو۔ یہاں حاضری اور چھٹی کا تعین نہ ہونے کے باوجود ایک ایسا غیر مرئی شکنجہ تھا کہ وہ کسی بھی وقت خود کو ڈیوٹی سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔ کمپنی موبائل کے خرچ کے لیے ایک ہزار روپے مہینہ دیتی تھی جس کے عوض میں صبح چھ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک حاضری لگتی تھی۔ اچانک فون آتا، 'کہاں ہو اس وقت...' 'کتنے آرڈر ملے' '...فوراً سیکٹر سینتالیس پہنچ کر شوروم میں بات کرو' وغیرہ وغیرہ۔ اگر مس کال آنے پر فون نہیں کیا تو فوراً اکسپلانیشن Explonation... کال بیک کیوں نہیں کیا۔ جیسے موبائل نہیں، پیس میکر لگا دیا ہو۔

موبائل اسے ماں جیسے لگتا۔ ایک دم اپنا اور قریبی، جس کو سرہانے سر رکھ کر سویا جاتا، جسے ہر پل اپنے دل کے قریب رکھا جاتا۔ جس کی ہر بات سنی اور مانی جاتی۔ ماں کے وقت میں تو موبائل تھا ہی نہیں۔

موبائل کی اپنی ایک الگ زبان ہے۔ ٹریننگ کے دوران موبائل کی زبان سکھائی گئی تھی۔ بالکل شارٹ میں

لکھو۔ 'سی یو' کو اے بی سی والا 'سی' اور وائی او یو کی جگہ صرف 'یو' ٹائپ کرو۔ فوراً میسج کرو۔ فوراً فون اٹھاؤ۔ مس کال کا مطلب سمجھو۔ وہ خود بھی موبائل ہو گیا تھا۔ آج بچے سے بوڑھے تک، دہشت گردی سے تجارت تک موبائل ضروری ہے۔ اسے اسکوٹر چلانا بھی نہیں آتا تھا۔ کوئی بھی گاڑی چلانا یہاں پہلی شرط تھی۔ کنونس کے بغیر گزارا نہیں، جلدی سیکھو۔ لوکل سے سفر کرنے میں اس کا وقت زیادہ لگتا۔ ایک ساتھی نے یہیں اسکوٹر چلانا سیکھی۔ ایک مرتبہ وہ بھیڑ میں بس کے پچھلے حصے سے ٹکرا گیا اور چھ ہفتے اسپتال میں پلاسٹر لگوائے پڑا رہا۔

ٹی وی کمپیوٹر سے لے کر واشنگ مشین، ایکوا گارڈ، ویکیوم کلینز تک کا سامان تھا اس کمپنی کے پاس۔ ویسے تھا کچھ بھی نہیں، آرڈر ملنے پر دستیاب کر دیا جاتا۔ وہ تین سال سے منیجر بننے کی خواہش میں مسلسل بھاگ دوڑ کیے جا رہا تھا۔ پیدل چلنے میں بھی مشاق تھا۔ ابھی پرکس کے نام پر لگ بھگ چھ ہزار مہینہ اور کہنے کو ایک لاکھ کا پیکز۔

بڑی جدو جہد کے بعد تین لڑکوں نے مل کر شہر کے آخری حصے میں ایک برساتی کرایے پر لی۔ اس شہر میں بیچلر کو کمرہ ملنا بہت مشکل تھا۔ مل بھی جائے تو اتنا کرایہ کون دے پائے۔ اہم سیکٹروں سے دور پچاسویں سیکٹر میں جو ابھی آباد ہی ہو رہا تھا اس میں کرایہ کم تھا۔ کم یعنی پانچ ہزار میں ایک برساتی، بجلی پانی الگ۔ تیسری منزل کی چھت پر ایک کمرہ اور دوسری طرف باتھ روم۔ پانی کبھی چڑھتا، کبھی گراؤنڈ فلور سے مکان مالک کے برامدے میں لگے نل سے ڈھونا پڑتا۔ برساتی گرمیوں میں بھٹّی کی طرح تپ جاتی۔ پنکھا جیسے گرم ہوا چھوڑنے کے لیے لٹکا دیا گیا ہو۔ برسات میں بڑے بڑے مچھر حملہ بولتے۔ ذرا سا سر درد یا بخار ہو جائے تو ڈر لگ جاتا، کہیں ڈینگو تو نہیں۔

ایک روم میٹ کال سینٹر میں تھا، جو رات ساڑھے دس بجے جاتا اور صبح چھ بجے لوٹتا، جب وہ اٹھ رہے ہوتے۔ جب یہاں رات ہوتی تو دوسرے ملکوں میں دن ہوتے ہیں، اس لیے کاروبار کرنے کے لیے یہاں بھی دن کرنا پڑتا ہے۔ ساری ڈیلس رات کو ہوتی ہیں۔ وہ آتے ہی فرش پر دری بچھاتا اور کانوں میں روئی کے بڈس ٹھونس کر نڈھال ہو جاتا اور ایسے خرّاٹے مارتا کہ بیہوشی کا گمان ہوتا۔ گیارہ بجے تک وہ بے سدھ پڑا رہتا۔ وہ دروازہ بند کر کے دو بالٹی پانی اور ناشتہ رکھ جاتے۔ اس کی زندگی الٹی گھوم رہی تھی۔ دوسرا لڑکا شاپنگ مال میں تھا۔ اسے آٹھ بجے جانا ہوتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا شاپنگ مال تھا جس میں ریڈی میڈ شوز، راشن، پھل، سبزیاں سب کچھ ایک ساتھ ہی موجود ہے۔ لوگ بڑے انہماک سے ٹرالی اٹھاتے اور من پسند چیزیں رکھتے جاتے۔ بہت صاف ستھرا، ٹرانس پیرینٹ پیکٹوں میں رنگین سامان۔ چڑیا کا دودھ بھی وہاں پیکٹ میں لے سکتے ہو، وہ ہنستا۔ وِکل کبھی چھ بجے ہی نکل جاتا۔

وِکل نے جب گاؤں کے پاس کے اسکول میں پلس ٹو پاس کیا، سرکاری نوکریاں ملنی بند ہو چکی تھیں۔ پلس ٹو ویسے بھی اب کوئی کوالی فی کیشن نہیں رہی تھی، بیکار رہنے کی جگہ بی اے کرنے تک تو سرکاری دروازے بالکل بند ہو گئے۔ اوّل تو کوئی نوکری نکلتی ہی نہیں، اگر نکلتی بھی ہے تو ایک پوسٹ کے لیے ہزاروں کنڈی ڈیٹ۔ اپنے لوگوں کو رکھنے کے لیے تحریری امتحان اور پھر انٹرویو جیسے ذرائع نکالے گئے تھے جن میں فالتو کے لوگ کبھی پاس نہیں ہوتے۔ جو ریٹائر ہو رہے تھے، حکومت ان پوسٹوں کو ختم کر رہی تھی۔ یہ تو شکر ہوا کچھ کمپنیوں نے ملک کے کونے کونے میں ڈیرے ڈال لیے۔ کام تو دن رات لیتے ہیں، کم سے کم جاب تو ہے۔ ہاں نوکری کو اب جاب کہتے ہیں۔ لوگوں کو بتانے کے لیے اب اچھا ہے... ایک ریپوٹڈ کمپنی میں جاب کرتا ہے۔ دو لاکھ روپے کا پیکج ہے۔ پہلے بنگلور میں تھا، اب گڑگاؤں میں ہے یا اب نوئیڈا میں ہے۔ حالانکہ اس جاب کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ جب مرضی ہوئی رات کو ہی فون کر دیا جاتا ہے، صبح آ کر اپنی پے لے جاؤ۔ کوئی شکایت نہیں شکوہ نہیں، فریاد نہیں۔ کمپنی کے چھوٹے چھوٹے باس سے بھی آپ کو باہر بیٹھے گارڈ ملنے نہیں دیں گے۔ آپ کی پہنچ بس اگلے سینئر تک ہی ہوتی ہے، جو آپ کی طرح جاب پر ہے۔

دادا چھوٹے قد کے تھے۔ گھر میں چھوٹی سی چارپائی پر آرام سے زندگی گزاری۔ زمین سے دانے آ جاتے تھے۔ پتا جی تھوڑا لمبے ہوئے۔ زمینیں مزارعوں پر چلیں گئیں۔ پاس کے بازار میں منیمی کی اور دھیرے دھیرے بازار آتے جاتے زندگی بسر کی۔ وہ اور بھی لمبا ہوا۔ کمپنی کا بیگ اٹھائے ہوئے چلتا تو ایسا لگتا جیسے کھمبے پر چمگادڑ لٹک رہا ہے۔

کبھی کوئی کسٹمر آرام سے بات کر لے تو اس سے بار بار فون پر بات کی جاتی ہے۔ کچھ تو فون اٹھاتے ہی نہیں۔ کچھ اٹھاتے بھی تو بہت نرمی سے ہلو کرتے، جب پتا چلتا، یہ پروڈکٹ بیچنے کے لیے کال کر رہا ہے تو کچھ بولتے ہوئے فوراً کاٹ دیتے۔ آج کل اتنی کمپنیاں ہیں، اتنے پروڈکٹ ہیں، اچھا ہونے پر بھی اپنا پروڈکٹ بیچنا آسان نہیں رہا۔

پہلے اسے فون پر بات کرنے کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ بس فون ملاؤ اور ہلو، گڈ مارننگ کے بعد شروع ہو جاؤ۔ جتنی جلدی ہو سکے اپنی بات پوری کرو۔ جیسے ٹی وی میں رپورٹر تیزی سے بولتے ہیں یا ایسا لگنا چاہیے کہ کمپیوٹر میں بھری ہوئی آواز بول رہی ہے یا جیسے موبائل کمپنیاں، لون دینے والی کمپنیاں ایک ریکارڈ کی ہوئی آواز رنگ ٹون کے بعد سنا ڈالتی ہیں۔ آپ حیران پریشان رہ جاتے ہیں۔ آپ کو اکثر لاکھوں لوگوں میں لون دینے کے لیے منتخب کر لیا جاتا ہے۔ آپ کو لاکھوں ریڈروں میں انعام کے لیے منتخب کر لیا جاتا ہے۔ اس نے بھی ایسی ہی ٹریننگ لی تھی شہر میں۔ تین مہینے کے تیس ہزار لیے تھے اور وعدہ تھا کہ جاب پکّی۔ گاؤں سے تیس کلومیٹر روز آیا جایا کرتا تھا۔ ٹریننگ کال سینٹر کی تھی۔ انگریزی اچھی نہیں تھی اس لیے کال سینٹر میں تو نہیں لگا، اس کمپنی میں پھنس گیا۔ اسے کمپنی میں 'ایگزیکیوٹیو' کہتے ہیں۔ بہت ہی خوبصورت کارڈ چھپوا کر دیا ہے کمپنی نے۔ کپڑے تو جیسے تیسے تھے ہی، دو ٹائیاں فٹ پاتھ سے بیس بیس روپے میں خرید لی تھیں۔

وہ تینوں ہر وقت ہڑبڑی کی حالت میں لگ بھگ دوڑتے ہوئے جاتے اور دوڑتے ہوئے ہی واپس آتے۔ ان کی آنکھیں لال رہتیں۔ بال الجھے ہوئے، کپڑے بھی سلیقے کے نہیں۔ ہاں انہیں ٹائی ضرور پہننی پڑتی جسے کسی طرح پھندا بنا کر گلے میں پھنسا لیتے، جو واپسی تک ڈھیلی ہو کر نیچے لٹک جاتی۔

ان کے پاس کسی خوبصوت لڑکی کو دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ انھیں کسی کے خواب نہیں آتے۔ آس پاس کے لوگ، بلڈنگ والے مہذب سوسائٹی کے لوگ انھیں شک کی نگاہ سے دیکھتے— یہ لڑکے کیا کرتے ہیں؟ کہاں جاتے ہیں؟ دن بھر کہاں رہتے ہیں؟ راتوں کو کیوں لیٹ آتے ہیں یا کبھی آتے ہی نہیں۔ کہیں ڈرگس تو نہیں لیتے یا کوئی ایسا ویسا کام تو نہیں کرتے۔ یا کال بوائے تو نہیں۔ کوئی ان سے بات نہیں کرتا۔ حالانکہ ان سے سیڑھیوں پر جو بھی ملتا، اس سے وِش بھی کرتے۔ برساتی گرمیوں میں زیادہ گرم اور سردیوں میں بے حد ٹھنڈی رہتی، ان کے جسم کا درجہ حرارت ہمیشہ ایک جیسے رہتا۔

شروع میں اسے فون پر کسٹمر پٹانے کا کام دیا گیا۔ وہ دن بھر بیٹھا ہوا ڈائریکٹری لے کر فون گھماتا رہتا۔ لوگ اس سے عجیب عجیب باتیں کرتے رہتے۔ کبھی غلطی سے وہی نمبر دوبارہ لگ جائے تو وہ ڈانٹ دیتا۔ کانوں سے برا سننے پر بھی ہنستے رہنے کی مشق تھی سبھوں کو۔ اے سی میں بیٹھے فون گھوماتے رہو، پازیٹیو جواب آنے پر نوٹ کرو، جہاں فیلڈ کے لوگ فوراً سے پہنچ جاتے۔ مہینے بھر بعد اسے فیلڈ میں بھیج دیا گیا۔

بڑے بڑے سیکٹروں میں کوٹھیوں کے دروازے کوئی نہیں کھولتا۔ زیادہ تر گیٹ کی تختی پر لکھا رہتا ’کتوں سے ہوشیار‘ کئی شوقینوں نے اتنی گرمی میں بھی باہر چیڑ کے بونے پیڑ لگا رکھے تھے۔ ان جیسے لوگوں کو چور، بدمعاش یا دہشت گرد بھی سمجھا جاتا۔ گیٹ کے اندر سے بات کرنے کے بعد جھڑک اور ڈانٹ پھٹکار کے بعد انھیں واپس کر دیا جاتا۔ ہاں ’لوُ انکم‘ کے شہ منزلے فلیٹوں میں جانے پر کوئی نہ کوئی دروازہ کھول دیتا۔ خاص کر جب مرد دن میں گھر سے باہر ہوتے، کوئی مہربان خاتون بات سنتی، سامان دیکھتی اور ٹھنڈا پانی پلاتی۔ یا کوئی شوہر کی چوری سے کچھ خرید بھی لیتی۔ ہمیشہ مسلسل بولتے ہوئے آخر میں ڈسکاؤنٹ پر بات ختم ہوتی... بس اس مہینے کی آخر تک ہے ڈسکاؤنٹ، تین سال کی وارنٹی، جب مرضی ایک فون پر بلا لو، ہماری کمپنی جیسی سروس کسی اور کے پاس نہیں۔

پچھلے دنوں وہ اپنے ایک جونیئر کو ساتھ لے کر فلیٹ میں گیا تھا۔ جونیئر کو ساتھ میں رکھ کر اسے ڈی لنگ کا طریقہ سکھایا جاتا ہے۔ جونیئر سے زیادہ بولنا اور دوسرے کو امپریس کرنا ضروری ہے۔

سگندھا اپارٹمنٹ میں تیسری منزل میں پارٹی تھی۔ نئے نئے اپارٹمنٹ بنے تھے، اس لیے نیا سامان تو چاہیے ہی ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں وہ یہاں آیا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر سانس پر قابو پاتے ہی اس نے بڑے اعتماد سے بیل بجائی۔ کوئی نہیں آیا۔ اب کچھ ڈرتے ہوئے دوسری بار بیل بجائی۔ جب کوئی نہیں آیا تو تیسری بار بیل پر انگلی رکھی، جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ تیسری بار بیل بجنے پر کچھ آہٹ ہوئی اور ایک صاحب دروازے سے جھانکے... آج تو صاحب گھر پر ہی ہیں.... وہ ایکبارگی جھجک گیا۔ دروازے سے جھانکتے چہرے پر خوشگواری کے آثار تھے۔ جیسے ہی اس نے تعارف کروایا ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ایسا محسوس ہوا، اگر پاس میں پتھر ہوتا تو اس پر دے مارتے، ’نہیں لینا ہے بھائی!‘ انھوں نے سر کو جھٹکا دیا۔ ’سر! آج کل اسپیشل آفر ہے۔ ڈسکاؤنٹ اسی مہینے تک ہے۔ وارانٹی بھی ہے۔ آج کل یہی ایکواگارڈ بک رہا ہے۔ میڈم کو بھی دکھایا ہے۔‘ ’نہیں بھئی نہیں، آج نہیں۔‘ انھوں نے کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا۔ اگر وہ جلدی سے ہاتھ نہ ہٹالیتا تو دروازے میں انگلی آجاتی۔

وہ رونے کو ہو آیا۔ اپنے جونیئر کو امپریس کرنا چاہتا تھا، یہ تو الٹا ہو گیا... بہت بدماغ آدمی ہوتے ہیں یہ سالے! گالی دینے کی خواہش ہوئی وکل کی، لیکن وہ خاموشی اختیار کرتے ہوئے بولا، ’دیکھو کہہ رہے ہیں نہ آج نہیں... شاید بزی ہوں گے۔ کل پھر آنا چاہیے۔‘

وہ نیچے اتر آئے۔ سڑک میں رہڑی والا موسمی کا جوس بیچ رہا تھا۔ اس نے بیس کے دو گلاس بنانے کو کہا۔ اس سے تو رہڑی میں جوس، پھل یا سبزیاں بیچنا ہی اچھا ہے... اس نے دل ہی دل میں سوچا اور ٹائی کی گانٹھ گلے میں زور سے کسی... میں بھی تو رہڑی والا ہی ہوں، بس ایک ٹائی لگا رکھی ہے بیس روپے کی۔ جوس پی کر وہ ایک دم ہلکا ہو گیا۔

تین سال میں ہی وہ شہر کے لمبے چوڑے جغرافیہ اور زیادہ تر اپارٹمنٹس سے واقف ہو گیا تھا۔ بہت سی کوٹھیوں، فلیٹوں کے صاحب، میم صاحب کو وہ پہچانتا تھا۔ بہت سے آرڈر دینے والوں کو وہ جانتا تھا۔ سیکڑوں فون نمبر اس کی ڈائری اور موبائل میں تھے، لیکن اسے کوئی نہیں جانتا۔

وکل کو کئی مرتبہ حیرانی ہوتی۔ کتنے ہی ضرورت مند شوروم میں آنے پر لاکھوں کا سامان لے جاتے ہیں۔ دوکان در دوکان گھومتے ہیں۔ کچھ تو فون سے ہی آرڈر دے ڈالتے۔ کئی بار تو لاکھ سر پھوڑنے پر بھی ایک خریدار نہیں ملتا۔

پہلے دوکان دار کسٹمر کو آواز لگا کر بلاتے تھے۔ پرانے بازاروں میں سے گزرنے پر دوکان دار آوازیں لگاتے۔ دوکانوں میں چوہے ادھر ادھر ٹہلتے رہتے۔ چوہوں کے پیشاب سے دھلی اور ریڑی سے بھری دالیں ملتیں جنھیں چھانٹتے چھانٹتے آنکھیں درد کرنے لگتیں۔ پتا جی بازار سے خاموشی کے ساتھ بغیر کچھ خریدے خالی ہاتھ لٹکائے آجاتے۔ ماں کے ناراض ہونے پر وہ سہگل کی گائی ہوئی غزل کے یہ شعر گنگنا دیتے:

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

پتا جی آنگن سے اٹھے تو پاجامے میں لفافے سی ہوا بھر گئی۔ وہ اچانک لہرائے جیسے چکر آ گیا ہو۔ پھر سنبھل کر پیچھے مڑے اور اسے بغیر پلک جھپکائے دیکھنے لگے۔ وہ سہم سا گیا۔ ادھر ادھر نظریں ڈالتا ہوا کھانس کر بولا، ’مجھے جانا ہوگا...‘

پتا جی نے کوئی جواب نہیں دیا اور نہ کسی بھی طرح کا ردعمل ظاہر کیا، دوبارہ وہیں پر بیٹھ گئے، ’چائے پی کر جاؤ۔‘ انھوں نے دوسری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ خود بھی چائے پینا چاہتے ہیں۔

اندر جا کر چائے کا ہینڈل والا برتن اٹھایا جس کا ہینڈل بری طرح سے ہل رہا تھا جیسے الگ ہونے کو ہو۔ برتن میں چائے کے عرق کی پرتیں جمی ہوئی تھیں۔ باورچی خانے میں سبھی برتن پیلے پڑ چکے تھے۔ ماں کے وقت میں برتن چم چم کرتے۔ ماں راکھ سے مانجھ مانجھ کر صفائی کرتی تھی۔ بیمار رہنے پر بھی آخری دنوں تک باورچی خانے میں صفائی رکھی۔ بیٹھے بیٹھے برتن مانجھتی، کھانا پکاتی۔ پتا جی بازار میں منیم گیری کرتے اور دیر سے گھر لوٹتے۔ ماں سے بات کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ آس پاس کے لوگوں اور سگے رشتے داروں نے آنا کم کر دیا تھا۔

یہ وہی کمرہ ہے جہاں ماں رہتی تھی، ابھی تک طاق میں ماں کے دیوتاؤں کے فوٹو رکھے ہیں۔ ان پر دھول جم گئی ہے۔ ایک چھوٹی گنگا رامائن میں رنگین تصویر تھی جسے وہ دوستوں کو بتایا کرتا۔ تب سارا گھر اپنا تھا۔ سورج بھی نکلتے ہی گھر میں جھانکتا۔ جب وہ دس بارہ برس کا رہا ہوگا، ماں کو ایک بہت ہی خوبصورت گول مٹول بچہ ہوا تھا، جو کچھ ہی مہینوں کے بعد گزر گیا۔ زچگی کے بعد ماں کو ٹی بی لگ گئی جو آخر تک ساتھ رہی۔ گھر میں ٹی بی غیر مرئی بھوت کی طرح داخل ہوئی اس کی وجہ سے ماں کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

یہ وہی کمرہ ہے جہاں ماں کا درد پرندے سنتے تھے۔ ماں کھانسی کو روکتے ہوئے چڑیوں کوؤں سے باتیں کرتی۔ گاؤں کے لوگ اندر نہیں آتے۔ باہر برآمدے میں بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر بات کرتے۔ کچھ تو ماں کے ہاتھ کا حقہ، پانی تک نہیں پیتے۔ پہلے وہ بھیڑوں، گایوں سے بات کرتی تھی۔ جب کمزور پڑی تو ڈھور ڈنگر بک گئے۔ تب سے چھت کے ٹوٹی سلیٹوں پر، آم امرود پر، پاس کے بانس کے جھرمٹ پر بیٹھے پرندے اس سے بات کرتے۔

سچ، ماں کوے کی زبان جانتی تھی۔ جب گول مٹول بچہ بیمار ہوا تو ماں کو کوے نے بتا دیا تھا کہ وہ بچے گا نہیں۔ کوا برا بول بول رہا تھا۔ ماں بار بار اڑاتی، وہ پھر چھت پر بیٹھ کے گلے کے بہت اندر سے جیسے بہت زور لگا کر آوازیں نکالتا۔ ان آوازوں کو سن کر ایک ہفتہ پہلے ہی ماں نے کہنا شروع کر دیا تھا۔ ٹھیک سات دن بعد بچہ چل بسا۔

ماں کے مرنے سے پہلے کوئی کوے کی زبان نہیں سمجھ پایا۔ کوا تب بھی گلے کے اندر سے آواز نکال کر برا بولتا رہا۔ تب اسے اڑانے والا کوئی نہیں تھا۔ ماں کے مرنے پر گاؤں والے آنگن میں دور دور کالا کپڑا اوڑھے پنجوں کے بل بیٹھ گئے تھے۔ کسی نے آنگن کے بیچوں بیچ تلسی کے ساتھ آگ جلا دی تھی، جہاں ماں روز چراغ جلایا کرتی تھی۔ جس کی لو اسے برسات کے بعد کی اندھیری راتوں میں باہر نکلنے پر سہارا دیتی اور وہ بے خوف پچھواڑے تک چلا جاتا۔ ماں کا بستر اس کے ساتھ ہی جلا دیا گیا۔ جس تسلے میں ماں راکھ ڈال کر تھوکتی تھی، وہ دور جنگل میں پھینکا گیا۔ اندر آنے سے عورتیں کتراتی رہیں

تھیں۔ ایک بڑھیا نے ماں کو جیسے تیسے ڈھکا پیٹا اور وداع کیا۔ گاؤں والے آگ دکھا کر فوراً ہی لوٹ آئے۔ ایسے مریضوں کا دھواں نہیں لیا جاتا۔ بعد میں گھر کی دیواروں سے بھی ماں کے ہاتھوں کی پوتی مٹی اکھاڑ دی گئی۔ پورے گھر میں گنگا جل چھڑک کر نئی مٹی سے پوتائی کی گئی۔ ماں کے کپڑے بھی کہیں دور پھینکوا دیے گئے۔ پرانے ٹرنک، بکسے دھو ڈالے گئے۔ جیسے ماں کی ہر یاد مٹا دینے کی کوشش کی گئی پھر بھی ماں گھر میں کئی دن تک کراہتی رہی۔ وہ رات رات کو جاگ کر سنتا، ماں کھانس رہی ہے... باورچی خانے میں برتن ادھر ادھر رکھ رہی ہے... پتا جی کو چائے دے رہی ہے... بچے کو لوری سناتے ہوئے سلانے کی کوشش کر رہی ہے... پھر کھانس رہی ہے...

اسے صلاح دی گئی کہ گھر چھوڑ کر کہیں دور نکل جائے۔ ایسے روگ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پکڑتے ہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو گیا۔ اب تک انگریزی داوئیاں بھی آگئیں تھیں۔ پتا جی کچھ مہینے سینی ٹوریم میں رہے۔ سینی ٹوریم میں خدمت اور علاج سے وہ بچ گئے۔

وکل نے پتا کو چائے پکڑائی تو کوا چھت پر بیٹھا اسی طرح آوازیں نکالنے لگا۔ اس نے پتھر اٹھا کر اچھالا جو آواز کرتا ہوا دوسری طرف آنگن میں جا گرا۔

پتا سے کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی اس کی۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے... یہی سوچتا ہوا واپس آ گیا۔ آج اس میں سکندھا اپارٹمنٹ جانے کی ہمت نہیں تھی۔ جونیئر کو فون کر دیا کہ ایک بار ٹرائی کر لے۔

شام کو وہ روم میٹ سے کچھ نہیں بولا۔ اس نے پوچھا بھی، 'کیا پیکٹ ملا؟'

'نہیں معلوم پوچھا نہیں۔' اس نے ٹال دیا۔

دراصل پتا جی کا خط آیا ہوا تھا۔ پتا جی نے ڈاک محکمے کا پرانا رجسٹرڈ خط بھیجا تھا جس میں صرف ایک ہی کاغذ تھا۔ رجسٹرڈ خط میں پتہ کسی اور کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ اندر کے کاغذ میں لکھاوٹ پتا ہی کی تھی۔ لکھا تھا:

عزیزم وکل

تمہارا خط ملا....

سارے کام ختم کرنے کے بعد جب میں ون کھنڈی پہنچا تو تمہاری بتائی ہوئی جگہ پر جنگل کی طرف جا رہا تھا، بس ابھی قریب آ ہی رہی تھی کہ اچانک آندھی اور اولوں کی وجہ سے زبردست طوفان آ گیا، اس لیے میں بس میں سوار نہیں ہو سکا۔ دوسرے دن میں بہت صبح بستر سے اٹھ کر جنگل میں گیا اور اس جگہ پر پہنچا تو وہاں کچھ نہیں ملا۔ تیسرے دن پھر اسی جگہ پر دیکھنے گیا تو وہاں کچھ نہیں ملا۔ اب میں تھکے ہوئے سپاہی کی طرح بیٹھا ہوں اور تمھیں اطلاع کر رہا ہوں۔

تمہارا خیر اندیش

بدری پرساد

اب خط کون لکھتا ہے! وہ بھی رجسٹرڈ۔ پتا جی کو موبائل نمبر بھی لکھایا تھا۔ ایک دو بار انھوں نے فون کیا بھی۔ ایک مرتبہ تو کسی اور نے فون ملایا، 'وکل بول رہے ہو؟ لو اپنے پتا سے بات کرو۔ انھیں اکیلے کہاں بھیج دیتے ہو۔ ان سے تو چلا بھی نہیں جا رہا۔' جب اس نے بات کی تو جیسے پتا جی کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ زور زور سے پوچھ رہا تھا کیا پیسے مل گئے ہیں تو پتا جی کچھ اور جواب دے رہے تھے۔ آخر اس نے فون کرانے والے سے کہا تھا کہ وہ پوچھے کیا پیسے مل گئے ہیں... اس نے کچھ بات کی اور دوبارہ اسے ڈانٹ دیا، ایسے بزرگوں کو کہاں بھیج دیتے ہو بھائی، خیال رکھو۔

پتا جی آئے ہوں گے، وہ سوچتا رہا۔ دوسرے خط نے تو اسے بے چین کر دیا۔ پتا جی یہ کیا لکھ رہے ہیں۔ وہ گھبرا گیا۔ ایک آدھ کسٹمر نپٹا، اپنا موبائل سوئچ آف کر کر گھر کی بس پکڑ لی۔

پتا جی جنگل میں کیا ڈھونڈھنے گئے ہوں گے، وہ سوچتا رہا۔ رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ پیکٹ تو اس نے کوئی نہیں بھیجا اور اگر بھیجا بھی ہوتا تو ڈاک سے بھیجتا، کسی کے ہاتھ بھیجتا۔ اسے جنگل میں ڈھونڈھنے کی کیا ضرورت... رات پتا جی اس کو خواب میں دکھائی دیے۔ جیسے وہ ایک دوست کے گھر کے باہر کھڑا اس سے بات کر رہا تھا، پتا جی اس کے گھر سے باہر نکلے۔ کمزور، مگر بارونق دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے بھگوا کپڑا پہن رکھا تھا، ماتھے پر تلک۔ ہنستے ہوئے پتا جی نے کچھ باتیں کیں جو اب یاد نہیں رہیں... شاید کہا تھا، 'یہ میرا بیٹا ہے، نہیں جانتے!' آخر میں کہا، 'میں تمھارے پیر چھونا چاہتا ہوں۔' پتا بھی کبھی بیٹے کا پیر چھوتے ہیں... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ... چلنے پر احساس ہوا، پتا اس کے پیر چھو رہے ہیں... جب جاگا تو پسینے سے شرابور تھا۔ کسی کو خواب میں ہنستے ہوئے دیکھنا برا ہوتا ہے، ماں کہتی تھی۔

نیم خوابی میں وہ سوچتا رہا۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ کال سینٹر والا لڑکا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ وہ لوٹ آیا ہے، اسے کمپنی نے نکال دیا ہے، کبھی ایسا محسوس ہوتا جنگل میں گھوم رہا ہے۔ چیڑ کے پتے گرمیوں میں گر جاتے ہیں تو ایک چادر سی بچھ جاتی ہے، جس پر چل نہیں سکتے۔ یکبارگی پاؤں پھسل جاتے ہیں۔ ایسے میں جب بارش ہو تو ایک عجیب طرح کی خوشبو پھیلنے لگتی ہے جو پورے جنگل میں پھیل کر گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ امتحان کے دنوں میں وہ کتاب لے کر جنگل میں پڑھنے جایا کرتا تھا اور چیڑ کے ٹیڑھے پیڑ پر بیٹھ کر گھنٹوں پڑھتا رہتا تھا۔ رات کو جب چاندنی پھیلی ہوتی، جنگل صاف صاف دکھائی پڑتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ دکھائی نہیں پڑا۔

صبح بریڈ بٹر کھاتے ہوئے روم میٹ نے پھر پوچھا، 'وہ پیکٹ مل گیا؟'

'نہیں یار! میں بھول گیا اب کیا پوچھنا۔' اس نے ٹالتے ہوئے کہا۔

'تم ہی نے بتایا تھا کہ تم پرانے جوتے، پرانے پینٹ، قمیض کے علاوہ چاندنی چوک سے ریگز اور بہت سارا سامان خریدا اور پتا جی کو گھر میں نہ دے کر جنگل میں بڑے پتھر کے نیچے چھوڑ آئے ہو۔'

'میں نے کہا تھا...!'

'ہاں، ہاں۔ وہی بڑا پتھر جس کے نیچے سردیوں میں گدی لوگ اپنی بھیڑ بکریوں کے ساتھ پناہ لیتے ہیں۔ جس کے غار کے چھت میں ابھی بھی دھویں کے کالے نشان ہیں۔ نیچے چولہے کے تین پتھر کالے پڑے ہوئے ہیں، ہاں وہی پتھر جس پر میلے میں تمھیں لے جاتے ہوئے پتا جی بیٹھ کر سستاتے تھے...'

'یہ سب تمھیں کیسے معلوم ہوا...'

'تمھیں نے بتایا تھا یہ سب... تمھیں قصے اور کہانی سنانے کی عادت ہے۔'

'میں نے سنایا تھا... قصہ تو صحیح ہے.. میں نے کب سنایا!'

گھبرا سا گیا وکل۔ کیا میں نے سنایا ہوگا! دماغ پر زور دینے پر بھی یاد نہیں آیا۔ تبھی موبائل کی گھنٹی بلبلا اٹھی اس نے اسپیکر بند کر دیا۔ دوسری بار پھر بج اٹھا۔ تیسری بار جب گھنٹی بجی تو ہڑبڑی میں موبائل فرش پر گر کر دو ٹکڑے ہو گیا۔

'جسٹ کول ڈاؤن... ڈونٹ وری!' روم میٹ نے موبائل اٹھا کر اسے پھر سے جوڑ دیا۔ جوڑتے ہی وہ پھر بج اٹھا اور اسے اس بار زور سے کپکپی آ گئی۔

ان کی گفتگو سے تیسرا لڑکا، جو نائٹ ڈیوٹی کے بعد کانوں میں روئی کے بڈس ٹھونس کے خراٹے لے رہا تھا، جاگ اٹھا اور ایک بچے کی طرح کنمنایا، 'کیا شور مچا رہے ہو سالو! سونے دو۔'

◘

Rushda Khatoon, ward no. 10,
Kharka, Faqeerabad, Sari Aqeel,
Distt. Kaushambi (U.P)

جاوید احمد کامٹوی

ماحول کا تحفظ اور طلبہ کی ذمے داریاں

مختلف طرح کی آلودگی، کرۂ زمین کا گرم ہونا اور موسمی تغیرات ایسے موضوعات ہیں جن سے نہ صرف سائنس داں، ماہرینِ ماحولیات، سیاسی حکمراں بلکہ عام آدمی ان سے اور ان کے اثرات سے واقف ہو چکے ہیں اور لازماً ان کے منفی اثرات کی جانب سے متفکر ہیں کیونکہ وہ ان کے اثرات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ 1970 کے بعد سے دنیا کی آب و ہوا میں نمایاں تبدیلیاں دیکھی گئی ہیں جن کے اثرات فصلوں کی پیداوار میں کمی کے علاوہ عام زندگی پر پڑے ہیں۔ قحط، سونامی، سیلاب اور پانی کی کمی کی زد میں دنیا کے بیشتر ممالک آ چکے ہیں بلکہ دنیا کی معیشت کے بگاڑ کے لیے بھی یہ ذمہ دار ہیں۔

آج سے چند دہائیوں قبل گو کہ سائنس و ٹکنالوجی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی مگر انسانی زندگی خوشحال تھی۔ ہر طرف صاف و پاکیزہ فطرت کی حکمرانی تھی، آلودگی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ پانی اور دیگر وسائل وافر مقدار میں انسانوں کو دستیاب تھے۔ جانور فطری انداز پر زندگی گزارتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں فطرت کے ہر عنصر میں ایک توازن پایا جاتا تھا مگر بے سمتی سماجی ترقی نے انسانوں سے امن وسکون کو چھین لیا۔ ان کی صحت متاثر ہوئی بلکہ ان کا وجود ہی خطرے میں آ گیا۔ اس طرح قدرتی ماحول کے بدلے ایک مصنوعی ماحول وجد میں آ گیا۔ آبی آلودگی، ہوا کی آلودگی، آواز کی آلودگی غرضیکہ ہر قسم کی آلودگی کے نظارے آج عام ہیں۔ ماحول کے تحفظ کے لیے اور اسے متوازن بنانے میں ہر ایک کا تعاون ضروری ہے۔ اس کام کے لیے کسی بڑی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر عمل پیرا ہو کر اسے یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ اس نیک کام میں سماج کا ہر آدمی اپنا تعاون دے سکتا ہے مگر طلبہ اس مہم میں قائدانہ رول ادا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا طلبہ کو اس مہم میں ملوث کرنے سے بڑے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ذیل میں چند طریقے تحریر کیے جا رہے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ماحول کے عدم توازن کو دور کیا جاسکتا ہے۔

(1) بجلی کا کفایت شعارانہ استعمال:

بجلی آج کی اہم ضرورت بن چکی ہے۔ اس سے ہماری صنعتوں کے دل دھڑکتے ہیں۔ ہمارے گھر، دفتر اس سے منور ہیں۔ یہ گویا ہماری معیشت کی لائف لائن ہے۔ کسی بھی ترقی پذیر ملک کے لیے بجلی کی بڑی اہمیت ہے مگر اس کے بغیر چارۂ کار بھی نہیں۔ بجلی کے بے جا

آج سے چند دہائیوں قبل گو کہ سائنس و ٹکنالوجی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی مگر انسانی زندگی خوشحال تھی۔ ہر طرف صاف و پاکیزہ فطرت کی حکمرانی تھی، آلودگی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ پانی اور دیگر وسائل وافر مقدار میں انسانوں کو دستیاب تھے۔ جانور فطری انداز پر زندگی گزارتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں فطرت کے ہر عنصر میں ایک توازن پایا جاتا تھا مگر بے سمتی سماجی ترقی نے انسانوں سے امن و سکون کو چھین لیا۔ ان کی صحت متاثر ہوئی بلکہ ان کا وجود ہی خطرے میں آگیا۔ اس طرح قدرتی ماحول کے بدلے ایک مصنوعی ماحول وجد میں آگیا۔ آبی آلودگی، ہوا کی آلودگی، آواز کی آلودگی غرضیکہ ہر قسم کی آلودگی کے نظارے آج عام ہیں۔

استعمال کو ٹال کر ہم ماحول کی پراگندگی کو روک سکتے ہیں۔ حرارتی بجلی پیدا کرنے کے لیے کوئلہ اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بجلی کی تیاری کے دوران مختلف گیسیں بنتی ہیں جو ہوا میں شامل ہو کر اسے آلودہ کرتی ہیں نیز فضا کو گرماتی ہیں۔ بجلی کی زاید مقدار کی تیاری سے ان کا تناسب بھی بڑھتا جاتا ہے۔ پھر پانی، کوئلہ وغیرہ کا شمار قدرتی دولت میں ہوتا ہے۔ قدرت میں کوئلہ، پانی، تیل، معدنیات کے ذخیرے محدود ہیں۔ ان کو آج کا انسان تیزی سے استعمال کرتا جا رہا ہے۔ قدرت کی کوکھ میں بننے کے لیے انھیں لاکھوں سال لگ جاتے ہیں۔ گویا اک دن ایسا آئے گا کہ یہ ذخیرے ختم ہو چکے ہوں گے۔ صاف اور پینے کا پانی بھی نایاب ہوتا چلا جا رہا ہے بلکہ اسے خرید کر پینے کی نوبت آ گئی ہے۔ یہی حال رہا تو شاید سانس لینے کے لیے ہمیں صاف ہوا بھی خریدنی پڑے! اس لیے بجلی کو دیکھ بھال کر استعمال کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے بجلی کے استعمال میں کٹوتی کی کوشش کرنی چاہیے اتنی کہ ہماری روزمرہ زندگی متاثر نہ ہو سکے۔ بجلی کے کفایت شعارانہ استعمال کی عادت طلبہ کی آئندہ آنے والی زندگی میں بھی مضبوط ہو سکتی ہے۔ بجلی کی زیادہ پیداوار سے ماحول کی زیادہ خرابی ہوگی نیز کوئلہ اور پانی کا ذخیرہ بھی کم ہوتا جائے گا اس لیے صنعتی ترقی کو متاثر کیے بغیر بجلی تیار کرنے اور استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ عام لوگ خصوصاً طلبہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر عمل کر کے بجلی کی بچت کر سکتے ہیں۔ الگ الگ کمروں میں بیٹھ کر مطالعہ کرنے کے بجائے اگر گھر کے سارے بچے ایک ہی کمرے میں بیٹھ کر مطالعہ کریں یا ہوم ورک کریں تو بجلی کے بل میں خاصی کمی لائی جاسکتی ہے۔ بعض بچوں کی عادت بھی ہوتی ہے کہ ٹی وی کھلا ہے، میچ یا پروگرام چل رہا ہے اور پڑھائی ہو رہی ہے، اسی طرح فرج کو بار بار کھولا جاتا ہے ان سب سے بے مطلب بجلی استعمال ہوتی ہے۔ ضرورت نہ رہنے پر زائد لائٹ اور پنکھے یاد سے بند کر دیں۔ اے سی، کولر وغیرہ میں چونکہ بہت بجلی استعمال ہوتی ہے اس لیے اس کی عادت نہ ڈالیں تو بہتر ہے۔ بہت ضرورت کے تحت ہی آلات یا مشینوں جیسے اوون، ویکیوم کلینر، مکسر گرائنڈر کا استعمال کریں اس طرح اسکولوں، گھروں دفتروں میں بجلی کی اچھی خاصی بچت کی جاسکتی ہے۔

(2) جنگلات کی حفاظت

اسکول اور کالج میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی چیز کاغذ ہے اور کاغذ کی تیاری کے لیے جنگلات پر

انحصار کرنا پڑتا ہے۔ کاغذ کی دونوں پشت لکھنے کے لیے استعمال کریں۔ لکھنے میں معمولی سی غلطی ہونے پر پورے کاغذ کو پھاڑ کر نہ پھینکیں۔ اس طرح کاغذ کے بے جا استعمال سے بچیں و جنگلات کو ختم ہونے سے کسی حد تک بچایا جاسکتا ہے۔ جنگلات ہماری زندگی اور ہماری معیشت کے لیے کتنے ضروری ہیں، ان سے سبھی واقف ہیں یہاں سے ہمیں عمارتی لکڑی، ایندھن، گوند، شہد، نیل جڑی بوٹیاں اور جانوروں کے لیے چارہ حاصل ہوتا ہے۔ جنگلات، ماحول کو صاف رکھ کر اسے خوشگوار بناتے ہیں اس کے علاوہ جنگلات کے دوسرے اہم فائدے ہیں جنھیں ہم فوری طور پر نہیں دیکھ سکتے جیسے ہمارے جانوروں کو یہاں سے غذا ملتی ہے، یہ بارش برسانے میں معاون ہیں، زمین کی چھیج کو روکتے ہیں اور پانی کو زمین میں جذب کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ اس طرح کاغذ کے غیر ضروری استعمال سے جنگلات کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔

(3) پانی کی بچت

پانی ایک انمول شے ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس کی غیر موجودگی میں ہی کیا جاسکتا ہے۔ پانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ میٹھے اور صاف پانی کے ذخائر دنیا میں محدود ہیں۔ مغربی ممالک میں پانی کے سبھی ذخائر پر بڑی بڑی کمپنیاں قابض ہوتی جارہی ہیں اور 'منرل واٹر' اور 'پیکیجڈ واٹر' کی بوتلیں بازار میں فروخت کرکے لاکھوں کروڑوں کمارہی ہیں۔ پانی جیسی عام نعمت کو بھی عام آدمی خرید کر استعمال کرنے کے لیے مجبور ہے۔ کسی دانشور کی یہ رائے بالکل ٹھیک ہے کہ اب تیسری عالمی جنگ تیل، معدنیات وغیرہ پر قبضہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ پانی کے لیے لڑی جائے گی۔ اس سے پانی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پانی کی ایک ایک بوند قیمتی ہے اس لیے ہر بوند کی حفاظت ضروری ہے۔ زراعت کے لیے آب پاشی کے نئے طریقے میں کسی پودے کو بوند بوند پانی دے کر اسے سینچا جاتا ہے۔ اس سے پانی کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے گھروں، دفتروں، اسکولوں وغیرہ میں بے تحاشا پانی ضائع ہوجاتا ہے اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔ طلبہ اسے روکنے میں اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ ٹپکتی ہوئی ٹونٹیوں کی مرمت کی جائے، شہروں کو سپلائی کرنے والی پائپ لائنوں کی خرابی دور کرنے کی طرف اور غیر سماجی عناصر کے پائپ کے پھوڑ ڈالنے یا والو کو کھولنے کی طرف محکمۂ آب رسانی کو متوجہ کیا جائے۔ ہر گھر میں عموماً مستعمل پانی بہہ کر بے کار چلا جاتا ہے۔ اس بے مصرف پانی کا رخ گھر میں کھلی جگہ میں بنائے گئے گارڈن کی طرف موڑا جاسکتا ہے، جہاں سے تازہ پھل اور سبزیاں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یہ پانی کا بہترین مصرف ہے۔

(4) حمل و نقل

بازار میں نئے نئے ماڈل کی بائیک اور کاریں آتی رہتی ہیں اور بکتی بھی خوب ہیں۔ گاڑیوں کا چلن بہت بڑھ چکا ہے۔ ان سب کے لیے ڈیزل، پٹرول کی ضرورت ہوتی ہے جس کا بڑا حصہ ہمارا ملک باہر سے خریدتا ہے۔ اس پر ملک کی بے انتہا دولت خرچ ہوتی ہے نیز اس کے کثیف دھوئیں سے ہوا بھی آلودہ ہوتی ہے۔ آلودگی کے علاوہ 'فوصل ایندھن' سے نکلنے والی فاسد گیسیں انسانی صحت پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ہمارے کرۂ زمین کو گرماتی ہیں۔ اسی کو 'عالمی گرماہٹ' کہا جاتا ہے۔ ان سے بچنے کے لیے خاص ضرورت کے تحت اور طویل سفر کے لیے ہی موٹر گاڑیوں کا استعمال کیا جائے۔ کم فاصلے کے سفر کے لیے پیدل یا سائیکل کی سواری کو ترجیح دی جائے۔ چین جاپان اور دیگر مغربی ممالک میں لوگ سائیکل کی سواری کو کسرِ شان نہیں سمجھتے۔ ہمارے یہاں بھی اس سوچ کو رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ فوصلی ایندھن سے ہونے والی آلودگی پر بڑی حد تک اس ترکیب سے قابو پایا جاسکتا ہے اور ماحول کو صاف ستھرا رکھا جاسکتا ہے۔

(5) تہواروں کی آمد

تہواروں کے زمانے میں آواز، پانی کے آلودگی کافی بڑھ جاتی ہے۔ اسے مختلف طریقوں سے ٹالا جاسکتا ہے کہ مذہبی جذبات بھی مجروح نہ ہوں جیسے جنگل کی بربادی کو روکنے کے لیے سارے گاؤں یا کسی ایک علاقے میں صرف ایک ہولی کے جلانے کا اہتمام کیا جائے، کئی جگہ ہولیکا جلانے سے یہ بہتر ہے۔ جنگلات کی کیا اہمیت ہے، اسے طلبہ عام لوگوں کے سامنے رکھ کر انھیں جنگل کی بربادی سے روک سکتے ہیں۔ مصنوعی رنگ، وارنش، کولتار وغیرہ سے ہولی کھیلنے کی ہمت شکنی کی جاسکتی ہے۔ اس کے بجائے قدرتی رنگوں (جو معدنیات، پھلوں، پھولوں سے حاصل کیے گئے ہوں) کو استعمال کرنے کے فائدے بیان کیے جاسکتے ہیں۔ ان دنوں مٹی کے بجائے پلاسٹر آف پیرس (POP) کو مورتیاں بنانے میں استعمال کیا جانے لگا ہے۔ اس سے پانی آلودہ ہوتا ہے اور برسوں اس کے اثرات پانی میں برقرار رہتے ہیں۔ طلبہ اس کے خلاف بھی ذہنوں کو تیار کرسکتے ہیں۔ دیوالی کے دوران بھی آواز کی آلودگی اور ہوا کی آلودگی میں بے پناہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ اسکول اور کالج کے طلبہ ان کے مضر اثرات بتلا کر لوگوں کو اس تہوار کو علامتی طور پر منانے کی ترغیب دے سکتے ہیں۔ غرضیکہ تہواروں کو مناسب انداز میں منانے سے مذہبی عقیدہ بھی مجروح نہیں ہوگا اور آلودگی کو قابو میں رکھا جاسکے گا۔

(6) عوامی بیداری

ان سب باتوں کے لیے عوامی بیداری اور ذہن ضروری ہے۔ موٹر کاروں کے بجائے سائیکلوں کے استعمال کو بڑھاوا دینا ہو، تہواروں کا مناسب انداز میں منایا جانا ہو، بجلی، پانی، کوئلہ وغیرہ کی بچت کا معاملہ ہو طلبہ ایسی مہمات میں موثر رول ادا کرکے ذہنوں کو پلٹ سکتے ہیں۔ یہی طلبہ آگے چل کر اپنی نجی زندگی میں ان باتوں کو اپنائیں تو آلودگی سے بڑی حد تک نپٹا جاسکتا ہے۔ اس طرح طلبہ اس نیک کام میں قائدانہ رول ادا کرسکتے ہیں۔

(7) شجر کاری اور دیگر اقدام

درختوں اور جنگلوں کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ ہمارے ماحول کو صاف ستھرا رکھتے ہیں اور انسانوں کے تنفس کے لیے ضروری آکسیجن لوٹاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ جانوروں کے لیے غذا تیار کرتے ہیں۔ ہوا کی نمی کو برقرار رکھنے اور بارش برسانے میں بھی ان کا اہم کردار ہے۔ مختلف ترقیاتی کاموں کے لیے درختوں اور جنگلوں کا صفایا بڑی تیزی سے کیا گیا ہے۔ اس لیے نئے پودے ان کی جگہ آنے چاہئیں۔ اس لیے شجر کاری کا کام مسلسل چلتے رہنا چاہیے۔ نئے درختوں کے لگانے اور ان کی حفاظت میں طلبہ کلیدی رول ادا کرسکتے ہیں۔ گھروں، اسکولوں، راستوں اور کھلی جگہوں پر وہ شجر کاری کرکے درختوں کے وجود کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ مختلف رضا کار تنظیمیں اس کارِ خیر میں حصہ لیتی ہیں اور مدد بھی کرتی ہیں۔ ان کا تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح پانی کی ذخیرہ اندوزی، بارش کے پانی کو جمع کرنے اور پانی کے دوبارہ مناسب استعمال کے لیے عوام کو بیدار کیا جاسکتا ہے۔

گھر سے نکلنے والے کچرے کو ٹھکانے لگانے میں بھی طلبہ، عام لوگوں کی رہنمائی کرسکتے ہیں۔ اس کچرے کے دوبارہ استعمال سے سماج کو فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ اور بھی بہت سے ایسے چھوٹے موٹے کام ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ماحولیات کا تحفظ کیا جاسکتا ہے اور طلبہ عوام میں بیداری پیدا کرکے انھیں زیرِ عمل لاسکتے ہیں۔ اس طرح طلبہ ماحول کے تحفظ میں اپنی ذمہ داری ادا کرسکتے ہیں۔

□

Dr. Javed Ahmed, (Retd. Principal), 61/A, 'Gulfishan', Civil Colony, Kalamna Rd. Kamptee-441002, Dist. Nagpur (M.S)

خالد جاوید

ہندوستانی سنیما اور ڈاکیومنٹری فلمیں

ہندوستان میں ڈاکیومینٹری سنیما دراصل ایک تحریک کا نام ہے۔ یہ محض سنیما ہی نہیں ہے جو فلم بنانے سے شروع ہوکر اس کی نمائش پر ختم ہوجاتا ہے۔ ڈاکیومینٹری فلموں کا ارتقا گزشتہ تیس سال کے سفر پر محیط ہے۔ یعنی کمرشیل سنیما کے مقابلے میں ابھی اسے بہت کم عمر مانا جاسکتا ہے مگر پھر بھی اگر یہ اپنا وقار بحال کرنے اور اعتبار قائم کرنے میں کامیاب ہوسکا ہے تو اس کا سہرا دوتین باتوں کی طرف جاتا ہے ورنہ سنیما کے ناظرین کی معاشی اور ذہنی کنگالی اور غریبی کے ماحول میں یہ ہرگز ممکن نہ ہوتا۔ اس سلسلے میں پہلا قدم تو دنیا کے مختلف ممالک میں انٹرنیشنل ڈاکیومینٹری فلم فیسٹیول کا منعقد کیا جانا تھا جہاں ہندوستانی ڈاکیومینٹری فلموں نے ایوارڈ حاصل کیے اور اس طرح عارضی طور پر ہی سہی، ان فلموں اور ان کے بنانے والوں کو ہندوستان میں کچھ نام اور شہرت ضرور حاصل ہوئی۔ دوسری پیش رفت 1990 میں ممبئی میں ڈاکیومینٹری شارٹ فلموں اور Animation فلموں کے ایک بین الاقوامی میلے کا انعقاد تھا جہاں ہندوستانی ناظرین اور غیرملکی ناظرین کے درمیان ایک مکالمہ اور تال میل قائم ہوسکا۔ تیسری وجہ مکمل طور پر سیاسی تھی جب کچھ مسائل اور پہلوؤں کو بڑے پردے اور چھوٹے پردے دونوں ہی پر دکھانے کے لیے سرکار کی طرف سے کچھ فلموں پر سینسر لگا دیا گیا کیونکہ اس کے باعث خود سرکار اور انتظامیہ کی ہی حیثیت بری طرح مشکوک ثابت ہوتی تھی۔ مذکورہ بالا اسباب پر پرنٹ میڈیا اور اخبارات وغیرہ میں بھی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی گئی اور نتیجے کے طور پر گزشتہ بیس سالوں میں ڈاکیومینٹری فلمیں حاشیے سے باہر آکر اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوگئیں۔

ڈاکیومینٹری فلموں کی مختلف اقسام بیان کی گئی ہیں مثلاً سوانحی، تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی، یا تہذیبی، ماحولیاتی، سیاسی اور سماجی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ درجہ بندیاں جگہ جگہ بکھرتی نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر گلزار نے بھیم سین جوشی پر جو فلم بنائی ہے وہ جتنی سوانحی ہے اتنی ہی تاریخی بھی کیونکہ ایک طرح سے یہ ہندوستانی کلاسیکل موسیقی کے ایک اہم گھرانے 'کرانا' کی تاریخ بھی بیان کرتی ہے یا پھر سدھانشو مشرا کی فلم 'متھک بھنگ' جو کہ اوپری سطح پر تو مدھیہ پردیش کے آدی واسیوں یعنی 'اگاریوں' کی زندگی پر بنائی گئی ہے مگر زیریں سطح پر یہ سماجی بیداری کے موضوع کا بھی احاطہ کرلیتی ہے۔ اس طرح ارن کوپکر کی Colour of Absence ہے جو تجریدی آرٹسٹ جہانگیر سباوالا کی مصوری کے ارتقا کو بیان کرتی ہے یا پھر ظفرحی کی حیدرآباد۔ ان دونوں فلموں میں تاریخ اور جغرافیہ دونوں آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ یہاں جل مسکتہ کی The Clap Trop کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جو ممبئی کی فلم انڈسٹری میں کام کرنے والے غریب ایکٹر اور جونیئر آرٹسٹوں پر بنائی گئی ہے مگر ساتھ ہی خاص انسانی سروکاروں سے بھی بحث کرتی ہے اور ایک سیاسی نوعیت کی فلم بھی ہے کیونکہ یہ ان ایکسٹرا اداکاروں کے معاشی، جذباتی اور یہاں تک کہ جنسی استحصال کو بھی بڑے متاثرکن انداز میں بیان کرتی ہے۔

اس طور یہ تقریباً واضح ہوجاتا ہے کہ یہاں جس ڈاکیومینٹری سنیما کا ذکر مقصود ہے وہ اپنی نوعیت میں ان فلموں سے قطعی مختلف ہے جو سنیما ہال میں کسی کمرشیل فلم کے شروع ہونے سے پہلے نیوز ریل کے نام سے دکھائی جاتی ہے اور جس میں سرکار کے ترقیاتی پروگراموں کی جانکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ فلمیں پبلٹی ڈیژن یا انفارمیشن آفس کے ذریعے بنائی جاتی ہیں جن میں اکثر اس حد تک، یکسانیت بھری ہوتی ہیں کہ تماشائی نیوز ریل ختم ہونے کے بعد ہی سنیما ہال میں داخل ہوتا ہے۔

ہندوستان میں ڈاکیومینٹری سنیما اپنے اول معنی میں 1980 کے بعد ہی وجود میں آیا ہے مگر مغرب میں اس سنیما کی روایت خاصی مستحکم رہی ہے۔ انگلینڈ کا فلم کار جان گریرسن غالباً پہلا شخص ہے جس نے ڈاکیومینٹری کی اصطلاح وضع کی ہے یہ لفظ فرنچ لفظ 'ڈاکومینٹر' سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مطلب خبر نامہ یا دستاویز ہوتا ہے۔ جان گریرسن کی فلم Drifters کو دنیا کی پہلی ڈاکیومینٹری فلم قرار دیا جاسکتا ہے جو بحیرہ شمال کے مچھیروں کی بے مقصد زندگی پر مبنی تھی۔ جان گریرسن نے تقریباً 100 سے زائد

ڈاکیومینٹری فلمیں بنائی ہیں جن کا تعلق اپنے عہد کے سماجی سیاسی اور معاشی مسائل سے ہے۔ جان گریرسن کے علاوہ انگلینڈ کے Ken Russel اور جان شے لنگر، فرانس کے میلے لوئیس، جرمنی کے لہرزوگ ویز اور امریکہ کے Burnken کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں۔ برنن کین نے امریکن پول وار پر اور اسکارسی مارٹن نے Baseball کے کھیل پر بہت یادگار ڈاکیومینٹری فلمیں تیار کی ہیں۔ مغرب میں دوسری جنگ عظیم کے بعد ڈاکیومینٹری فلمیں بننے کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا کیونکہ اس عرصے میں وہاں سماجی سیاسی اور معاشی مسائل ایک پے چیدہ اور نئی صورت حال اختیار کر چکے تھے مگر ہندوستان میں جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ان فلموں کی تعداد میں 1980 کے بعد ہی اضافہ ہوا ہے حالانکہ ابھی بھی صورت حال تشنہ ہے۔ ان فلموں کی فنڈنگ عام طور سے فلم ڈیویژن یا دور درشن کے ذریعے کی جاتی ہے مگر یہ دونوں ادارے انھیں فلموں کے لیے اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہیں جو ان کی تعریف کے مطابق درست یعنی Politically correct ہوں۔ مثال کے طور پر گریش کرنارڈ کی Lampin niche گلزار کی 'امجد علی خاں' پر یادت کی 'نرگس' اور فلتیا ورجانی کی Eyes of stone ایسی فلمیں ہیں جنھیں دور درشن پر دکھایا گیا جبکہ "God fathers of Dhanbad" جو کوئلہ مافیا پر بنائی گئی تھی، اسے دور درشن پر ہزار کوشش کے باوجود بھی ٹیلی کاسٹ نہیں کیا جاسکا۔

اس لیے اس آرٹ کو سماجی تبدیلی کے ایک اہم وسیلے کے طور پر کام میں لایا جاسکتا ہے اس ضمن میں ہم آنند پٹ وردھن کے نام سے بخوبی واقف ہیں جو ہندوستان میں ڈاکیومینٹری سنیما کے تعلق سے بلاشک وشبہ سب سے بڑا نام ہے۔ آنند پٹ وردھن فلم سازی کے تمام کارناموں کو ان وارداتوں سے کم اہمیت دیتے ہیں جو فلم میں ہوتی ہیں۔ وہ اپنی فلموں کی کامیابی اس امر میں پنہاں سمجھتے ہیں کہ لوگ ان Issues کے بارے میں سوچتے ہیں جو فلم کے ذریعے اٹھائے گئے ہیں۔ آنند پٹ وردھن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میں اپنی فلموں کے تعلق سے آرٹ کا لفظ بھی استعمال نہیں کرنا چاہتا کیونکہ یہ ہر جگہ بہت غلط طریقے سے لیا جاتا ہے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ آرٹ کوئی ایسی شے ہے جسے آپ معاشرے سے الگ کرسکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہر شے اپنے وسیع اور عمیق تناظر میں سیاسی ہوتی ہے۔"

پٹ وردھن نے اپنا کیریئر "Prisoners of conscience" نامی فلم سے شروع کیا تھا جو 1978 میں تیار کی گئی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے 1981 میں "A Time to rise" بنائی مگر ان کو شہرت 1985 میں بنائی گئی فلم "Bombay our city" سے ملی جس نے 1985 کا "Best documentry award" جیتا۔ یہ فلم ممبئی کی جھگی جھوپڑی میں رہنے والے انسانوں پر بنائی گئی تھی مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ جس سرکار نے اسے ایوارڈ دیا تھا، اسی سرکار نے اس فلم کی عوامی نمائش پر

ڈاکیومینٹری سنیما کے ذریعے عورت کے مسائل اور اس کی مخصوص حیثیت اور خاص صورت حال کی بھی معروضی انداز میں جانچ پڑتال کرنے کی بہت کوششیں کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں مدھوشرے دتہ کی "i live in Behrampra" کا ذکر ضروری ہے جس میں ان مسلمان عورتوں کی ذہنی تکلیفوں کا بیان ہے جو نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی جھگیاں ایک مڈل کلاس کالونی اور ریلوے اسٹیشن کے درمیان ہونے کی وجہ سے ایسی بن کر رہ گئی ہیں جن میں ذہنی اور جسمانی عذاب کے سوا کچھ ممکن نہیں۔ اس ضمن میں چند دوسری اہم فلمیں بھی آتی ہیں مثلاً تمباکو کی آگ، جو تمباکو کی کھیتی کرنے والی عورتوں کے استحصال کی کہانی بیان کرتی ہے۔ یا 'سدیشا' جس میں چپکو تحریک میں شامل ایک عورت کی جدو جہد کو پیش کیا گیا ہے اور Something Like A War جس میں فیملی پلاننگ پروگرام کے تحت عورتوں پر جنسی اور جسمانی مظالم کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔

پابندی بھی عائد کردی، بعد میں پٹ وردھن کی دوسری فلموں کے ساتھ بھی یہی ہوا مثلاً "memory of Friends" 'رام کے نام' "Father's sons and Holy war" اور "war and peace" وغیرہ۔ رام کے نام ایودھیا پر بنائی گئی ایک بے مثال ڈاکیومینٹری فلم ہے جو اس حقیقت کو پوری طرح بے نقاب کرتی ہے کہ خود غرض طاقتیں عوام کے جذبات کو کس طرح بھڑکاتی ہیں اور اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ اور دوسری فلمیں تیار ہونے کے بعد ایک عرصے تک ڈبے میں بند رہیں جب تک کہ حالات تبدیل نہ ہوگئے اور ان کے اوپر عائد کی گئی پابندی ہٹا نہیں دی گئی۔

آنند پٹ وردھن کی فلموں کی کامیابی اور مقبولیت دوسرے فلم سازوں کے لیے بھی محرک ثابت ہوئی اور انھوں نے بھی ہندوستان کی سماجی سیاسی حقیقت کو سلولائڈ پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اتپلیند وچکرورتی کا نام بھی اہم ہے جس نے 'مکتی چاہیے' نام کی فلم بنائی جس میں 1928 کے Rowalt act سے لے کر 1975 میں ہندوستان میں لگائی گئی ایمرجنسی تک کے عہد کو موضوع بنایا گیا ہے اور انسان کی شخصی آزادی کے بارے میں بنیادی سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ اس طرح گوتم گھوش کی "Hungry autumn" ہے جس میں مغربی بنگال کے 1974 کے بھیانک قحط کو موضوع بحث بناتے ہوئے زراعتی پالیسیوں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تپن بوس کی فلم Indian story، جو بھاگل پور کی جیل میں چودہ قیدیوں کی آنکھیں پھوڑ دینے کے واقعے پر مبنی ہے اور پولیس کے مظالم اور بے رحمیوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ مہاسنی کی فلم 'بھوپال' جو بھوپال کے گیس المیے پر بنائی گئی تھی اور جس نے نیشنل ایوارڈ بھی جیتا تھا مگر اسے نمائش کے لیے پیش نہیں کیا جا سکا کیونکہ یہ اس صنعتی ترقی اور سائنسی ترقی پر سوالیہ نشان لگاتی ہے جو غیر عقلیت پسند، عجلت پسند اور انسان دشمن ہے۔ ایک اور مثال 'وسودھا جوشی' کی "Voices from Belipol" کی ہے جو اگر بنائی نہیں جاتی تو ہمیں ہرگز نہ معلوم ہوتا کہ وہاں نیوکلیائی Base کے بعد قبائلی نسل کے معصوم باشندوں پر کیا گزری اور ماحولیاتی توازن کس بری طرح بگڑ گیا۔

ڈاکیومینٹری سنیما کے ذریعے عورت کے مسائل اور اس کی مخصوص حیثیت اور خاص صورت حال کی بھی معروضی انداز میں جانچ پڑتال کرنے کی بہت کوششیں کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں مدھوشرے دتہ کی "i live in Behrampra" کا ذکر ضروری ہے جس میں ان مسلمان عورتوں کی ذہنی تکلیفوں کا بیان ہے جو نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی جھگیاں ایک مڈل کلاس کالونی اور ریلوے اسٹیشن کے درمیان ہونے کی وجہ سے ایسی بن کر رہ گئی ہیں جن میں ذہنی اور جسمانی عذاب کے سوا کچھ ممکن نہیں۔ اس ضمن میں چند دوسری اہم فلمیں بھی آتی ہیں مثلاً تمباکو کی آگ، جو تمباکو کی کھیتی کرنے والی عورتوں کے استحصال کی کہانی بیان کرتی ہے۔ یا 'سدیشا' جس میں چپکو تحریک میں شامل ایک عورت کی جدو جہد کو پیش کیا گیا

ہے اور Something Like A War جس میں فیملی پلاننگ پروگرام کے تحت عورتوں پر جنسی اور جسمانی مظالم کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ یہ تینوں فلمیں دیپا دھن راج نے بنائی ہیں جو ڈاکیومینٹری سنیما کا ایک اہم نام ہے، دیپا دھن راج نے ہی حیدرآباد کے فرقہ وارانہ فسادات پر مبنی ایک فلم 'کیا ہوا اس شہر کو' بنائی تھی۔ نلیتا ورچانی کی فلم Eyes Of Stone کا ذکر کیا جا چکا ہے جو ان عورتوں پر ہوئے مظالم اور بے رحمیوں کی داستان بیان کرتی ہے جن پر کسی نام نہاد آسیب کا سایہ مان لیا جاتا ہے۔ نلیتا ورچانی کی ہی ایک فلم 'سبزی منڈی کے ہیرے' بھی بے حد اہم ہے جو ان سودا سامان بیچنے والوں پر بنائی گئی ہے، جو ایک شہر سے دوسرے شہر تک چلتی بسوں میں کھڑے سفر کرتے ہیں اور بسوں میں اپنا سامان فروخت کرتے ہیں۔ اس طرح میرا دیوان کا نام لیا جانا بھی ضروری ہے جنھوں نے جہیز کی لعنت کے موضوع پر Gift of Love نام کی ایک بہت عمدہ فلم بنائی ہے۔ ان فلموں کے علاوہ سمترا بھاوے کی 'بائی'، 'چکوری'، پانی، اور سنواد، سماجاسن کی Bombay Blood Yatra تیستا ستیلواد کی Bombay: A myth Shattered، اما سہگل کی Shelter رنکی بھٹا چاریہ کی چاردیواری، سُہاشنی گھوش کی سڑک چھاپ، سائیں پراچے کی چوڑیاں، لُبھو کی A Woman Betrayed اور نینا گپتا کی 'بازار سیتارام' کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ یہاں بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ ڈاکیومینٹری فلمیں بنانے میں عورتیں شاید مردوں سے زیادہ ہیں۔ جو بجائے خود سماجی تبدیلیوں Paradigm Shift کا ایک ثبوت ہے۔

ان فلموں کی فہرست بہت طویل ہو سکتی ہے۔ راقم الحروف نے اہم نام گنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً چھ سال کے عرصے میں گودھرا سانحے کے بعد گجرات میں ہوئے مسلمانوں کے قتل عام پر ایک درجن سے زائد ڈاکیومینٹری فلمیں بن چکی ہیں اس کے علاوہ نرمدا بچاؤ آندولن اور ٹہری باندھ پر بھی بہت سی ڈاکیومنٹری فلمیں بنائی گئی ہیں ان میں سے بیشتر فلموں کو ابھی تک نمائش کے لیے پیش نہیں کیا جا سکا ہے مگر شاید یہی امر اس Counter Cinema کی طاقت کا بھی ایک روشن ثبوت ہے۔

مگر ڈاکیومینٹری سنیما کے سلسلے میں بعض خطرات خود فلمسازی سے ہی متعلق ہیں جن کی وجہ سے فلم اپنی قوت اور اثر انگیزی کو کھو دیتی ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب فلم بنانے والا صرف Data یا اعداد و شمار اکٹھا کرنے اور ریکارڈ کرتے رہنے کو ہی اپنا سب سے بڑا مقصد سمجھتا ہے اور ایک تخلیقی میڈیم کے تقاضے پورے نہیں کر پاتا۔ ایسی صورت میں فلم اپنے اصل مقصد یعنی سماجی بیداری یا تبدیلی کا ایک کارگر وسیلہ نہیں بن پاتی۔ اس لیے ڈاکیومینٹری بناتے وقت Analysis یا جانچ پڑتال کے میکانیکی انداز سے بچنا چاہیے اتفاق سے فلم ڈویژن کی طرف سے جتنی بھی ڈاکیومینٹری فلمیں تیار کی جاتی ہیں وہ زیادہ تر اس غلطی کا شکار ہونے کے سبب بے حد بور اور اکتاہٹ پیدا کرنے والی ہوتی ہیں۔ یہ فلمیں دکھانے کا بھی ایک اوٹ پٹانگ طریقہ ہے۔ یہ کسی کمرشیل فلم کے شروع ہونے سے پہلے نیوز ریل کی حیثیت سے دکھائی جاتی ہیں جو تماشائی کی اس وقت کی ذہنی کیفیت سے میل نہیں کھاتیں۔ یہ فلمیں تو دراصل کاؤنٹر سنیما کی پوری تحریک کو مسخ کرنے کا کام ہی انجام دیتی ہیں۔

پرائیوٹ فلم سازوں کے لیے یہ ایک خوش کن اطلاع ہے کہ اب بہت سے ایسے ادارے اور ایجنسیاں وجود میں آ گئی ہیں جو انھیں فنڈ مہیا کر سکتی ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ ان فلموں کے تماشائی کہاں ہیں؟

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ کمرشیل سنیما کا تماشائی Counter Cinema کا تماشائی نہیں ہو سکتا۔ اس مسئلے کا حل صرف ٹیلی ویژن کے پاس ہے۔ اگر ٹیلی ویژن پر یہ فلمیں پابندی کے ساتھ دکھائی جائیں تو صورت حال بدل سکتی ہے۔ ابھی حال ہی میں آنند پٹ وردھن کی فلم War and peace جب ٹیلی ویژن پر دکھائی گئی تو اس کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہوا اور اس نے دوسری فلموں کی نمائش کے لیے بھی راہ ہموار کی۔

دوسری بات یہ کہ ڈاکیومینٹری فلموں کے ساتھ بھی پسند اور انتخاب کا معاملہ ہونا چاہیے۔ انھیں کمرشیل سنیما سے پہلے دکھا کر تماشائی پر تھوپا نہیں جانا چاہیے کیونکہ اس وقت وہ دوسرے موڈ میں ہوتا ہے اور اس قسم کے Issue پر سوچنا نہیں چاہتا جو ڈاکیومینٹری سنیما سے متعلق ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں فلم سوسائٹی کی تحریک بھی بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے اگر فلم سوسائٹی اور فلم کلب ملک میں جگہ جگہ قائم کیے جائیں اور ملک گیر پیمانے پر ان کا پھیلاؤ ممکن ہو سکے تو کاؤنٹر سنیما کے لیے نئے دروازے آپ ہی آپ اور آسانی کے ساتھ کھل جائیں گے۔

کاؤنٹر سنیما یا متبادل سنیما ملک میں سماجی تبدیلی لانے، روشن خیالی پیدا کرنے، انسان دوستی، جمہوری اقدار، سیاسی یا معاشی شعور اور سائنسی مزاج پیدا کرنے کے واسطے وہ کارنامے بخوبی انجام دے سکتا ہے جو ابھی تک Mainstream کا سنیما یا آرٹ سنیما بھی پوری طرح کر پانے میں ناکام رہا ہے۔

■

Dr. Khalid Javed, Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

تبصرہ و تعارف

واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات

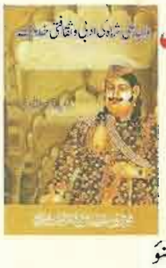

مصنف: کوکب قدر سجاد علی مرزا
صفحات: 688 قیمت: 127 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: عمیر منظر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی
لکھنؤ کیمپس، سی 9 ایچ پارک، نزد نیرانرسنگھ ہوم، مہانگر ایکسٹینشن، لکھنؤ

دبستان لکھنؤ کی ادبی خدمات کے اعتراف کے باوجود اس کی جو عمومی تصویر پیش کی گئی ہے اس میں عیش کوشی کو زیادہ دخل ہے۔ آہ اور واہ کو جس طرح دلی اور لکھنؤ کے شعری دبستان پر منطبق کیا گیا ہے اس نے بھی بعض غلط فہمیوں کو ہوا دی۔ واجد علی شاہ کا شمار تو تاریخ کی ان مظلوم شخصیات میں کیا جانا چاہیے جنھیں اپنے کارناموں کے باوصف صحیح طور پر یاد نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ مختلف ادوار میں واجد علی شاہ کا ذکر ہوتا رہا ان کی ادبی و شعری خدمات کے اعتراف میں کتابیں اور مضامین لکھے جاتے رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ رقص و سرود سے ان کی دلچسپی اور عیش کوشی کو بھی پیش کیا گیا۔ یہ کہنے میں تامل نہیں کہ لوگ واجد علی شاہ کے نام سے واقف ہیں لیکن ان کی خدمات کیا ہیں اور وہ کہاں کے حکمراں/ بادشاہ تھے نہیں جانتے۔

واجد علی شاہ کثیر التصانیف تھے۔ کسی ایک صنف سخن کے اسیر نہیں بلکہ غزل، مثنوی، گیت کاری، سلام، خطوط نگاری اور نثری تصانیف سے ان کی ہمہ جہتی کا اندازہ ہوتا ہے البتہ تصانیف کی کثرت کی وجہ سے بیشتر مصنفین واجد علی شاہ کے ساتھ خاطر خواہ انصاف نہیں کرسکے۔ چونکہ ایک تخلیق کار کی وجہ سے وہ دل دردمند رکھتے تھے اور بہت سی بے اعتدالیوں کے باوجود انھیں اپنے عہد اور ماحول سے پوری طرح آگہی تھی۔ واجد علی شاہ کی شخصیت ادب اور سیاست دونوں حوالوں سے ممتاز اہمیت کی حامل ہے اور اس کا ذکر تواتر کے ساتھ ہوتا رہا ہے یہ الگ بات ہے کہ اس میں منفی باتیں زیادہ آگئی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب واجد علی شاہ کی اس لحاظ سے اہم قرار دی جاسکتی ہے کہ اس سے ادیب واجد علی شاہ کا جہاں مکمل احاطہ ہوتا ہے وہیں حکمراں کے طور پر بھی ان کی خدمات کا کسی قدر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دو ابواب واجد علی شاہ کی حیات اور پس منظر سے متعلق ہیں ان ابواب سے واجد علی شاہ کی زندگی اور ان کے زمانے کا خاطر خواہ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مختصر ہوتے ہوئے بھی ان ابواب میں ضروری معلومات مستند ماخذ کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ تیسرے باب میں واجد علی شاہ کی تصنیفات اور ان کے کلام کی خصوصیات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ کوکب قدر نے واجد علی شاہ کی تصنیفات و تالیفات کا بہ لحاظ زمانۂ تصنیف ایک جدول بنایا ہے اس کے بعد کے صفحات میں ان کتابوں پر تحقیقی و تنقیدی نوعیت کا تبصرہ ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف نے ان کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ 'ایمان' (کلیات سلام) اس کے ذیل میں منصف نے لکھا ہے ''کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ صفحہ 2 سے 206 تک 'دفتر اول' ہے جس میں ردیف وار سلام درج ہیں۔ صفحہ 207 سے 242 تک 'دفتر دوم' ہے جس میں ایک تضمین، دو مخمس، اکانوے رباعیاں، چھ قطعے اور آخر میں بادشاہ کے سلام پر ضرغام الدولہ بہادر کا مخمس ہے۔'' (ص 287) آگے لکھتے ہیں ''دفتر اول میں چھپے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق ننانوے سلام ہیں۔ آخری 'سلام مثلث' میں ہے۔ ایمان کی دوسری چھاپ میں اسے متفرقات کے حصے میں رکھا گیا ہے۔'' (ص 287)۔

اسی طرح 'ثبات القلوب جلد اول' کے تحت یہ عبارت بھی نہایت اہم ہے۔ ''اس مثنوی کے تین قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ تینوں نسخے ناقص اور تینوں اہم ہیں۔ ایک سے آغاز اور ایک سے اختتام کا علم ہوتا ہے۔'' (ص 337) مثنوی عشق نامہ سے متعلق مباحث بہت اہم ہیں، جن لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مثنوی اسیر کی ہے مصنف نے مختلف تحقیقی طریقہ کار سے یہ ثابت کیا ہے کہ عشق نامہ کے مصنف واجد علی شاہ ہیں نہ کہ اسیر۔ اسیر کا یہ بیان بھی اس ضمن میں مصنف نے نقل کیا ہے۔ ''میں نے حسب الحکم اسے نظم کیا، سن کے بہت خوش ہوئے، مجھے بھی ان کی خوشی سے مطلب تھا'' (ص 390)۔ کوکب قدر نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ اسیر کی ایک عشقیہ مثنوی 'درۃ التاج' ہے جو واجد علی شاہ کی فرمائش پر کہی گئی ہے۔ اس کے چند شعر بھی درج کیے گئے ہیں۔

کوکب قدر نے اس مثنوی کی فنی اور شعری خوبیوں کے بارے میں بھی لکھا ہے۔

صفحہ 453 تا 520 میں مصنف نے دیگر باتوں کے علاوہ خطاطی کے مختلف نمونوں اور عہد شاہی کے بعض اشتہارات کے ذریعے اس ثقافتی منظر نامے کو مزید روشن کیا ہے۔ آخری دو ابواب میں واجد علی شاہ کی نثر اور شاعری کا احاطہ کیا گیا ہے۔ نثری حصے میں واجد علی شاہ کے مجموعۂ خطوط کی تعداد، سبب تالیف، مجموعوں کی افادیت، مراسلہ یا مکالمہ، اسلوب میں تنوع، نیز بیگمات کے مجموعے جیسے ذیلی عناوین کے تحت دلچسپ معلومات دی گئیں ہیں۔ نثر کا یہ باب بنیادی طور پر واجد علی شاہ کی خطوط نگاری پر محیط ہے۔ خلاصہ کلام سے پہلے واجد علی شاہ کی شاعری کا احاطہ کیا گیا ہے جس میں ان کی غزل گوئی، مرثیہ نگاری، نوحہ گوئی، گیت کاری اور مثنوی نگاری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے واجد علی شاہ کی مثنوی 'ثبات القلوب' کو اردو کی طویل ترین مثنوی قرار دیا ہے (48150 شعر ص 651)۔

تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ واجد علی شاہ کو عام طور پر افسانوی شہرت حاصل ہے۔ ان کے بارے میں حتمی باتیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ اس تناظر میں یہ کتاب نہایت اہم اور قابل قدر ہے اور تاریخ کی ایک نامور شخصیت کے کارناموں کو نہایت مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں مراجع و مصادر کے ساتھ ساتھ اشاریہ اور چند اہم تصویریں بھی شامل ہیں۔

اردو ڈراموں کا انتخاب

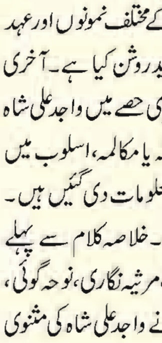

مرتب: پروفیسر محمد حسن
صفحات: 581، قیمت: 145 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ریحانہ فاطمہ

پروفیسر محمد حسن ترقی پسند تحریک کے نہایت فعال اور نمائندہ ادیب تھے۔ ڈراما ان کی

اولین ترجیحات میں سے تھا۔

مذکورہ کتاب اردو کے ان اٹھارہ ڈراموں کا مجموعہ ہے جن کی تخلیق آزادی کے بعد کھلی فضا میں ہوئی اور اس میں شامل تمام ڈرامہ نگار اس صنف میں اپنا اہم مقام رکھتے ہیں۔ کتاب میں شامل سبھی ڈرامے میں کسی نہ کسی ہندوستانی مسئلے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ان میں بعض ڈرامے تو ایسے ہیں جنھیں آج بھی کافی مقبولیت حاصل ہے اور اس کے اسٹیج ہونے کی خبر ملتے ہی شائقین کی بھیڑ امڈ پڑتی ہے جیسے آگرہ بازار، ہلہ بول اور ضحاک وغیرہ۔ ان میں بعض ڈراموں کو ریڈیائی شکل میں بھی پیش کیا گیا ہے جیسے شمیم حنفی کا مٹی کا بلاوا اور ضحاک کو آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے پیش کیا گیا اور سامعین نے اس ڈرامے کو پسند کیا۔

اس انتخاب کا پہلا ڈرامہ 'آگرہ بازار' ہے یہ ڈرامہ بیسویں صدی کے مشہور ڈرامہ نویس اور اداکار حبیب تنویر نے لکھا تھا جس میں 19 ویں صدی کے آگرے کو پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ 'آگرہ بازار' میں نظیر کے دور کی سماجی عکاسی کی گئی ہے لیکن نظیر دور دور تک ڈرامے میں نظر نہیں آتے۔ حالانکہ ذکر آگرہ ہو اور نظیر کا ذکر خیر نہ ہو یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے جس نے اردو میں پہلی بار بازار، میلوں اور عام سماجی رویے کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا۔

دوسرا ڈرامہ ریوتی سرن شرما کا 'انسان' ہے جس میں زندگی اور موت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک زندگی، موت سے سوال کرتے کرتے خود موت کے آغوش میں چلی جاتی ہے۔ اس ڈرامے میں زندگی اور موت کے فلسفے کو بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

آزادی کے بعد اردو میں ڈرامہ لکھنے والوں میں ایک نسوانی زاہدہ زیدی کی ہے جن کا انتقال ابھی کچھ عرصہ پہلے ہوا۔ ان کا ڈرامہ 'وہ صبح کبھی تو آئے گی' اس مجموعہ میں شامل ہے جس میں عورت کے ایک روپ کو دکھایا گیا ہے۔ ایک ایسا روپ جو بالخصوص ہندوستان اور بالعموم ایشیا کی عورتوں کا مقدر بن چکا ہے۔ ان کی گھریلو زندگی کسمپرسی میں گزرتی ہے اور وہ کس طرح مختلف دکھوں کو برداشت ہی نہیں کرتی بلکہ بحسن وخوبی جھیلتی ہے اور اُف بھی نہیں کرتی۔ ہمیں آزادی تو مل گئی مگر کیا ان مظلوم اور پسماندہ خواتین کو اپنے حقوق ملے ہیں۔ آج بھی سماجی رسومات کے نام پر روا ظلم وستم ان خواتین کی قسمت ہے۔

مرتب کا ڈرامہ ضحاک کے متعلق خود ڈرامہ نگار محمد حسن کی رائے دیکھیے کہ ''کس طرح اقتدار کے آگے انسانی تہذیب کے مقدس ترین اداروں کے سربراہ جھک جاتے ہیں اور اس کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ ضحاک ضمیروں کی اسی خریداری اور سوداگری کی کہانی ہے۔''

ڈرامے کے اس انتخاب میں ایک اہم نام ابراہیم یوسف کا ہے اور ان کے ڈرامے 'روبینہ' کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ ایک مخصوص نوعیت کا نفسیاتی ڈرامہ ہے جس میں مردوں کی مختلف نفسیات کا جائزہ فطری انداز میں لیا گیا ہے۔ بقول مرتب ''یہ ان کی فنکاری کا اعلیٰ نمونہ ہے اور وہ لوگ آج بھی شاہد ہیں جنھوں نے اس ڈرامے کو اسٹیج پر دیکھا تھا۔''

اردو میں تنقید سے ڈرامے کی طرف سفر کرنے والوں میں ایک سرفہرست نام شمیم حنفی کا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو کئی بہترین ڈرامے دیے۔ ان کا تحریر کردہ ڈرامہ 'مٹی کا بلاوا' ہے۔ یہ ڈرامہ بھی ریڈیو سے کئی بار نشر ہو چکا ہے جب کہ رفعت سروش کا ڈرامہ 'عورت' بہت ہی خوبصورت ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامے میں عورت کی تخلیق کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ایک رقاصہ کے ذریعے اس کو پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح مالک حقیقی نے عورت کی تخلیق کی اور کن مراحل سے گزرنے کے بعد اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی ہے اور کیسے وہ دنیا کی جدوجہد میں کامیاب ہوتی ہے۔ اس انتخاب میں ایک خوشگوار اضافہ مشہور تھیٹر آرٹسٹ صفدر ہاشمی کے ڈراموں کی شمولیت ہے۔ ان کے دو ڈرامے 'ہلہ بول' اور عورت مذکورہ کتاب میں شامل ہے۔ اس میں عورت کے ایک مخصوص کردار کو پیش کیا گیا ہے جب کہ دوسرا ڈرامہ ہلہ بول کا موضوع ہڑتال ہے۔ صفدر ہاشمی کے ڈرامے دراصل نکڑ ناٹک ہوتے ہیں جنھیں کسی مخصوص اسٹیج کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہلہ بول ڈرامے کے اندر ڈرامہ ہے۔ یہ صفدر ہاشمی کے کامیاب ترین ڈراموں میں سے ایک ہے۔

ساگر سرحدی کا تحریر کردہ ڈرامہ 'مسیحا' اس انتخاب کا سب سے آخری ڈرامہ ہے اور یہ منٹو کی کہانی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے کافی مشابہ ہے۔ ساگر سرحدی نے اس ڈرامے کو نہایت سادگی اور بے ساختگی سے پیش کیا ہے۔ اس ڈرامے کا موضوع بھی تقسیم وطن ہے اور اس کا دو بھائیوں کے ذہن پر اتنا اثر پڑتا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کردیتے ہیں۔ فسادات کی اس کالی آندھی میں سنت رام کی بہن سیتا کا جنسی استحصال کیا جاتا ہے۔ آخر میں سیتا کی زندگی کو دیکھ کر سنت رام کو صدمہ پہنچتا ہے اور خودکشی کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ دراصل سنت رام کی بہن جنسی استحصال کی ایک علامت ہے۔ یہ کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا ڈرامہ ہے جس میں عام آدمی سے لے کر فوجی کیپٹن تک کے کردار کو بخوبی دکھایا گیا ہے۔

کتاب میں محمد حسن نے پیرایۂ اظہار اور تعارف کے عنوان سے بائیس صفحات قلمبند کیے ہیں۔ اول الذکر کے تحت ڈرامے کی تاریخ اور اس کے اجزائے ترکیبی کو نہایت بسیط انداز میں پیش کیا گیا ہے جو کتاب کا حاصل مطالعہ بھی ہے اور ڈرامے کی تفہیم میں معاون و مددگار بھی۔

قومی کونسل کے ذریعے اس کتاب کی اشاعت ایک فال نیک سے کم نہیں ہے۔ ادبی حلقوں میں خاص طور سے ڈراموں کے شائقین ناقدین اور طلبہ کے لیے یہ ایک مفید کتاب ثابت ہوگی۔

پرواز (خودنوشت سوانح عمری)

مصنف: اے پی جے عبدالکلام

مرتب: ارون تیواری، مترجم: حبیب الرحمٰن چغانی

صفحات: 200، قیمت: 67 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عبدالحمید، D-102/1، شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'پرواز' اول پاکر جین العابدین (ابوالفاخر زین العابدین) عبدالکلام کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ اس کی ترتیب وتالیف ارون تیواری نے کی ہے۔ ارن تیواری برسوں تک 'آکاش' میزائل کی تشکیل و تکمیل میں اے پی جے عبدالکلام کی تجربہ گاہ میں انھیں کی زیر تربیت کام کرچکے ہیں اور سفر وحضر میں ان کے ساتھ بار بار رہے ہیں۔

اے پی جے عبدالکلام کی پیدائش 1931 میں رامیشورم تمل ناڈو میں ہوئی۔ ان کے والد جین العابدین (زین العابدین) اور ان کی والدہ آشی اما گرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھیں مگر ان کی تعلیم وتربیت اور پرورش و پرداخت میں کوئی کسر باقی نہ رکھی اور اپنی زندگی کے آخری لمحے تک ان کی تعلیم وتربیت میں انھیں خوب سے خوب تر بنانے میں ہمیشہ کوشاں رہیں۔ یہ ان کے والدین کی تربیت کا ہی اثر تھا کہ وہ نہ صرف ایک عظیم سائنس داں کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں بلکہ ان کا شمار ہندوستان بلکہ دنیا کے مہذب اور شریف النفس انسانوں میں ہوتا ہے۔ ان کی انتھک محنت، کوشش اور لگن کی وجہ سے آج ہندوستان کا شمار بین الاقوامی سطح پر طاقتور ایٹمی ملک میں ہوتا ہے۔ انھیں کی علم وتجسس کی بدولت ہندوستان نے یکے بعد دیگرے اگنی، پرتھوی، آکاش، ترشول اور ناگ جیسی میزائلوں کا تجربہ کیا اور پوری دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ بین الاقوامی سطح پر ایٹمی میدان میں وہ کسی سے کم

نہیں ہے۔ مذکورہ کتاب میں اے پی جے عبدالکلام کی پیدائش، والدین اعزا و اقربا، احباب و اساتذہ، شہر، وطن، تعلیم و تربیت، ملازمت بالخصوص میزائل کی تشکیل و تکمیل ان کی جدوجہد، دیوانہ وار وارفتگی تفصیل سے مرقوم ہیں۔

اے پی جے عبدالکلام نے رامیشورم المنیتری اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ شوارٹس ہائی اسکول راماناتھ پورم سے ہائی اسکول کی تعلیم سینٹ جوزف کالج ترچی سے انٹرمیڈیٹ اور بی ایس کی تعلیم مکمل کی۔ MIT مدراس سے بی ٹیک (فضائی انجینئرنگ) کیا۔ MIT سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد تربیت کے لیے بنگلور کا سفر کیا۔ یہاں پر انھوں نے ہندوستان ایرونوٹکس لمیٹڈ (HAL) میں ہوائی جہاز کے انجن کی اوور ہالنگ کی اور اسی اثنا میں وہ فضائی رموز سے آگاہ بھی ہوئے۔ HAL سے نکلنے کے بعد انھوں نے ملازمت کے لیے ایئر فورس سلیکشن بورڈ (AFSB) دہرہ دون اور وزارت دفاع کی ٹیکنیکل ڈیولپمنٹ اینڈ، روڈکشن (DTD&P (Air) کے لیے درخواستیں بھیجیں دونوں جگہوں پر انھوں نے انٹرویو بھی دیا۔ ان کی تقرری 1958 میں بحیثیت ڈائرکٹر DTD&P دہلی میں ہوئی۔ یہیں پر ملازمت کے دوران ملک اور بیرون ملک کے مشہور سائنسدانوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ Air Craft and Armament Tesling Unit (A&ATU) کانپور Aeronautical Development Establishment (ADE) بنگلور میں بطور سائنسداں کام کیا جس کا اثر یہ ہوا کہ ان کی تقرری انڈین کمیٹی فار اسپیس ریسرچ (INCOSPAR) میں بطور راکٹ انجینئر کے ہوئی۔ اس کے سلسلے میں کچھ ایام انھوں نے National Aeronautics and Spacie Administration (NASA) امریکہ میں گزارا۔ 21 نومبر 1963 کو ہندوستان کا پہلا راکٹ لانچ ہونے والا تھا۔ NASA سے واپسی کے بعد اے پی جے عبدالکلام اس مہم سے جڑ گئے اور ریٹائرمنٹ کے بعد کئی سالوں تک Indian Satellite Launch Vehical سے جڑے رہے اور SLV1, SLV2 اور SLV3 کے پروجیکٹ پر کام کیا اور ہندوستان کو اگنی، پرتھوی، آکاش اور ناگ جیسے میزائل عطا کیے۔ یہ ان کی کوشش اور محنت کا ہی نتیجہ تھا (جس میں ان کی ایمانداری بھی شامل تھی) کہ آج ہندوستان کا شمار بین الاقوامی میزائلی طاقت میں ہوتا ہے۔

مذکورہ کتاب جہاں ایک طرف اے پی جے عبدالکلام کی اسلحہ سازی کی زندگی سے عبارت ہے۔ وہیں اس کتاب میں ان کے خاندانی حالات، ان کی زندگی کے دیگر پہلوؤں مثلاً خدائے واحد پر یقین کامل، ان کی منکسر المزاجی، ان کی انتھک محنت اور سب سے بڑی بات ملک وقوم کے خود سپردگی، ان کے دوست واحباب، اساتذہ و اتالیق، انعامات و اکرامات ہندوستان کے مشہور سائنسدانوں پر توجہ صرف کی گئی ہے۔ یقیناً یہ کتاب نہ صرف اے پی جے عبدالکلام کی سوانح حیات ہے، بلکہ ہندوستان کی موجودہ تاریخ بھی ہے جس میں اس زمانے کے دفاعی تحقیقی اور ترقیاتی پروگراموں کا بتدریج ذکر کیا گیا ہے۔

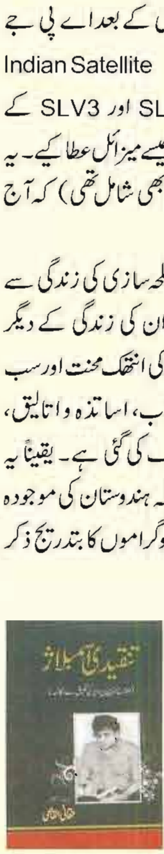

تنقیدی اسمبلاژ

ترتیب کار: حقانی القاسمی
صفحات: 456، قیمت: 185 روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: فیروز احمد عثمانی، سی-11، سیکٹر-21، نوئیڈا، یوپی

'تنقیدی اسمبلاژ' صلاح الدین پرویز کی تخلیقات پر اردو دنیا کے مشہور تنقید نگاروں کے مضامین کا مجموعہ ہے جسے ان کے عقیدت مند دوست حقانی القاسمی نے ترتیب دیا ہے۔ اس مجموعے میں صلاح الدین پرویز کے فکر وفن کی تفہیم جن حضرات کی نگارشات سے کرائی گئی ہے۔ اس میں 'فکریات کی ایک نئی کتاب' کے عنوان سے حقانی القاسمی نے صلاح الدین پرویز کے شرنگار اور تحیر سے مزین شبد سے سلسلہ روحانیت اور آفاقیت کو جوڑا ہے۔ ان کا ایک اور مضمون 'چندن بدن سے لپٹا عشق ناگ' بھی اس مجموعے کی زینت ہے۔

حقانی القاسمی دنیائے ادب کے کوہ کن ہیں۔ وہ قلم کے تیشے سے ادب کی جوئے شیر نکالنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اسی کوہ کنی کے نتیجے میں صلاح الدین پرویز کی پہلی برسی پر یہ مجموعہ وجود پذیر ہوا ہے ورنہ اتنے فکر انگیز مضامین کہیں بکھر کر غائب ہو جاتے اور کتابی شکل میں نہیں ہوتے اور نہ تشنگان شعر و ادب مختلف اور منفرد اسلوب بیان اور نئی جہتوں سے آشنا ہوتے اور نہ انھیں علم ہوتا کہ مقررہ تخلیقی ادبی رویوں کو نظر انداز کر کے شعری کائنات کیسی ہوتی ہے اور ادب کی تاریخ اور اس کا جغرافیہ کیسے بدلتا ہے۔

جدید اسلوب بیان کے ساتھ ہی اس کتاب کے عنوانات قائم کرنے میں بھی جدت سے کام لیا گیا ہے۔ دستک کے تحت جو مضامین آئے ہیں وہ قاری کے ذہن و دماغ میں پنہاں علامات و مقامات کی دستک ہیں جس کا علم زیادہ تر ادیبوں کو نہیں ہوگا۔ 'ژاژ نگیٹو جنگل' کے عنوان سے بشیر بدر اور آشفتہ چنگیزی کے مضامین مروجہ شاعری کا (Negative) انکار ہیں۔ ژاژ ایک طویل نظم ہے جس میں کوئل کی کوک، بلبل کی چہکار، پپیہے کی پکار نہیں ہے۔ ایسی شاعری سے محظوظ ہونے کے لیے نہ صرف ذہن رسا بلکہ دیوار کے آر پار دیکھنے والی نگاہ درکار ہے۔ گھر کا لفظ صلاح الدین پرویز کے یہاں چھتوں اور دیواروں والا گھر نہیں ہے بلکہ ایک لازوال تعلق کا استعارہ ہے۔ گویا عنوانات مضامین کے مفہوم کی مناسبت سے طے کیے گئے ہیں۔

ایک عنوان 'آئیڈنٹیٹی کارڈ' ہے۔ اس میں صلاح الدین پرویز کی ادبی شناخت (Identity) کا ذکر ہے۔ اسی میں کنفیشن (Confession) روایت سے بغاوت کا اقرار نامہ ہے۔ پرماتما کے نام آتما کا پتر میں روحانی رشتوں کی بات کہی گئی ہے۔ کتاب عشق میں عکس نامۂ عشق، روحانی مکاشفات کی تمثیل اور فنافی العشق کا بیان ہے۔ بنام غالب میں غالب کی غزلوں پر نظمیہ تجزیہ ہے۔ اسی طرح اسلوبیات کے زیر عنوان صلاح الدین پرویز کے اسلوب اور فن کا بیان ہے۔ خراج عقیدت کے عنوان سے عنبر بہرائچی، رئیس الدین رئیس اور شبنم عشائی کے اشعار صلاح الدین پرویز کو بطور خراج پیش کیے گئے ہیں۔ یوں تو پوری کتاب ہی خراج عقیدت ہے مگر اس کے لیے ایک الگ سے عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ایک باب ان کی نظموں کے تجزیے کے لیے مختص ہے۔ 'دی وار جرنلس' عنوان ان کے اسی نام کے ناول کے لیے دیا گیا ہے۔ یہ ایک ناول ہے جو آج کے پر درد منظر نامے پر تخلیقی آتما کی اتھاہ پیڑا اور کراہ کا استعارہ ہے۔ ناول کا پہلا حصہ عراق اور گجرات کے واقعات کے تناظر میں اس عہد کی دہشت گردانہ چیرہ دستیوں کی جانب نگراں ہے جو عالمی سطح پر صداقت جبر اور دہشت کے علامیوں کی تفصیل سمیٹے ہوئے ہے۔ اس ناول میں عراق کو صلاح الدین پرویز نے عالم گیر ثقافت کا سمبل بنایا ہے۔

اس مجموعے کی ترتیب حقانی القاسمی نے اس طرح کی ہے کہ اس ترتیب پر تخلیق کا گماں ہوتا ہے۔ سچ ہے تخلیق کار جو بھی کرتا ہے اس میں تخلیقی رنگ آ ہی جاتا ہے۔ خواہ وہ ترتیب کاری ہی کیوں نہ ہو۔

حقانی القاسمی قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے صلاح الدین سے متعلق بکھرے مضامین کو کتابی شکل دے کر زبان و بیان کے ایک انوکھے اسلوب سے ادب کے عام

قاری کو روشناس کرایا ہے جو تہہ در تہہ معنویت کا حامل ہے۔ امید ہے اردو بستیوں میں اس کی رسائی ہوگی اور لوگ اسے پسند کریں گے۔

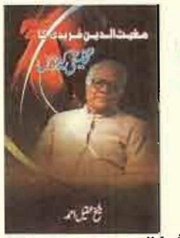

مغیث الدین فریدی کا تخلیقی کینوس

مصنف: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

صفحات: 200، قیمت: 200 روپے

مبصر: اسرار احمد، قاسمی B-832، گلی نمبر 22

موتی مسجد روڈ، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی 25

زیرِ نظر کتاب 'مغیث الدین فریدی کا تخلیقی کینوس' ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا اپنے استاد گرامی مغیث الدین فریدی کی حیات اور ادبی خدمات پر محیط ایک تنقیدی کارنامہ ہے۔ کتاب آٹھ ابواب پر منقسم ہے اور ہر باب قاری کو قیمتی معلومات اور دلچسپ انکشافات سے روبرو کراتا ہے۔ کتاب کے بالاستیعاب مطالعے سے فریدی مرحوم کی ہمہ جہت ادبی صلاحیت اور میدانِ شعر و ادب میں ان کی عبقریت مبرہن ہوجاتی ہے۔

سوانحی کوائف، یادیں، باتیں، سلسلۂ شعر و سخن، نعت گوئی، منقبتی شاعری، غزلیہ آہنگ، تاریخ گوئی خاص ابواب ہیں۔ مذکورہ بالا ابواب میں فاضل مصنف نے فریدی مرحوم کی ولادت، خاندان، عہدِ طفولیت، تعلیم و تربیت، ادبی رجحانات اور سرگرمیوں پر بطورِ خاص روشنی ڈالی ہے۔ یادیں اور باتیں کے عنوان سے ایک شاگردِ رشید (شیخ عقیل احمد) نے اپنے استادِ شفیق (مرحوم فریدی) کے ساتھ اپنی عقیدت اور شب و روز کا خاکہ پیش کیا ہے۔ بابِ شعر و سخن میں فریدی مرحوم کی شاعری کے آغاز، ان کی شاعرانہ طبیعت، انداز و آہنگ اور تخلیقی صلاحیت کا بھرپور تعارف کرایا گیا ہے۔ مغیث الدین فریدی ایک سچے محبِ رسول تھے اس لیے انھوں نعتیہ شاعری میں بھی قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے منقبتیں بھی خوب لکھی ہیں جسے دیکھ مصنف فرماتے ہیں کہ فریدی اگر صرف تقدیسی (غالباً ان کی مراد پاکیزہ اصنافِ سخن سے ہے) شاعری ہی کرتے تو بھی ان کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا۔

اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے مرحوم فریدی کی غزل گوئی، نعت گوئی، تاریخ نگاری، تضمین نگاری، نظمیہ شاعری اور مزاحیہ شاعری پر گفتگو سے قبل ہر عنوان کے تحت مبسوط تعارفی اور تمہیدی تبصرہ کیا ہے جو کہ بظاہر کتاب کے ٹائٹل سے لاتعلق نظر آتا ہے لیکن درحقیقت نفسِ مضمون سے پہلے تفہیمِ مطالب میں آسانی کی غرض سے جس کی حیثیت ابتدائیہ کی ہے۔ یہ یقیناً فاضل مصنف کے گہرے مطالعہ اور ناقدانہ بصیرت کی دلیل ہے۔ اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے اردو کے صاحبِ طرز نقاد حقانی القاسمی رقمطراز ہیں ''یہ کتاب مغیث الدین فریدی کے تخلیقی وجود سے ایک زندہ تنقیدی مکالمہ ہے۔ مغیث الدین فریدی کی نوائے سرمدی کو ایسے ہی نورِ نقد کی ضرورت تھی۔ خونِ جگر سے خراجِ عقیدت پیش کرنے کی یہ ایک روشن مثال ہے اور ایک ایسے دور میں جب کہ اساطین و صنادید ادب بھی اجتماعی ثقافتی حافظے سے محو ہوتے جارہے ہیں اپنے استاد کو یاد رکھنا اور ان کے تخلیقی تجربے سے دنیا کو روشناس کرانا بہت بڑی بات ہے۔''

کتاب کے آخر میں مصنف نے 'شعاعیں' کے نام سے عہدِ حاضر کے معتبر اصحابِ نقد و نظر کے منتخبہ اقتباسات کو یکجا کیا ہے جو زیرِ تبصرہ کتاب کو اعتبار و وقار بخشتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر قارئین کو اس کتاب کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ ہوسکے گا۔ اس سے قبل بھی مصنف کی کئی اہم کتابیں شائع ہوکر قبولیتِ عام حاصل کرچکی ہیں ان میں ''غزل کا عبوری دور، فنِ تضمین نگاری تنقید و تجزیہ، مغیث الدین فریدی اور قطعاتِ تاریخ، ادب اسطور اور آفاق، فکشن کے فنکار: پریم چند اور شکیل الرحمٰن، قومی شاعری اور مغیث الدین فریدی'' شامل ہیں۔ مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ زیرِ نظر کتاب 'مغیث الدین فریدی کا تخلیقی کینوس' اردو دنیا کو ایک شاگردِ رشید کا اپنے جلیل القدر استاد کی حیات و خدمات اور فکر و فن پر مشتمل ایک شاندار تحفہ ہے۔

پیکر اور پرچھائیاں

مصنف: محمد اسد اللہ

صفحات: 212، قیمت: 104 روپے

ناشر: مصنف

مبصر: ڈاکٹر عمر رضا، CIL/SLL&CS، جے این یو، نئی دہلی 67

اردو زبان و ادب کے فروغ میں شہر ناگپور کے ایک انشائیہ نگار محمد اسد اللہ کی زیرِ تبصرہ کتاب بعنوان 'پیکر اور پرچھائیاں' تحقیقی و تنقیدی نوعیت کے اٹھارہ مضامین پر مشتمل ہے اور اس میں سے گیارہ مضامین (مہاراشٹر میں طنز و مزاح، ودربھ میں اردو افسانے کا آغاز و ارتقا، ودربھ میں مزاح نگاری، مراٹھی ادب میں طنز و مزاح، مراٹھی اور اردو شاعری میں جدید رجحانات، ناگپور میں ظرافت، مراٹھی ادیب سانے گروجی، سیونس: انکشاف کے آئینے میں، طرفہ قریشی، ناظم انصاری: ایک منفرد مزاحیہ شاعر، اور 'خورشید آرا بیگم') کا تعلق شہر ناگپور اور ودربھ کے ان ادیبوں اور شاعروں سے ہے جنھوں نے اردو ادب کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر رکھا ہے۔ بقیہ مضامین میں انشائیہ، تحریکِ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ، اقبال، پریم چند اور منٹو وغیرہ کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ یہ مضامین بھی اچھے ہیں لیکن اسد اللہ کا تعلق چونکہ مہاراشٹر اور خصوصاً ودربھ سے ہے، اس لیے وہاں کی ادبی صورتحال پر ان کی گرفت مضبوط نظر آتی ہے۔

مضمون بعنوان 'مہاراشٹر میں طنز و مزاح' مہاراشٹر کے اردو طنز و مزاح نگاروں کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، راجہ مہدی علی خاں اور خواجہ عبدالغفور کو مہاراشٹر کا ثابت کیا گیا ہے کیونکہ بقول ڈاکٹر محمد اسد اللہ ''آزادی کے بعد مہاراشٹر میں خواہ نثر ہو یا نظم طنز و مزاح کی بھرپور نمائندگی کرنے والے زندہ دل فنکاروں کی ایک ایسی کھیپ سامنے آئی جن کے قہقہوں اور طنزیہ مسکراہٹوں کو ادب کے ایوان میں شناخت ملی، ان کے قلم سے علاقائی ظریفانہ ادب کا سر اونچا ہوا اور مزاحیہ ادب کے خزانے میں اضافہ ہوا۔ اردو میں طنز و مزاح کی تخلیق کے لیے چند مراکز مشہور تھے۔ لاہور، لکھنؤ اور حیدرآباد بعد ازاں بغیر اس قسم کا کوئی مرکز قائم کیے ہوئے کئی مزاح نگار ممبئی میں اکٹھا ہوگئے تو ان قلمکاروں نے مرکزی حیثیت حاصل کرلی۔ ان میں بیشتر مہاجر ہی سہی مگر تادمِ آخر ان کی شہرت ممبئی ہی کے کھونٹے سے بندھی رہی۔ ان میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، راجہ مہدی علی خاں اور خواجہ عبدالغفور قابلِ ذکر ہیں۔'' (ص 44)

یوسف ناظم پرویز ید اللہ مہدی، سلمیٰ صدیقی، فیاض احمد فیضی، داؤد کاشمیری، علامہ بمباٹ (عبدالحمید بوبیری) اور اسحاق ایوبی وغیرہ سے مہاراشٹر میں اردو طنز و مزاح نگاری کی صورتِ حال کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مضمون بعنوان 'ودربھ میں اردو افسانے کا آغاز و ارتقا' سے ودربھ کے علاقے میں اردو افسانے کی صورتحال کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے لکھا ہے کہ 'مہاراشٹر اسٹیٹ کو سرکاری انتظام کے تحت ممبئی، پونہ، اورنگ آباد اور ناگپور ڈویژن کے نام سے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ موجودہ ودربھ گیارہ اضلاع پر مشتمل ہے۔ اس کا مشرقی علاقہ برار کہلاتا ہے جس میں امراوتی، ایوت محل،

آکولہ، بلڈانہ اور واشم اضلاع شامل ہیں۔ مغربی حصے میں ناگپور، بھنڈارا، گوندیہ، چندر پور، گڑچرولی، وردھا ضلعے ہیں۔ یہ علاقہ گونڈوانہ کے نام سے مشہور تھا۔ علاقۂ ودربھ میں علمی اور ادبی سرگرمیاں عہد قدیم ہی سے جاری وساری رہی ہیں۔ گونڈوانہ کی یہ نسبت سابق صوبہ متوسط برار میں علمی وادبی شخصیات کے کارنامے یہاں کی علمی فضا کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوئے۔'' (ص 61)

اس کے بعد انھوں نے ودربھ کے اردو افسانہ نگاروں مثلاً عبدالستار فاروقی، قادر نیازی، ریاض رؤوفی، شاکر اورنگ آبادی، فیض انصاری، حمید جمال، شریف اورنگ آبادی، فہمیدہ پروین، زہرہ جبیں، تبسم شفائی، واجدہ تبسم، بانو سرتاج وغیرہ کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ودربھ میں اردو افسانے کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ علاوہ ازیں مضمون بعنوان 'مراٹھی ادب میں طنزومزاح' مراٹھی کے مختلف طنزومزاح نگاروں کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس میں اسداللہ صاحب نے مراٹھی میں طنزومزاح نگاری کے آغاز وارتقا اور اس حوالے سے مروج رجحانات کا احاطہ کیا ہے۔ سری کرشن کولہٹکر سے لے کر جیونت دلوی اور دیگر طنزومزاح نگار کا عمدہ جائزہ پیش کیا ہے۔ مراٹھی اور اردو شاعری میں جدید رجحانات' تقابلی نوعیت کا مضمون ہے جس میں موصوف نے مراٹھی اور اردو شاعری میں آج جس طرح کے رجحانات در آئے ہیں یا جس طرح کی شاعری ہو رہی ہے، اس کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے باوجود اس طرح کے مطالعات سے ادب میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس سمت میں محمد اسداللہ کی یہ کوشش قابل ستائش ہے۔

ڈاکٹر محمد اسداللہ کی کتاب 'پیکر اور پرچھائیاں' میں شامل بیشتر مضامین سنجیدہ ہیں، زبان اچھی استعمال کی گئی ہے اور تجزیاتی وتنقیدی نقطۂ نظر کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے البتہ مضامین کی ترتیب میں کچھ نقص پایا جاتا ہے۔ کتاب کو اگر دو حصوں میں منقسم کر کے پہلے حصے میں تعریف انشائیہ، انشائیہ آزادی کے بعد، تحریک آزادی میں اردو شاعری کا حصہ، شاعری کی تدریس اور ہمارے تعلیمی ادارے، اقبال کا داعیانہ اسلوب، گلی ڈنڈا: ایک تجزیہ اور 'سعادت حسن منٹو کی کردار نگاری' اور دوسرے حصے میں 'مہاراشٹر میں طنزومزاح، ودربھ میں اردو افسانے کا آغاز وارتقا، ودربھ میں مزاح نگاری، مراٹھی ادب میں طنزومزاح، مراٹھی اور اردو شاعری میں جدید رجحانات، ناگپور میں ظرافت، مراٹھی ادیب سانے گروجی، بس یونس: انکشاف کے آئینے میں، طرفہ قریشی، ناظم انصاری: ایک منفرد مزاحیہ شاعر اور خورشید آرا بیگم' کو شامل کیا جاتا تو کتاب کی معنویت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ اس کے باوجود یہ کتاب اچھی ہے اور قارئین اس کے ذریعے خاص طور پر مہاراشٹر کے شہر ناگپور اور اس کے آس پاس کے ودربھ کے علاقوں میں اردو زبان وادب کی کیا صورتحال ہے، اس سے ضرور آگاہ ہوں گے۔

شاید

شاعر: جعفر ساہنی
صفحات: 160، قیمت: 100 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6
مبصر: علیم ہاشمی، 52 ویسٹ ونگ ہاسٹل،
(ایس ایس ہال (ساؤتھ) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

غزل ممتاز صنف شاعری ہے۔ اس کی اہمیت اور معنویت اس قدر ہے کہ بیش تر شعرا نے غزل کو ہی اپنے اظہار خیال کا وسیلہ بنایا اور مقبولیت وتاثیر کا یہ عالم ہے کہ ہر کوئی اس کا گرویدہ۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کا سب سے کثیر سرمایہ غزل میں ہی ہے۔ ولی، میر، غالب اور فیض وفراق کی عظمت اسی سے ہے اور غزل کو مزاج ومعیار انھوں نے ہی عطا کیا۔ موجودہ عہد میں غزل جن شعرا کے حوالے سے متعارف ہے یا جن شعرا کے یہاں فی الوقت غزل پورے آب وتاب اور زیب وزینت کے ساتھ جلوہ گر ہے ان میں ایک نام جعفر ساہنی کا ہے۔ ان کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے ساتھ کہانیاں بھی تخلیق کیں۔ غزل، نظم اور افسانہ ان تینوں صنف میں انھوں نے طبع آزمائی کی اور بہت کامیاب تجربے کیے۔ کلی طور پر ان کی شاعری کا جائزہ لیں تو ان کے یہاں مقدار سے زیادہ معیار پر قوم کا احساس ہوتا ہے اور ساتھ ہی فکر کے ساتھ فن کا قابل قدر برتاؤ ملتا ہے۔ جعفر ساہنی نے ادبی زندگی کا آغاز افسانے سے کیا بعد میں ان کا رجحان شاعری کی طرف ہو گیا۔ انھوں نے متعدد درسی کتابیں بھی لکھیں جو مغربی بنگال میں شامل نصاب ہیں۔

80 غزلوں پر مشتمل زیر تبصرہ کتاب 'شاید' جعفر ساہنی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے اس سے قبل ان کا شعری مجموعہ جس میں نظمیں شامل ہیں 'ہوا کے شامیانے میں' کے عنوان سے منظر عام پر آچکا ہے جسے علمی وادبی حلقوں میں بہ نظر تحسین دیکھا گیا۔ جعفر ساہنی کی غزلیں اور نظمیں موقر ادبی جرائد میں وقفے وقفے سے شائع ہوتی رہی ہیں جو ان کی شاعرانہ توقیر کی علامت ہے۔ کتاب کے ابتدائی چند صفحے پر عصر حاضر کے معروف شاعر اور ادیب علقمہ شبلی کے تاثرات شامل ہیں جس سے جعفر ساہنی کی شخصیت اور شاعری کے گوشے روشن ہوتے ہیں۔

جعفر ساہنی کی غزلیں ان معنوں میں اہم ہیں کہ انھوں نے بہت ہی اہم سلگتے ہوئے اور سنجیدہ وپیچیدہ موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ زندگی کے داخلی اور خارجی دونوں عناصر ان کی شاعری میں یکسانیت کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ الغرض ان کی شاعری امید وناامیدی، روشنی وتاریکی یعنی مثبت ومنفی دونوں پہلوؤں کا سفر ہے:

نظر کوتاہ خود دشمن بنی اپنی   کشادہ دل ہمیشہ خود کہاں نکلا
خوشبو ہوں کبھی کبھی پھولوں کے رس میں ہوں   بے چین وبے قرار نگاہ عکس میں ہوں
عاشقی کے پیام سے نکلو جی حضور کے دام سے نکلو
خود نشاں اپنا اک مزا دے گا جدامجد کے نام سے نکلو

جعفر ساہنی کی شاعری میں جوش وجذبات اور امنگ وآرزو کے بجائے رنج والم اور یاس وحرمان کا بسیرا ملتا ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں جدیدیت پسند رجحان کے اثرات ملتے ہیں۔ ان کی شاعری کا اسلوب جس خمیر سے تیار ہوا ہے وہ جدیدیت سے ملتزم ہے۔ کتاب کا عنوان 'شاید' سے بھی اس کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے:

بے کلی پڑھ رہی ہے دیا کی   کہ گیا جھک کے اک شجر شاید
حیرت میں نہیں ڈالتا اب شہر گماں کو   ہر روم لہو رنگ میں اخبار کا ہونا

انسانیت کی ذلت وخواری کے اسباب وعلل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے لیے اپنی بداعمالی اور کوتاہی کو موردالزام ٹھہراتا ہے ساتھ ہی اچھی تلقین بھی کرتا ہے، اس قبیل کے شعر دیکھیں:

درد الفت کو خوار کر کے ہم   اپنی نظروں میں ہی ذلیل ہوئے
لرزتے ہیں سدا سجدے سے ہمارے   خدا واقف ہے آلودہ جبیں سے
مانوس نظر آنے لگا لحد کا گوشہ   اب خواب سجانے کا بکھیڑا نہیں کرتے

غزل کی اصل شناخت واردات حسن وعشق اور کیفیات قلب وجگر سے ہے اور یہ فن ہے حیات وکائنات کے رموز اور حرکات وسکنات کی خوبصورت عکاسی کا۔ جعفر ساہنی نے داستان عشق ورومان کو فکری ہنرمندی وفنی چابکدستی کے ساتھ اپنے کلام میں پیش کیا ہے

اوراس کے لیے مختلف صنعت وتراکیب کا استعمال کیا ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں:

قلم، کتاب، ڈائری خطوط منتظر مرے — یہ کس نے ان کو چھو دیا کہ سب گلاب ہو گئے

کس شان سے یادوں نے مرے ذہن کو گھیرا — پرکیف ہوا دل میں محبت کا بسیرا

جعفر ساہنی اردو شاعری کے عصری منظرنامے کا ایک نمائندہ اور معروف نام ہے۔ دونوں شعری مجموعے نے ان کی شاعرانہ حیثیت مسلم کر دیا ہے۔

کتاب کی اشاعت وطباعت خوبصورت اور اوراق دیدہ زیب ہیں۔ قیمت بہت مناسب ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ شاعر کی طرف سے ایک تحفہ ہے اور شاعر نے اسے کسی خاص طبقے تک محدود نہ کرکے ہر خاص وعام کا لحاظ رکھا ہے۔ اس معاملے میں وہ قابل قدر اور لائق تقلید ہیں۔ کتاب کے ابتدائی پانچ صفحات میں جعفر ساہنی کی شاعری پر علقمہ شبلی کا اظہار خیال اور پشت پر شمس الرحمٰن فاروقی، جوگندر پال اور کرشن کمار طور جیسے ادبی فن کاروں کے تاثرات کتاب کی ظاہری اور معنوی خوبصورتی میں اضافے کا سبب ہیں۔

آئینہ زندگی

مصنف: رضوان رضوی

صفحات:200، قیمت:140 روپے

ناشر: منظور بک ڈپو 2880، بلبلی خانہ دہلی

مبصر: رضی احمد ندوی، ململی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

رضوان رضوی اردو فکشن کا ایک معروف اور معتبر نام ہے، ساٹھ سال سے زائد عرصے سے اردو افسانے، کہانیاں لکھنے کے علاوہ مختلف رسائل وجرائد سے نہ صرف وابستہ رہے ہیں بلکہ ان کے ادارت کی ذمے داریاں بھی بحسن وخوبی انجام دیتے رہے ہیں اور باوجود ضعف اور کبرسنی کے رضوان رضوی کا ذہن وقلم آج بھی رواں دواں ہیں، جس کی تازہ مثال 'آئینہ زندگی' کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے، جو خود بھی مصنف کی زندگی کا آئینہ ہے۔

'آئینۂ زندگی' رضوان رضوی کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ ان کے ادبی، مذہبی، اخلاقی، تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور اسلامی مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں لکھے گئے اور ملک کے موقر وقیع رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

زیرنظر کتاب کے تمام ہی مضامین اچھوتے اور مختصر ہیں، باوجود اس کے یہ مؤثر اور اسم بامسمیٰ ہیں، اختصار ہی اس کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس میں بیشتر مضامین تبصراتی نوعیت کے معلوم ہوتے ہیں۔

کتاب میں شامل پہلا ہی مضمون جس کا عنوان 'روشنی' ہے۔ اس میں رضوان رضوی نے اپنے بچوں کو مخاطب کرکے جو خوبصورت اور دلنشیں نصیحتیں کی ہیں وہ دراصل آنے والی تمام نسلوں کو مادی سے زیادہ روحانی اور علمی واخلاقی قدروں کو بروئے کار لاکر اس پر عمل پیرا ہونے والے اور محنت ومشقت کے ساتھ دنیا میں کچھ نیا، بہتر اور عمدہ کرنے کی امنگیں پیدا کرتی ہیں۔

کتاب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف معلم اخلاق بن کر سماج میں پھیلی برائیوں، بے حیائیوں، بداخلاقیوں، بداعمالیوں، تہذیب وتمدن کی زوال پذیریوں، مذہب سے دوری، ایمانی کمزوری جیسی تلخ حقیقت کو بیان کرنے کی کامیاب کوشش ہے، شاید اس لیے بھی کہ خود مصنف کے پاس زندگی سنوارنے اور بنانے کا طویل تجربہ ہے، وہ غیرطبعی طور پر نہ صرف اپنے قاری سے قریب ہوتے نظر آتے ہیں بلکہ اثرانداز ہونے کے ساتھ ہی اچھا لٹریچر، عمدہ کردار، آسان وصاف ستھری زبان اور بہتر اخلاق کی تشکیل کرتے نظر آتے ہیں، جس کا عکس کتاب میں شامل مضامین 'اسلام سے ہمارا رشتہ'، 'بچوں کی تربیت میں والدین کا کردار'، 'ہمارا موجودہ معاشرہ'، 'تہذیب کی گراوٹ'، 'اچھی قدریں اور نئی نسل' 'اسلام ہر شعبے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے'، 'دنیا مادیت کے جال میں'، 'منزل کا پتہ نہیں' وغیرہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر 1857 کا ناگفتہ بہ حالات میں جس طرح سرسید نے قوم کی تعلیمی، تعمیری اور ترقی نیز ادبی وسماجی اصلاحات، اخلاقی اور تہذیبی معیار کو بلند کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور مصلح قوم کہلائے ٹھیک اسی طرح رضوان رضوی نے بھی پٹنہ کے بیڑی مزدوروں کے لیے کیا ہے اور وہ بھی ان کی نظر میں کسی مصلح سے کم نہیں۔

رضوان رضوی چونکہ بنیادی طور پر بچوں کے ادیب اور کہانی کار بھی ہیں، اس لیے فکر وفنی دلچسپی، زبان کی سلاست وروانی، شگفتگی اور رنگارنگی کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر ان میں بدرجہ اتم موجود ہے، ساتھ ہی دشوار اور پیچیدہ موضوعات کو بھی سہل وعام فہم زبان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے اور آسان جملوں میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں، رضوان رضوی اپنے بارے میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''جب میں ساتویں کلاس میں تھا تو بچوں کی کہانیاں لکھنے کا چسکا لگا، میری یہ کہانیاں حرم، پیام تعلیم، کھلونا، پھول، نونہال، پھلواری، گلدستہ، آج کل (بچوں کا صفحہ) اور دیگر بچوں کے رسائل میں چھپنے لگیں، میرا پہلا افسانہ 'آرزو' بیسویں صدی، دہلی شمارہ: جون 1951 میں شائع ہوا جو میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'مجھے تم سے نفرت ہے' میں شامل ہے، اس کے بعد ہند وپاک کے چھوٹے بڑے رسائل میں میرے افسانے اور مضامین شائع ہوتے ہیں۔'' (اپنی بات، مختصر۔ مختصر، ص32)

کتاب کی ورق گردانی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رضوان رضوی مسلمانوں کو علمی، دینی، مذہبی، اخلاقی، تہذیبی، تمدنی، سائنسی اور اعتقادی سطح پر نئے تقاضوں سے روشناس کراتے نظر آتے ہیں، انھوں نے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی موضوعات کو اپنے مضامین کی بنیاد بناکر معاشرے پر تنقید اور تعمیر کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں، جو قابل ستائش ہے، موصوف لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کو تعلیم وصحت دونوں میدانوں میں پوری قوت کے ساتھ اترنا چاہیے، آرٹس، سائنس، کامرس، ٹکنالوجی اور دوسرے شعبۂ علوم میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، گھر کے ماحول کو خوشگوار اور مہذب رکھنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے، پوری تیاری کے ساتھ مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہونا چاہیے۔ ٹیکنیکل تعلیم کی طرف بھی بھرپور توجہ دینی چاہیے۔'' (جاگو، ص72)

کتاب نہایت پرکشش اور دیدہ زیب ہے، اس کی کشش کا اندازہ شروع میں مصنف کے مختلف زمانوں کی تصاویر سے بھی ہوتا ہے، مصنف نے چھوٹے چھوٹے اور مختلف موضوعات کے ذریعے اسلامی تعلیمات، سماجی برائیوں، بچوں کی تعلیم وتربیت کے مختلف اور انوکھے، اچھوتے مضامین قلم بند کیے ہیں، جو قوم کی تعمیر، ترقی، تعلیم وتربیت کے لیے مشعل راہ ثابت ہوسکتے ہیں، مصنف کی طرف سے یہی قوم اور آنے والی نسلوں کے لیے دعا بھی ہے:

میرے دامن میں اگر کچھ نہ رہے گا ساقی
اگلی نسلوں کو دعا دے کے چلا جاؤں گا (رضوان رضوی)

اس کتاب کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ بدلتے ہوئے سیاسی سماجی، تہذیبی، اخلاقی اور ثقافتی منظرنامے کے حوالے سے زبان کے برتاؤ، اسلوب کی تازگی اور زندہ روایات وحکایات کی ترجمانی کے حوالے سے رضوان رضوی کے یہ مضامین کا مجموعہ قارئین سے داد حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے۔

سپنے ہوئے سچ

بہتر رابطہ
تقریباً 46,000 بستیوں کو
بارہ ماسی سڑکوں سے
منسلک کیا گیا

اعلیٰ تعلیمی ہدف
سال 12-2011 میں 63 لاکھ
اقلیتی طبقے اور 48 لاکھ درج
فہرست قبائلی طبقے کے طلبہ کو وظیفہ

مِڈ ڈے میل پروگرام
10 کروڑ سے زائد اسکول
بچوں کو پکے ہوئے تازہ
کھانے کی سہولت

نرمان

ترقی کی کہانی
بھارت نرمان کی زبانی

सत्यमेव जयते

وزارت برائے اطلاعات ونشریات
حکومت ہند

ڈاکٹر منموہن سنگھ
وزیر اعظم

محترمہ سونیا گاندھی
صدر یو پی اے

بھارت

سب کے لیے تعلیمی مہم
28,000 ابتدائی اور 6000
ہائر سکنڈری اسکول کھولے گئے

یونی ورسل ایمونائی زیشن
2.5 کروڑ بچوں کو ٹیکا کاری
سے فائدہ پہنچا

جننی-ششو
(زچہ بچہ) سُرکشا پروگرام
ایک کروڑ سے زائد حاملہ
خواتین فیضیاب

davp 22111/13/0101/1213

یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

عہدِ وسطیٰ میں ہندو مسلم ایک زبان بولتے تھے: عرفان حبیب

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کی شودھ پریشد کے زیراہتمام 'ہندی زبان کا فروغ اور اس پر فارسی زبان کے اثرات' پر منعقدہ خصوصی لیکچر سے خطاب کرتے ہوئے ممتاز مورخ پروفیسر ایمریٹس عرفان حبیب نے کہا کہ آج جس طرح اردو ہندی زبانیں ایک دوسرے سے جدا نظر آتی ہیں ایسی علیحدگی تمام عہدِ وسطیٰ کی تاریخ میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ تحریکِ آزادی کے دوران ہمیں دونوں زبانوں میں فرق نظر آنے لگتا ہے جس میں ہندی کو ہندوؤں اور اردو کو مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا جب کہ سارے عہدِ وسطیٰ میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے کہ دونوں اقوام الگ الگ زبانیں بولتی تھیں۔ پروفیسر عرفان حبیب نے کہا کہ زبانوں کو لے کر عہدِ وسطیٰ میں ہمیں کوئی مذہبی تفریق دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اس حقیقت کو انھوں نے امیر خسرو، ابوالفضل، جہانگیر، راجہ ٹوڈرمل اور برنداون کے گوسائیوں کی تحریروں سے ثابت کیا۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ مورخین نے ہندوی اور ہندی لفظ کے غلط معنی پیش کیے۔ انھوں نے تحقیق کے حوالے سے واضح کیا کہ عہدِ وسطیٰ میں یہاں فارسی زبان کا اثر مقامی زبانوں پر پڑنے لگا جیسا کہ مذہبی بھجن کیرتن، سورداس، جائسی، تلسی داس وغیرہ کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے جو بول چال کی سطح پر مشترکہ زبان کی مثال ہے۔ اپنا موقف پیش کرتے ہوئے پروفیسر حبیب نے کہا کہ ہندی سنسکرت سے نہیں بلکہ اشوک کے عہد کی پراکرت زبان سے زیادہ جڑی معلوم ہوتی ہے جس پر ہمیں سنجیدہ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں شعبۂ ہندی کے سربراہ پروفیسر ایم ای زبیری نے پروفیسر عرفان حبیب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے واضح کیا کہ شعبے کے ریسرچ اسکالرس مستقبل میں ان کے مشوروں سے مستفید ہوں گے۔ پروگرام میں پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر اے آر فتیحی، پروفیسر عاشق علی، پروفیسر بھرت سنگھ، ڈاکٹر وید پرکاش، ڈاکٹر آر این شکل، ڈاکٹر شاہل حمید، پروفیسر رمیش راوت، ڈاکٹر امتیاز احمد وغیرہ کے علاوہ بڑی تعداد میں سامعین نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 جنوری 2013

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دھلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اردو

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اردو زبان کے مابین ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ابتدا ہی اردو زبان کے ساتھ ہوئی اور شروع ہی سے اردو زبان غالب رہی ہے اور یہاں کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر صغرا مہدی نے شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقد دو روزہ توسیعی خطبات کے پہلے سیشن میں 'جامعہ اور اردو' کے موضوع پر توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مکتبہ جامعہ نے اردو کے

فروغ میں اہم رول ادا کرتے ہوئے اہم اور مفید کتابیں شائع کیں اور آج بھی یہ سلسلہ برقرار ہے۔ توسیعی خطبات کے دوسرے سیشن میں پروفیسر شاہد حسین نے 'ابلاغیات اور فروغ اردو' کے موضوع پر اپنا توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے ابلاغ عامہ کی تعریف، اہمیت و افادیت اور فروغ اردو پر گفتگو کی۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہناز انجم نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے توسیعی خطبے کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی اور ڈاکٹر خالد جاوید نے دونوں سیشن کی نظامت کی اور ڈاکٹر عمران احمد عندلیب اور ڈاکٹر خالد مبشر نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔ اس موقعے پر شعبے کے اساتذہ میں پروفیسر شمس الحق عثمانی، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر کوثر مظہری ڈاکٹر ندیم احمد اور ڈاکٹر سرورالہدیٰ کے علاوہ ریسرچ اسکالرز اور طلبا و طالبات کثیر تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 جنوری 2013

اقبال پر توسیعی خطبات

نئی دھلی: بیسویں صدی میں از اقبال تا حال نظم میں کئی اسالیب نظر آتے ہیں جو تازہ کار ہیں اور اس عہد میں نظم کے حوالے سے اقبال سے بڑا کوئی نام نظر نہیں آتا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر عتیق اللہ نے شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 'بیسویں صدی میں اردو نظم' کے موضوع پر توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ بیسویں صدی میں نئے علوم کی آمد سے نظموں میں نئے موضوعات در آئے اور لفظیات کا ایک نیا تصور ابھر کر سامنے آیا۔ نئے معانی اور مفاہیم کے لیے نئی ہیئتوں کا تجربہ کیا گیا اور اقبال کا تتبع ان تجربوں میں شامل ہے۔

توسیعی خطبات کے دوسرے سیشن میں پروفیسر عبدالحق نے 'اقبال کی غزل گوئی' کے موضوع پر اپنا توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ادب و دانش کے ساتھ ساتھ عرفانِ نظر کے حصول کے لیے اقبال کو پڑھنا ضروری ہے کہ اقبال دنیائے ادب کا ایک معجزہ ہے۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہناز انجم نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر ندیم احمد اور ڈاکٹر عمران احمد عندلیب نے بالترتیب دونوں سیشن کی نظامت کی، تقریب میں پروفیسر شمس الحق عثمانی، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر خالد جاوید، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر سرورالہدیٰ اور ڈاکٹر خالد مبشر کے علاوہ ڈاکٹر نصیر اظہر، ریسرچ اسکالرز اور طلبا و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 جنوری 2013

پروفیسر شمیم حنفی کا سجاد ظہیر یادگاری خطبہ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو کا پانچواں سجاد ظہیر یادگاری خطبہ پیش ہوا۔ اس خصوصی یادگاری خطبے میں دانشور ادیب و شاعر پروفیسر شمیم حنفی نے شرکت کی۔

انھوں نے میراجی کی شخصیت اور ان کے تخلیقی وجدان کا ایک خوبصورت تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ میراجی کی شخصیت کسی تخلیقی معجزہ سے کم نہ تھی۔ انھوں نے 22,23 سال کی عمر میں دنیا کی اہم زبانوں کے اہم شعرا کا مطالعہ کرلیا تھا۔ ان کی کتاب 'مشرق ومغرب کے نغمے' سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے۔ انھوں نے زور دے کر یہ بات کہی کہ اردو میں اس سے پہلے 'مشرق ومغرب کے نغمے' جیسی کتاب کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس پانچویں سجاد ظہیر یادگاری خطبے کے کنوینر ڈاکٹر کوثر مظہری نے سجاد ظہیر، میراجی اور پروفیسر شمیم حنفی کا تعارف پیش کیا۔ صدر شعبہ پروفیسر شہناز انجم نے پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر ایس ایم راشد کا استقبال کیا۔ جلسے کے صدر پروفیسر ایس ایم راشد نے کہا کہ یہ خطبہ جن کے نام سے منسوب ہے، ان کی شخصیت کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک انقلابی مصنف تھے۔ انھوں نے میراجی کی شخصیت اور شعری کمالات کی بھی ستائش کی۔ آخر میں پروفیسر خالد محمود نے سامعین و حاضرین کا رسمی طور پر شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 فروری 2013

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بیکل اُتساہی سے ملاقات

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آؤٹ ریچ پروگرام کی طرف سے معروف ہندی اردو شاعر پدم شری بیکل اتساہی کے ساتھ ایک شام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر بیکل اتساہی نے طلبہ کو خطاب کیا اور سامعین کے اصرار پر اپنا کلام بھی سنایا۔ کھچا کھچ بھرے یاسر عرفات ہال میں پروگرام کا آغاز جامعہ کے شعبہ ہندی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر رحمان مصور کے افتتاحی کلمات کے ساتھ ہوا۔ بیکل اتساہی نے بچپن کی یادوں کو طلبہ کے ساتھ بانٹتے ہوئے کہا جب انھوں نے شاعری شروع کی تو ان کے والد سخت ناراض ہوئے یہاں تک کہ انھوں نے بیکل صاحب سے قطع تعلق کرلیا۔ بیکل اتساہی نے کہا کہ وہ مشاعروں میں جاتے اور اپنا کلام سناتے تھے جس پر داد وتحسین ملتی تھی۔ اردو شاعری میں نئی جہات میں کام کرنے کے سبب بعض افراد کے ذریعہ خود کو برا بھلا کہنے کی یادیں بھی بیکل اتساہی نے طلبہ کے ساتھ بانٹیں۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، فروری 2013

جامعہ ملیہ میں ٹیگور پراجیکٹ کے تحت مشاعرہ

نئی دہلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ٹیگور جیسی عظیم علمی و ادبی شخصیت پر وزارتِ ثقافت، حکومت ہند کے مالی تعاون سے تحقیق وتراجم کا پروجیکٹ مکمل کیا جارہا ہے جس کے تحت ٹیگور کے نوبیل انعام کے سو سال تک مکمل ہونے کے سلسلے میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر خالد محمود نے اور نظامت معین شاداب نے کی۔ پروفیسر شہناز انجم صدر شعبہ اردو نے سبھی مہمانوں اور شعرا کا استقبال کیا۔

مشاعرے کے کنوینر پروفیسر شہپر رسول نے تمام شعرا کا تعارف پیش کیا۔ ٹیگور پروجیکٹ کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر شہزاد انجم نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ جن شعرا نے کلام پیش کیا ان میں پروفیسر خالد محمود، اظہر عنایتی، پروفیسر شہپر رسول، کرشن کمار طور، نسیم انصاری، شمس تبریزی، جمنا پرساد راہی، ڈاکٹر احمد محفوظ، عالم خورشید، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، راجیش ریڈی، اسرار جامعی، معین شاداب، سلمیٰ شاہین، ڈاکٹر جاوید نسیمی، شاہد اختر، ڈاکٹر ذکی طارق، ڈاکٹر عمیر منظر اور مشکور معینی شامل تھے۔

پریس ریلیز، پروفیسر شہزاد انجم، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 11 فروری 2013

سینٹ اسٹیفنس کالج

اقبال پر سیمینار

نئی دہلی: سینٹ اسٹیفنس کالج کی تنظیم بزم ادب کے زیر اہتمام 'کلام اقبال اور معاصر قدریں' کے موضوع پر ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریٹس سابق صدر شعبہ پروفیسر عبدالحق اور سابق صدر پروفیسر صادق، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر محمد ذاکر نے بطور خاص شرکت کی۔ ادبی نشست کا باقاعدہ افتتاح کالج کے وائس پرنسپل ڈاکٹر سی راجکمار نے کیا اور کہا کہ اردو و فارسی زبان وادب کے ساتھ کالج کا قدیم رشتہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ شروع سے ہی یہاں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو و فارسی زبان کو اہمیت دی جاتی رہی ہے اور اس کالج سے کئی اہم شخصیات فارغ ہو کر نکلی ہیں اور کالج کا نام روشن کیا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور کالج انتظامیہ کی اردو کے طلبا و اساتذہ سے کافی توقعات وابستہ ہیں۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شمیم احمد نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، یکم فروری 2013

تلنگانہ یونیورسٹی، نظام آباد

'علامہ اقبال اور فلسفیانہ فکر'

نظام آباد: شعبہ اردو تلنگانہ یونیورسٹی نظام آباد آندھرا پردیش انڈیا میں ایک روزہ بین الاقوامی اردو سیمینار بعنوان 'علامہ اقبال اور فلسفیانہ فکر' کا 22 جنوری 2013 کو کامیاب انعقاد عمل میں آیا۔ اس سیمینار کا افتتاح پروفیسر دھرماراج ڈین فیکلٹی آف آرٹس تلنگانہ یونیورسٹی نظام آباد اور پروفیسر بیگ احساس شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے شمع جلا کر کیا۔ افتتاحی کلمات ڈاکٹر اطہر سلطانہ صدر شعبہ اردو تلنگانہ یونیورسٹی نظام آباد نے پیش کیے۔ پہلے اجلاس سے پروفیسر دھرماراج ڈین فیکلٹی آف آرٹس تلنگانہ یونیورسٹی نظام آباد، پروفیسر یادگیری پرنسپل تلنگانہ یونیورسٹی نظام آباد، پروفیسر ایس اے شکور سکریٹری اردو اکادمی آندھرا پردیش، ضیاء الدین نیر سکریٹری اقبال اکادمی، مظفر مجاز ممتاز شاعر، صحافی،

ماہر اقبالیات، محمد مظفر الدین فاروقی حال مقیم شکاگو امریکہ نے خطاب فرمایا اور فکر اقبال کے مختلف گوشے خودی، عشق، شاہین، مردِ مومن، قومی یکجہتی وغیرہ کو اجاگر کرتے ہوئے اقبال کو عالمی سطح کا شاعر قرار دیا اور اس بات پر زور دیا کہ اقبال کے افکار کو عام کیا جائے اور اسے نئی نسل تک پہنچایا جائے۔ دوسرے اجلاس میں ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اردو گری راج گورنمنٹ کالج نظام آباد، ڈاکٹر محمد ناظم علی پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ، ڈاکٹر جعفر جری اسسٹنٹ پروفیسر اردو ساتاواہانا یونیورسٹی کریم نگر، ڈاکٹر عتیق اقبال پرنسپل اردو آرٹس کالج حیدرآباد، ڈاکٹر موسیٰ اقبال اسسٹنٹ پروفیسر تلنگانہ یونیورسٹی، محمد نذیر اسسٹنٹ پروفیسر ویمنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی اور محمد اسمٰعیل ریسرچ اسکالر نے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر موسیٰ اقبال نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، محمد عبدالعزیز سہیل، نظام آباد، 23 جنوری 2013

عالمی اردو نامہ

بحرین

بحرین میں عالمی مشاعرہ بیادِ شہر یار

بحرین: مجلس فخر بحرین برائے فروغ اردو کے زیراہتمام عالمی مشاعرہ 'بیادِ شہر یار' کا انعقاد کیا گیا جس میں ہندوستان کے ساتھ ہی پاکستان، دوحہ قطر، سعودی عرب وغیرہ ممالک کے شعرا نے اپنے عمدہ کلام کے ذریعے سامعین سے داد وتحسین حاصل کی۔ مملکت بحرین کے کلچرل ہال نیشنل میوزیم کامپلیکس میں منعقدہ مشاعرہ میں سفیر ہند برائے مملکت بحرین مسٹر موہن کمار نے بطور مہمان خصوصی اور سفیر پاکستان برائے مملکت بحرین مسٹر جوہر سلیم نے بطور مہمان اعزازی شرکت کی۔ صدارت پدم بھوشن وستارۂ امتیاز ایوارڈ سے سرفراز ممتاز ناقد گوپی چند نارنگ نے کی اپنے صدارتی خطبے میں موصوف نے فرمایا شہرۂ آفاق شاعر شہر یار کی یاد کو آپ لوگ بحرین میں زندہ کررہے ہیں جس سے مجھے دلی طمانیت کا احساس ہورہا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر محمد زاہد نے اپنی تقریر میں کہا کہ شہر یار کا نام جدیدیت سے وابستہ ضرور ہے لیکن انھوں نے جدید موضوعات ومسائل کو اسی وقت اپنی شاعری میں برتا جب اسے اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے سے ہم آہنگ پایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو ساہتیہ اکادمی انعام سے لے کر بھارتیہ گیان پیٹھ تک مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔ آپ لوگ بحرین میں اردو کے ایک معتبر اور محترم شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کررہے ہیں جس کے لیے بانی مجلس فخر بحرین اور سرپرست اعلیٰ شکیل احمد صبر حدی اور ان کے رفقا مبارکباد کے مستحق ہیں۔ بانی مجلس فخر بحرین فروغ اردو کے بانی اور سرپرست اعلیٰ شکیل احمد صبر حدی نے کہا کہ اردو زبان وادب کی جڑیں تو ہندو پاک میں ہیں لیکن اس تناور درخت کی شاخیں چہار سو سارے عالم میں پھیلی ہوئی ہیں اور اپنی زمین اور اپنے لوگوں سے بچھڑے ہوئے لوگوں کو اپنی مٹی اور اپنی تہذیب کی خوشبو سے سرفراز کررہی ہیں۔ انھوں نے مہمانان کا خیرمقدم کیا اور ادبی خدمات کے لیے پروفیسر محمد زاہد کو مومنٹو عطا کیا۔ ہندوستان کے مشہور شاعر منصور عثمانی کی نظامت میں مشاعرہ کا دور شروع ہوا۔ مشاعرہ کا آغاز ہوا جس میں افتخار عارف (پاکستان)، منصور عثمانی، راحت اندوری، حبیب ہاشمی، (ہندوستان) عزیز نبیل (دوحہ قطر)، اجمل سراج (پاکستان)، اقبال اشہر (ہندوستان)، شوکت جمال، (ریاض، سعودی عربیہ)، شکیل اعظمی، دپتی مشرا (ہندوستان)، رخسار ناظم آبادی، خورشید علیگ، طاہر عظیم، کپل بترا (بحرین) نے شرکت کی اور اپنے کلام سے محظوظ کیا۔

روزنامہ'جدید میل' دہلی، 8 فروری 2013

پاکستان

اردو بلاگرز کی پہلی عالمی کانفرنس

اسلام آباد: بلاگرز جدید دور کے تھنک ٹینک ہیں جو ایک نئی بحث کو جنم دے سکتے ہیں اس لیے بلاگرز پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی تحریر سے پہلے حقائق کی مکمل چھان بین کریں۔ ان خیالات کا اظہار لاہور میں ہونے والی پہلی عالمی اردو بلاگرز کانفرنس کے دوران کیا گیا۔ کانفرنس کا اہتمام ایشین کینیڈین جرنلسٹ ایسوسی ایشن نے کیا۔ کانفرنس میں پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں کے ستر کے قریب بلاگرز نے شرکت کی اور اردو بلاگرز کو درپیش مسائل کے حل تلاش کرنے کے بارے میں غور کیا گیا۔ دو روز تک جاری رہنے والی کانفرنس میں بلاگرز نے اپنے مسائل بیان کرتے ہوئے کاپی رائٹ جیسے اہم مسئلے پر بھی بات کی۔ کانفرنس میں شریک پاکستانی نژاد کینیڈین صحافی ناہید مصطفیٰ نے خطاب میں کہا کہ اردو بلاگرز کا مقابلہ پاکستان کے نیوز چینلز سے ہے اس لیے انھیں تحقیق کے بعد ذمے داری سے سچ لکھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ بلاگرز معاشرہ کے مسائل کے حل کے لیے بڑا موثر کردار ادا کرسکتے ہیں۔ کینیڈا سے شریک سوشل میڈیا ماہر وصحافی کیٹی مرسر نے کہا کہ اردو بلاگرز کی پہنچ پاکستان کی اکثریت تک ہے۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 30 جنوری 2013

برطانیہ

اردو سرکاری طور پر برطانیہ کی چوتھی بڑی زبان

لندن: اردو سرکاری طور پر برطانیہ کی چوتھی بڑی زبان تسلیم کرلی گئی ہے۔ 2011 کی مردم شماری سے قبل یہ تصور کیا جاتا تھا کہ شاید اردو برطانیہ میں بولی جانے والی دوسری بڑی زبان ہے مگر جاری اعداد وشمار کے مطابق برطانیہ میں بولی جانے والی زبانوں میں انگریزی کے بعد سب سے بڑی زبان پولش ہے۔ اس کے بعد پنجابی اور پھر اردو کا نمبر آتا ہے۔ اعداد وشمار کے مطابق انگریزی زبان والے اس ملک میں ایک لاکھ 38 ہزار افراد ایسے بھی ہیں جو انگریزی بالکل نہیں بولتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بروکن انگریزی بولتے ہیں۔ مردم شماری کے اعداد وشمار میں بتایا گیا ہے کہ انگلینڈ اور ویلز میں 92 فیصد افراد انگریزی بولتے ہیں جب کہ 8 فی صد یعنی 40 لاکھ افراد دوسری زبانیں بولتے ہیں جن میں بنگالی، گجراتی، فرنچ، چینی اور پرتگالی زبانیں شامل ہیں۔ اعداد وشمار کے مطابق لندن میں 22 فی صد یعنی 17 لاکھ افراد ایسے ہیں جن کی زبان انگریزی نہیں ہے بلکہ وہ دوسری زبانوں میں ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ برطانیہ میں دوسری زبانیں بولنے والوں میں 17 لاکھ افراد ایسے ہیں جو اچھے طریقے سے انگریزی بول سکتے ہیں۔ 16 لاکھ افراد مناسب حد تک انگریزی بولتے ہیں۔ سات لاکھ 26 ہزار تھوڑی بہت بول لیتے ہیں جب کہ ایک لاکھ 38 ہزار اس زبان سے بالکل نا آشنا ہیں۔ دریں اثنا مردم شماری کے اعداد وشمار کے مطابق 2001 کے مقابلے میں 2011 میں برطانیہ میں شادی کے رجحان میں بھی کمی ہوئی ہے اور یہ تعداد 51 فی صد سے کم ہوکر 47 فی صد ہوگئی ہے۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 فروری 2013

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

اورنگ آباد کے شعبۂ عربی میں تقسیم اسناد

اورنگ آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے الحسین اردو اسٹڈی سینٹر الحسین عربک اسٹڈی سینٹر میں مشہور و معروف عالمی شہرت یافتہ صحافی سعید نقوی کے ہاتھوں سرٹیفکیٹ تقسیم کیے گئے ہیں اس موقعے پر الحسین ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری جناب ہادی جعفری سوسائٹی کے صدر قریشی غلام جیلانی محمد مشتاق احمد اُردو ہائی اسکول کی صدر معلّمہ مسرت بتول عابدی معصوم الکریم اردو پرائمری اسکول کے صدر مدرس ثمر زیدی الحسین ایجوکیشن سوسائٹی کے خازن حسین جعفری مشہور سوشل ورکر

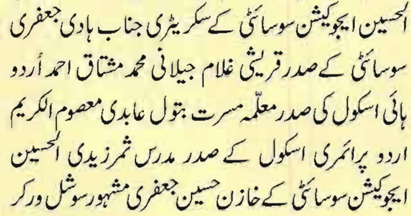

اعجاز زیدی سبطن نقوی ڈاکٹر فرصاحبہ موجود تھے۔ سعید نقوی نے کہا کہ نوجوان نسلوں کو تمام زبانوں سے واقفیت ہونا ضروری ہے تاکہ وہ ہر کام انجام دے سکے۔ اردو عربی زبان سیکھنا اسی طرف ایک پیش رفت ہے۔

روز نامہ 'اورنگ آباد ایکسپریس'، اورنگ آباد، 22 جنوری 2013

مالاپورم میں اردو سیمینار

مالاپورم: مالاپورم میں جامعہ معدن الثقافۃ الاسلامیہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مشترکہ تعاون سے ایک روزہ اردو سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ سیمینار کا افتتاح پروفیسر ڈاکٹر البرٹ فرنانڈیس (ہرمن گنڈرٹ فاؤنڈیشن نمائندہ جرمن) نے کیا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ کسی بھی قوم وسماج کی ترقی میں زبان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ زبان ہی مختلف تہذیبوں اور کمیونٹی کو یکجا کرتی ہے اور یہ کام ہندوستان میں اردو زبان نے کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبان ہی کے ذریعے اظہار خیالات اور شناسائی سمیت پوری قوم میں اتحاد کا کردار عمل میں آتا ہے۔

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

سیمینار کی صدارت علامہ سید ابراہیم خلیل البخاری نے کی۔ انھوں نے اپنے پیغام میں اردو زبان کے فروغ کی تلقین کی۔ اس موقعے پر کے پی شمس الدین، فیصل، پی کے عبدالحمید، شہاب الدین نے بعنوان 'قومی یکجہتی میں اردو زبان کا کردار' پر اپنے اپنے قیمتی مقالے پیش کیے۔ پی کے شمس الدین نے اپنے مقالے میں بیان کیا کہ اردو شیریں زبان ہے، اس کے لب و لہجے میں حسن و محبت پائی جاتی ہے۔ مختلف تہذیبوں، زبانوں، فرقوں کے اختلاط و میل سے معرض وجود میں آنے والی یہ زبان اتحاد و یکجہتی کی علمبردار ہے۔ مقررین نے ریاستی حکومت سے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ اردو کی بحالی کے تئیں موثر اقدام کیے جائیں۔ سیمینار میں ریاست کے متعدد محبین اردو شریک رہے۔ عربی ڈپلومہ میں کامیاب طلبہ کو انعام دیا گیا۔ سیمینار کے کوآرڈی نیٹر عبدالجلیل ازہری تھے۔

روز نامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 11 فروری 2013

احمد آباد میں اردو اور اس کے فروغ پر سیمینار

احمدآباد: لوک سیوا سنگھ، احمد آباد نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی اشتراک سے احمد آباد

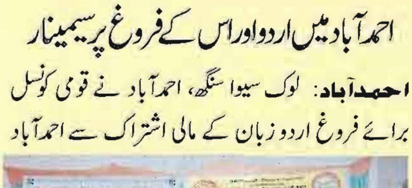

میں 'احمد آباد میں اردو زبان و ادب اور اس کا فروغ' کے عنوان سے ایک قومی سیمینار کا انعقاد جو تین اجلاس پر مشتمل تھا۔ پروفیسر ذاکرہ خاتون (پرنسپل، ایف ڈی کالج) مفتی مبشر رضا اور حاجی نثار احمد شیخ بحیثیت مہمان شریک ہوئے۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا مظفر حسین (سکریٹری لوک سیوا سنگھ، احمد آباد) نے تمام شرکا کا استقبال کیا اور اپنے ابتدائی کلمات میں اپنے ادارے کی کارگزاریوں اور خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اردو زبان و ادب کے فروغ اور بقا کی خاطر مثبت اقدام لیے جانے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ حافظ اشفاق عالم نے تمام مدعوئین مہمانان کا پھولوں سے استقبال کیا نیز شرکائے سیمینار کا خصوصی طور پر خیر مقدم کیا۔ محمد حسین وفا نے افتتاحی اجلاس کی نظامت کی۔ پروفیسر نثار احمد انصاری، مفتی مبشر رضا، پروفیسر محی الدین بمبئی والا بابل حسین دیناجپوری، ڈاکٹر اختر خان، ڈاکٹر انور ظہیر انصاری، مفتی مطیع الرحمٰن، ڈاکٹر اظہر ڈھیری والا، پروفیسر اختر شاہ دیوان، قادری افشاں، شیخ عذرا بانو، ڈاکٹر انور ظہیر انصاری، ڈاکٹر نثار احمد انصاری، پروفیسر یحییٰ صبا، پروفیسر ناظمہ انصاری، ڈاکٹر مسیح الزماں اور ندیم انصاری نے مختلف موضوعات پر مقالے پیش کیے یا اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ 'لوک سیوا سنگھ' کے سکریٹری مولانا مظفر حسین نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، مولانا مظفر حسین، سکریٹری 'لوک سیوا سنگھ' احمد آباد، 28 جنوری 2013

روہیل کھنڈ کے ادب پر سیمینار

سنبھل: زبان کی بنیاد اس کا لوک ادب ہوتا ہے اور اردو کا لوک ادب ہماری گنگا جمنی تہذیب کی روح ہے۔ ان خیالات کا اظہار کشمیر سینٹرل یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر راشد عزیز ایچ ڈی ایس ڈی پوسٹ گریجویٹ کالج ڈھواری میں شعبہ اردو کے زیر اہتمام اور قومی اردو کونسل کے اشتراک سے منعقد یک روزہ سیمینار بہ عنوان 'روہیل کھنڈ اور اس کے خطہ کے ادب' میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ علاقے کے غیر مسلم مشاہیر کی بڑی تعداد ہے جس نے

اردو شعر و ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی (امروہہ) نے رامپور کے شعرا کے تعلق سے نادر و یکتا تذکرہ جارج فانتون کا تعارف پیش کیا۔ میڈیا پوسٹ میگزین کے ایڈیٹر شیخ نگینوی نے بھی دور جدید کے غیر مسلم مشہور شعرا کے کلام کا جائزہ پیش کیا۔ حماد احمد ایڈوکیٹ نے اپنے خطاب میں سیمینار کے موضوع کو وسیع بتاتے ہوئے سیمینار کی پروسیڈنگ کو شائع کرنے پر زور دیا۔ سابق پرنسپل ڈاکٹر ڈی این شرما نے جگر مرادآبادی کے شاگرد رام اوتار تیاگی اور دشینت کمار جیسے غزل کی معروف شخصیات پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر محمد سلمان خان بریلی کے غیر مسلم شعرا، ڈاکٹر علیم ہاشمی نے بجنور کے غیر مسلم شعرا و ادیب، ڈاکٹر شہزاد انصاری اور ڈاکٹر اسما خان نے سرور جہاں آبادی کی شاعری کے مختلف گوشوں پر گراں قدر مقالے پیش کیے۔ فرقان سنبھلی نے بدایوں کے غیر مسلم شعرا کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ اور ڈاکٹر منور تابش نے شاہجہانپور کے غیر مسلم شعرا اور ادبا پر مقالے پیش کیے۔ سیمینار میں کل 16 مقالے پیش کیے گئے۔ مقالوں پر ڈاکٹر عابد حسین حیدری نے تاثرات کا اظہار کیا۔ کنوینر ڈاکٹر ایم اے معروف نے موضوع کا تعارف اور اس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی جبکہ کالج پرنسپل ڈاکٹر ایم ایس تیاگی نے قومی سیمینار کے کامیاب ہونے پر جلد انٹرنیشنل سیمینار منعقد کرنے کا علان بھی کیا۔ سیمینار کی نظامت انجینئر فرقان سنبھلی نے جبکہ کے جی کے ڈگری کالج مرادآباد کے ریڈر ڈاکٹر دانویر سنگھ نے اختتامی تقریر کی۔

پریس ریلیز ،فرقان سنبھلی 10 فروری 2013

'اردو ناول کے پچاس سال' پر سیمینار

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے جامعہ شری وینکٹیشور، تروپتی،

آندھرا پردیش میں دو روزہ قومی اردو سیمینار بعنوان 'اردو ناول کے پچاس سال 2010-1960' کے عنوان سے منعقد ہوا جس میں جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر راجیندر، رجسٹرار پروفیسر کے ایس ریڈی، پرنسپل پروفیسر کے کے چودھری اور سابق پروفیسر سلیمان اطہر جاوید بحیثیت

اردو کو پیشہ ورانہ تعلیم سے جوڑنا وقت کا تقاضہ: ڈاکٹر خواجہ اکرام

دربھنگہ: اردو کی حیثیت بین الاقوامی ہے اور ہندوستان میں بھی اس زبان نے اپنے استحکام کا احساس ہر فرد و بشر کو کرایا ہے۔ لیکن موجودہ دورِ عالمیت میں اس زبان کی بقا کا انحصار پیشہ ورانہ تعلیم کے انسلاک پر ہے۔ اس لیے اردو آبادی کو اسی تناظر میں اردو تعلیم کو فروغ دینا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر اور اردو کے ناقد ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کیا۔ ڈاکٹر اکرام مقامی ملت کالج، دربھنگہ میں دو روزہ قومی سیمینار بہ عنوان 'پروفیسر وہاب اشرفی۔ شخصیت وفن' کی افتتاحی تقریب سے بطورِ مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا اس سچائی سے انکار ممکن نہیں کہ اردو کے ذریعے معاش کا راستہ اتنا ہموار نہیں ہے جتنا ہونا چاہیے۔ اس لیے اردو کو تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم سے جوڑنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ قومی کونسل ملک کے مختلف حصوں میں کمپیوٹر سنٹر و دیگر ڈپلوما کورس چلا رہی ہے اردو آبادی کو اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ کونسل ایک سرکاری ادارہ ہے اور ہر طرح کی مدد دینے کو تیار ہیں۔ انھوں

نے کہ ہندوستان کا یہ پہلا ادرہ ملت کالج ہے جہاں وہاب اشرفی پر سیمینار ہو رہا ہے۔ اس سیمینار کی روداد ایک تاریخی حیثیت بن جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ ملت کالج کو کونسل کی جانب سے جو مدد ہوگی دی جائے گی۔ اس موقعے پر ایل این متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایس پی سنگھ نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ یہاں سال میں چار پانچ سیمینار ہوتے ہیں اور تمام مقالات کتابی صورت میں شائع ہوتے ہیں۔ آج بھی دو کتابوں کا اجرا عمل میں آیا ہے۔ انھوں مزید کہا کہ پروفیسر وہاب اشرفی اردو کے استاد تھے اور پوری دنیا میں انھوں نے اپنی تنقیدی بصیرت کا لوہا منوایا۔ ہم لوگوں کو ان سے سبق لینا چاہیے۔ ڈاکٹر دھرو کمار، پرو وائس چانسلر نے کہا کہ اردو زبان کی تعلیم اس لیے ضروری ہے کہ اس کے ذریعے دوسری زبانوں پر عبور حاصل ہوجاتا ہے خاص کر تلفظ کی درستگی کے لیے اردو سیکھنا، پڑھنا سودمند رہا ہے۔ انھوں نے کہا یہ سیمینار جس شخصیت کے تعلق سے ہے وہ شخصیت عالمی حیثیت کی ہے۔ پروفیسر وی پی سنگھ، رجسٹرار نے کہا کہ اردو کے حوالے سے یہ سیمینار قومی سطح پر یونیورسٹی کی شناخت کو مستحکم کرے گا۔ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے اور اس کی آبیاری میں تمام مذاہب کے لوگوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر وہاب اشرفی جیسے عالم و ناقد پر سیمینار ہو رہا ہے یہ ہمارے لیے مسرت و فخر کی بات ہے۔ ممبر قانون ساز اسمبلی ڈاکٹر اظہار احمد نے کہا کہ وہاب اشرفی صاحب کے احسانات کو اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ آغازِ جلسہ میں ڈاکٹر مشتاق احمد، پرنسپل نے موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر وہاب اشرفی جیسی ہمہ جہت نابغہ روزگار شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ جلسے کی نظامت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ نے کیا جب کہ رسم شکریہ ڈاکٹر افتخار احمد کنوینر نے کیا۔ واضح ہو کہ یہ سیمینار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے جزوی مالی تعاون سے منعقد ہوا ہے۔ اس سیمینار میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے تقریباً 45 ناقدین ادب و ادبا شامل ہوئے۔ ان میں پروفیسر عبدالمنان طرزی، پروفیسر ظفر حبیب، پروفیسر شہاب الدین ثاقب، سید شہباز عالم آفتاب عالم وغیرہ کے علاوہ اس میں ملک کی تمام معروف جامعات کے اساتذہ و بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالر شامل ہوئے۔ اس اجلاس میں اردو کے علاوہ دیگر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی کئی نامور شخصیات موجود تھیں۔ ان میں پروفیسر دلیپ کمار چودھری، ڈاکٹر عبدالحکیم، محمد احسان الحق، عبدالسلام خاں، پروفیسر شمیم باروی، سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر ایم کمال الدین، پروفیسر اویس احمد دوراں، جناب کوثر، پروفیسر رحمت اللہ، پروفیسر اروند سنگھ، پروفیسر پی کے مشرا، ڈاکٹر پرویز اختر، ڈاکٹر ایس ایم ظفر، فضیل انصاری، پروفیسر ایس ایف رحمان، پروفیسر ایم زیڈ ایچ نعمانی، پروفیسر عبداللطیف، علاء الدین حیدر وارثی، رفیق انجم، جنید آروی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 14 فروری 2013

مہمان خصوصی اور اعزازی مہمانان تشریف لائے اور سیمینار کا افتتاح کیا۔ وائس چانسلر DNA میں پائے جانے والے مشترک اسباب کا حوالہ دے کر انسان دوستی اور بھائی چارگی کی اصلیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ادب بلاتفریق ذات پات اور رنگ نسل مل جل کر رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ رجسٹرار نے اردو کے چند اشعار پڑھ کر سنائے اور اردو زبان کی شیرینی، جادوگری اور ہمہ گیریت پر اظہار خیال کیا۔ پرنسپل صاحب نے جو خود تلگو زبان کے ادیب ہیں ناول کے فن پر روشنی ڈالی اور سیمینار کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے موضوع کی غرض و غایت سے متعلق اہم نکات پیش کیے۔ کلیدی خطبے میں ڈاکٹر راہی فدائی نے اردو ناول کا اجمالی جائزہ پیش کیا اور بتایا کہ نئے موضوعات سے نئے اسالیب جنم لیتے ہیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر عبدالستار ساحر، پروفیسر صادقہ نواب سحر، ڈاکٹر نثار احمد، محمود شاہد اور ڈاکٹر اقبال خسرو قادری کی کتابوں کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ سیمینار میں کشمیر، مہاراشٹر، کرناٹک، تمل ناڈو، کیرلہ اور آندھرا پردیش کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ اور ادیب تشریف لائے اور کُل 33 مقالے پیش کیے گئے۔ شرکا میں پروفیسر مظفر شہمیری، پروفیسر انوار الدین، پروفیسر بشیر احمد، پروفیسر رضوانہ معین، پروفیسر صاحب علی، پروفیسر خلیل احمد، پروفیسر ناظم سرگروہ، پروفیسر صادقہ نواب، ڈاکٹر محسن جلگانوی، ڈاکٹر حبیب احمد، محمود شاہد، ڈاکٹر سنجری، ڈاکٹر نکولن، ڈاکٹر پرویز، ڈاکٹر عرشیہ جبین وغیرہ شامل ہیں جو سیمینار کی کامیابی کے ضامن بنے۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر محمد امین اللہ، آندھرا پردیش، 13 فروری 2013

عالمی کتاب میلے میں پہلا اردو مشاعرہ

نئی دہلی: قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے سامعین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عالمی کتاب میلے میں شریک تقریباً تمام زبانوں میں مختلف پروگراموں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لیکن اب تک اردو کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا تھا۔ اسی مناسبت سے اردو مشاعرے کا اہتمام کیا گیا ہے، جو عالمی کتب میلے میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے کام کرنے والے تین اداروں اردو کونسل، دہلی اردو اکادمی اور نیشنل بک ٹرسٹ نے مشترکہ طور پر اس پروگرام کا اہتمام کیا ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ یہ تینوں ادارے اردو کے فروغ کے سلسلے میں کس قدر سنجیدہ ہیں اور کتنی ہم آہنگی اور تال میل کے ساتھ کام کررہے ہیں۔ اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری انیس احمد نے کہا کہ یہ کتاب میلہ دنیا کا دوسرا بڑا عالمی کتاب میلہ ہے، جس میں اردو کونسل اور اردو اکادمی ہر سال شرکت کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آئندہ بھی عالمی کتاب میلے میں مشاعرے کا اہتمام کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے ایڈیٹر شمس اقبال نے کہا کہ اردو شعرا کو ایک فورم دینے اور اردو کتابوں کو فروغ دینے کی غرض سے اس مشاعرے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مشاعرے کے شرکا میں جاوید مشیری، سریندر شجر، نشتر امروہوی، زبیر رضوی، سلمیٰ شاہین، شکیل جمالی، تابش مہدی، معین شاداب، عمیر منظر وغیرہ شامل تھے۔ اردو کونسل کے اہم اراکین فاروق انجینئر، علیم الدین اسعدی، فیروز بخت احمد اور اردو کونسل کے عملہ ڈاکٹر کلیم اللہ، قاسم انصاری، دیا سنگھ کے علاوہ اردو اکادمی کے عملے کے اراکین نے بھی مشاعرے کو کامیاب بنانے میں اہم رول ادا کیا۔

روزنامہ 'جدید میل'، دہلی، 6 فروری 2013

اردو میں گیت اور لوک گیت کی روایت

مدن پلی: ریاست آندھرا پردیش ضلع چتوڑ کے مدن پلی سرکاری ڈگری کالج برائے خواتین شعبۂ اردو اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت ترقی انسانی وسائل محکمۂ اعلیٰ تعلیم حکومت ہند کے اشتراک سے مدن پلی

میں دوروزہ اردو قومی سیمینار بعنوان 'اردو میں گیت اور لوک گیت کی روایت' منعقد ہوا۔ صدارت ویویکا نندا پرنسپل سرکاری ڈگری کالج برائے خواتین مدن پلی نے کی۔ کلیدی خطبے میں حیدرآباد یونیورسٹی صدر شعبۂ اردو پروفیسر کے مظفر شہ میری نے کہا کہ مدن پلی میں پہلی مرتبہ سیمینار منعقد کرنا خوش آئند بات ہے۔ اس کے لیے انھوں نے صدر شعبۂ اردو داؤد خان اور لکچرر مولوی بشیر احمد صابر النسا کو مبارک باد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ عنوان وقت کی ضرورت ہے آج ساری دنیا میں ہر زبان والے اپنی بولیوں کو محفوظ کررہے ہیں۔ اردو میں یہ کام اب شروع ہوا ہے۔ شمالی ہند میں لوک گیت کی حفاظت کی گئی ہے۔ لوک گیت غالب اقبال کی شاعری نہیں ہے۔ یہ عوام کے دلوں سے نکلے ہوئے جذبات و احساسات ہیں۔ زیادہ تر عورتوں نے ان گیتوں کو کہا اور لکھا ہے۔ اس موضوع پر تحقیق کریں تو ادب میں اضافہ ہوگا۔ ان گیتوں میں ردیف و قافیہ کا استعمال ہوتا ہے تو بعض جگہ استعاروں کا بھی ہوا کرتا ہے۔ لوک گیتوں کا انوکھا پہلو ہے لسانی ادبی پہلو نکلتے ہیں اور اس سے شاعری میں اضافہ ہوگا۔ شاید ہندوستان بھر میں اس عنوان پر کہیں بھی سیمینار نہیں ہوا ہوگا۔ لوک گیت تفریح کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ اب غائب ہوتے جارہے ہیں۔

بذریعہ ڈاک، ستار فیضی، آندھرا پردیش، 15 جنوری 2013

میل وشارم میں مشاعرہ اور رسم اجرا

میل وشارم: مسلم ہائر سکنڈری اسکول ہال میں ایک قومی مشاعرہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے جزوی مالی تعاون سے منعقد ہوا جس کی صدارت زیڈ ابرار احمد، کرسپانڈنٹ، سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم نے کی اور مشاعرہ کی نظامت کے فرائض اطیب اعجاز نے انجام دیے۔ اس کے بعد ڈاکٹر قاضی حبیب احمد، پروفیسر شعبۂ اردو، مدراس یونی ورسٹی کی سربراہی میں ڈاکٹر کلیم اللہ، ڈاکٹر محمد یاسر اور ڈاکٹر سعید الدین کی ترتیب شدہ درسی کتاب 'فیضانِ ادب' کی رسم اجرا الحاج ساہوکار نثار احمد، صدر مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی، میل وشارم کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

پریس ریلیز، امان اللہ ایم بی، شعبۂ عربی، پرشین و اردو، مدراس یونیورسٹی، مرینہ کیمپس، چنئی 27 جنوری 2013

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

آل احمد سرور پر ساہتیہ اکادمی کا سمپوزیم

نئی دھلی: آل احمد سرور کا شمار اردو کے ممتاز دانشوروں اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک دانشور کی حیثیت سے اردو زبان وادب کی خدمت کی اور ملک وقوم کے بنیادی سروکار اور مسائل پر بھی توجہ کی۔ انھوں نے سرسید، اقبال، آزاد، محمد مجیب، عابد حسین اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی دانشورانہ روایت کو تقویت بخشی۔ اردو والے خوش نصیب ہیں کہ انھیں سرور جیسا لکھنے والا ملا۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر سید شاہد مہدی نے ساہتیہ اکادمی کی جانب سے منعقدہ سمپوزیم 'آل احمد سرور' کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ معروف نقاد پروفیسر شافع قدوائی نے 'پریم چند کی قدر سنجی اور آل احمد سرور' کے حوالے سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سرور نے پریم چند کی تعبیر مروجہ میکانکی ترقی پسند تنقیدی نظریے سے الگ ہٹ کر کی۔ ڈاکٹر جمیل اختر نے 'اردو تحریک کے سلسلے میں آل احمد سرور کا نقطۂ نظر ایک تجزیہ' کے عنوان سے گفتگو کی۔ ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے 'مطالعۂ میر کی اہمیت: ایک بازدید' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ ساہتیہ اکادمی کے پروگرام آفیسر مشتاق صدف نے آل احمد سرور کا مختصر تعارف پیش کیا۔ مولابخش، سہیل انور، ڈاکٹر ہادی رہبر اور معید الرحمٰن نے بھی تاثرات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جے این یو کے طلبہ کے ساتھ شہر کی سرکردہ شخصیات موجود تھیں جن میں آل احمد سرور کی صاحب زادی مہ جبیں، نواسی رخشندہ جلیل کے علاوہ حبیب اللہ انصاری، (مولابخش کے والد محترم) محمد کاظم، سید تنویر حسین، اشفاق احمد عارفی، ایم رضوان اختر قاسمی، نورظہیر، سفیان احمد، ابوظہیر ربانی، ظہیر احمد برنی، علاء الدین، محمد مرتضیٰ، منظور عالم قابل ذکر ہیں۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 2 فروری 2013

خیام کا تصور کائنات

نئی دھلی: غالب اکادمی، نئی دہلی میں 'خیام کا تصور کائنات' کے عنوان سے لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے افتتاحی تقریر میں کہا کہ خیام ایک غیر معمولی انسان تھا عالم تھا شاعری کے علاوہ سائنس اور دوسرے علوم پر اسے دسترس حاصل تھی۔ عزیز الدین عثمانی نے خیام پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آزادی فکر اور زوال خفقان کے دور میں ایک بڑا فلسفی جسے اس دور کا تنہا بڑا فلسفی کہہ سکتے

ہیں۔ منظر عام پر آتا ہے اور وہ ہے حکیم عمر خیام۔ ابوالفتح عمر ابن ابراہیم خیام 1048 میں خراسان میں پیدا ہوا۔ خیام نے مولانا قاضی محمد اور خواجہ ابوالحسن عنبری سے جیومٹری اور فلسفہ میں استفادہ کیا شیخ محمد منصور سے فلسفہ پڑھا۔ خیام نے کم مدت میں ایک عالم اور فلسفی کی حیثیت سے شہرت کرلی اور انھیں حجت الحق، غیاث الدین اور شیخ الامام کے مذہبی القاب سے نوازا گیا۔ انھیں مادہ پرست نیچریہ وغیرہ بھی کہا گیا اور ملحد و مرتد بھی کہا گیا۔ انھوں نے حج بھی کیا۔ خیام نے سائنس اور فلسفے پر 14 رسالے تحریر کیے۔ ان کی فلسفیانہ لیاقت کا اعتراف بھی کیا گیا، ان کے موضوعات ٹیکنکل ہیں انھوں نے موسیقی اور ریاضیات کے رشتے پر بھی لکھا ہے۔ یونانی علم کو عالم اسلام تک پہنچایا، ریاضیات کے عالم تھے۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر یونس جعفری نے کی۔ متین امروہوی نے اپنا کلام پیش کیا۔

پریس ریلیز عقیل احمد، غالب اکادمی، نئی دہلی 11 فروری 2013

مخطوطہ شناسی پر بین الاقوامی سیمینار

رامپور: رامپور رضا لائبریری کے کانفرنس ہال خیابان رضا میں سہ روزہ بین الاقوامی ورکشاپ بعنوان 'مخطوطہ شناسی، فہرست سازی اور تحفظ' سیمینار کا افتتاح شمع روشن کرکے ڈاکٹر انیس انصاری وائس چانسلر خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی لکھنؤ نے کیا۔ ڈائرکٹر رضا لائبریری پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی نے کہا کہ مخطوطات کی حفاظت کی ذمے داری کسی ایک فرد پر عائد نہیں ہوتی ہے بلکہ ہر شخص اس کے تحفظ کا ذمے دار ہے۔ انھوں نے کہا سب سے زیادہ سعودی عربیہ میں مخطوطات کے ذخیرے موجود ہیں۔ زمانہ کے بدلتے مخطوطوں کو بھی بیماریاں لگتی ہیں اور وہ بھی بوسیدہ ہوجاتے ہیں اسی لیے ان کی حفاظت کے جدید طریقے بھی رائج کیے جاتے ہیں۔ ڈائرکٹر عزیز الدین نے کہا کہ ایران میں چار منزلہ لیب صرف اس کام کے لیے ہے کہ مخطوطات کا تحفظ کیا جاسکے انھوں نے یہ بھی کہا کہ رامپور کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ رضا لائبریری میں اپنی نوعیت کی بہترین لیبارٹی صرف مخطوطوں کی حفاظت کے لیے بنائی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بوسیدہ مخطوطات کو نئی زندگی دینے کے لیے ہر قسم کے آلات مہیا کیے جاتے ہیں، حیدرآباد، لکھنؤ اور رامپور کے نوابین کے ذریعے ہزاروں کی تعداد میں مخطوطات موجود ہیں جن کی حفاظت اب ہماری قومی ذمے داری ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر انیس انصاری (IAS) نے کہا کہ مخطوطے ہمارا قومی سرمایہ ہیں جس کے تحفظ کی ذمے داری ہمارے اوپر لازم ہے۔ سیمینار کے کوآرڈی نیٹر اردون کمار سکسینہ نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر تبسم صابر نے کی اس موقعے پر فاطمہ ہاشمی نجات ایران، مصطفیٰ پورما ہمدانی عراق، سندورتی ایران، سعادت اللہ خاں، اظہر عنایتی، ڈاکٹر ظہیر صدیقی، عراق حسین زیدی، ڈاکٹر مہدی حسن، عبدالہادی خاں کاوش، انور مسعود خاں، محمد حسین خاں، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں، ڈاکٹر عابد رضا خاں، طارق اظہر، صنم علی خاں وغیرہ تھے۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 2 فروری 2013

ساہتیہ اکادمی کا احتشام حسین سمپوزیم

نئی دھلی: احتشام حسین نے بیک وقت کئی نسلوں کی ذہن سازی کی۔ ادب کے زیادہ تر مسائل اکادمیت کے مسائل ہیں۔ ادب میں کسی بھی تحریک اور رجحان کے شروع ہونے اور ختم ہونے کی کوئی تاریخ یا مدت متعین نہیں ہوتی۔ بلکہ اکادمیاں اپنی سہولت اور بحث کے لیے ان کا تعین کرلیتی ہیں۔ وہ تنقید بے بنیاد ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ احتشام حسین کی فلسفیانہ بصیرت آج بھی

ہمارے لیے ایک تناظر کی حیثیت رکھتی ہے۔ موجودہ دور کے جدید تقاضوں کے مدنظر ماضی بعید اور ماضی قریب کی روشنی میں احتشام حسین اور آل احمد سرور کی ادبی خدمات اور تخلیقات کا از سرِ نو مطالعہ کرکے اور سمجھ کر اس کے نئے معنی تلاش کیے جانے چاہئیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف نقاد و شاعر پروفیسر عتیق اللہ نے ساہتیہ اکادمی کے آڈیٹوریم میں احتشام حسین پر منعقد ایک سمپوزیم میں مقالہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ اس سمپوزیم کا اہتمام احتشام حسین کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں ساہتیہ اکادمی نے کیا تھا۔ اس کی صدارت اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ ساہتیہ اکادمی کی ڈپٹی سکریٹری محترمہ رینو موہن بھان نے احتشام حسین کا تعارف پیش کرتے ہوئے تمام مقررین اور سامعین کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد کاظم نے کہا کہ احتشام حسین نے سماج کے تقاضوں کے مدنظر تنقید لکھی۔ سمپوزیم کی نظامت کرتے ہوئے ساہتیہ اکادمی کے پروگرام افسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے تمام مہمان اور احتشام حسین کا تعارف پیش کیا۔ پروفسر اختر الواسع نے کہا کہ سید احتشام حسین کا شمار اردو کے چند ممتاز نقادوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ اس موقعے پر ابوبکر عباد، سہیل انور، شعیب رضا فاطمی، ظہیر احمد برنی، جمیل اختر، علاؤالدین، موسیٰ رضا، محمد مرتضیٰ، معید الرحمٰن سمیت دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جے این یو کے طلبا کے علاوہ بڑی تعداد میں شہر کی سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 جنوری 2013

اردو زبان کسی قوم کی زبان نہیں ہندوستانی زبان ہے: خواجہ اکرام

آگرہ: شاعری و ادب کی سرزمین شہر آگرہ میں ترقی پسند تنقید کے موضوع پر ایک سیمینار کا آغاز سینٹ جونس کالج کے ہال میں اردو ایسوسی ایشن سینٹ جونس کالج کی مدد سے کیا گیا۔ اس کل ہند سیمینار کا موضوع ترقی پسند تنقید اور اس کے اہم ناقدین رکھا گیا تھا۔ سیمینار میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی شامل ہوئے۔ صدارت پروفیسر محمود الحسن نے کی۔ آغاز میں بے کنٹھی دیوی کالج کے اردو ڈپارٹمنٹ کی ہیڈ نسرین بیگم نے مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ اردو کی تنقید کرنے سے اردو میں اور مٹھاس پیدا ہوجاتی ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ میری تعلیم اسی کالج میں ہوئی ہے، آج میں کالج میں مہمان کی حیثیت سے آیا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کیا ہر زبان کی تنقید بے حد ضروری ہے کہ تنقید سے نکھار پیدا ہوتا ہے۔ مہمان خصوصی خواجہ اکرام نے کہا کہ مرکزی حکومت کی جانب سے اردو زبان کی ترقی کے لیے کئی منصوبے بنائے گئے ہیں۔ حکومت چاہتی ہے کہ اردو زبان پورے ملک میں پھیلے، لیکن ہم لوگ آج اپنی زبان کو بھول کر غیر ملکی

زبان پر توجہ دے رہے ہیں، جس کا اثر یہ ہے کہ آج ہمارے بچے زمین کو جمین کہہ رہے ہیں۔ زبانوں سے مٹھاس ختم ہوتی جارہی ہے۔ ہم سب مل کر اردو زبان کی ترقی کے لیے ایک ساتھ ہوجائیں تو ممکن ہے۔ اردو زبان ملک کے ہر حصے میں بولی جانے لگے گی، کیونکہ اردو زبان کسی ایک قوم کی نہیں ہندوستان کی زبان ہے۔ اردو تنقید پر بولتے ہوئے خواجہ اکرام نے کہا کہ تنقید بے حد ضروری ہے وہ کسی زبان کی ہو یا کسی انسان کی، تنقید سے جو کمی نکل کر آتی ہے۔ اس کے بعد جو زبان یا انسان میں بدلاؤ آتا ہے وہ مثال بن جاتا ہے۔ سیمینار کے صدر پروفیسر محمود الحسن نے کہا کہ اردو ادب کی سرزمین شہر آگرہ میں تنقید سیمینار میں شامل ہوکر میں خود پر فخر محسوس کررہا ہوں، ایک ساتھ اردو ادب کی عظیم شخصیات کا یکجا ہونا قابل تعریف ہے۔ یہ سیمینار اردو کے طلبہ کے لیے ایک مثال ہے۔ کنوینر ڈاکٹر شفیق اشرفی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 فروری 2013

پروفیسر کیمپ بیل کا سرسید یادگاری خطبہ

علی گڑھ: انگلستان کی لیسسٹر یونیورسٹی کے پروفیسر گورڈن کیمپ بیل نے 'فکر سرسید: ایک نقطۂ نظر' موضوع پر سرسید یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سرسید کا مرکزی تصور تھا کہ علی گڑھ کو قوم و ملت کے غور و فکر کے ماخذ کی طرح کام کرنا چاہیے نہ کہ اپنے اندرونی معاملات میں مصروف رہنے والے ادارے کے طور پر۔ سرسید نے اپنے زمانے میں یہ گر کی بات ہندوستانی مسلمانوں کو بتائی تھی کہ اگر وہ خود اپنے کو نہیں سدھاریں گے تو کوئی دوسرا ان کی مدد نہیں کرے گا۔ یہ اصول آج بھی صحیح اور اہم ہے۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سرسید کے خواب کی تعبیر ہے اور آپ لوگوں کو تعلیم کی اس اخلاقی بلندی پر فخر کرنا چاہیے۔ مجھے اس ادارے کے اس بنیادی وصف کا کہ یہاں استاد اپنی زندگی اور دماغی کاوشوں کو روایتی اسلامی اقدار میں ڈھالتے ہیں بلکہ محفوظ رکھتے ہیں، اچھی طرح علم ہے۔ پروفیسر گورڈن کیمپ بیل سرسید اکادمی کے زیر اہتمام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج آڈیٹوریم میں اپنا خطبہ پیش کررہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ لندن کے کمیڈن علاقے میں ایک میل کے رقبے میں 83 نیلی تختیوں والے مکان ہیں جن میں ایک مکان کی تختی پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے کہ ''سرسید احمد خاں، مسلم مصلح اور عالم یہاں 70-1969 میں رہا کرتے تھے۔ دوسری تختی راجہ رام موہن رائے کے نام کی ہے جو تعلیمی مصلح ہونے کے ساتھ ساتھ توحید کے قائل ایک ہندو تھے اور تیسری تختی کولکتہ میں پیدا ہونے والے آر ایچ تانے کی ہے جو ایک عیسائی سوشلسٹ تھے اور تعلیمِ بالغان کے میدان میں انھوں نے قابل ذکر خدمات انجام دی تھیں۔ اس طرح ہندوستان کے تین تعلیمی مصلحین جن میں ایک ہندو، ایک مسلمان اور ایک عیسائی شامل تھے ان کو یہ اعزاز ملا ہے۔ ان تینوں نے تعلیم کے نظام میں اصلاح اپنے اپنے طور سے کی ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی 5 فروری 2013

اردو نصاب اور مدارس پر مذاکرہ

نئی دھلی: اگر اردو زبان زندہ ہے تو اس میں مدارس کے اساتذہ و طلبا کا اہم رول ہے۔ یہ بات 'اردو نصاب اور مدارس' نامی کتاب پر مذاکرہ کے دوران مقررین نے کہی۔ اردو اور مدارس کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ مدارس نے اردو کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔ معروف صاحب طرز ادیب حقانی القاسمی نے کہا کہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مدارس کا نصاب دقیانوسی ہے۔ اس میں تنگ نظری ہے لیکن اس کتاب نے یہ ثابت کردیا ہے کہ مدارس میں

روشن خیالی اور وسیع المشربی کی ایک عظیم ترین روایت رہی ہے جہاں سیکولر تعلیم دی جاتی ہے، انسانی قدریں سکھائی جاتی ہیں۔ تنظیم علمائے حق کے قومی صدر مولانا اعجاز عرفی قاسمی نے اس موقعے پر کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ اردو کی تعلیم خانقاہوں اور مدارس سے شروع ہوئی ہے۔ صحافی عبدالقادر شمس نے اس کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اردو کونسل سے وابستہ کتاب کے مصنف ڈاکٹر توقیر راہی نے کہا کہ کتاب میں اصولی باتیں کہی گئی ہیں۔ مدارس کے نصاب کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ مشہور اسکالر ابرار احمد اجراوی نے کہا کہ اردو کے عناصر خمسہ کا تعلق مدارس سے ہی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو اور مدارس کے رشتے بہت مضبوط ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا شعیب قاسمی، مولانا حبیب اللہ ہاشمی اور دیگر نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 جنوری 2013

آگرہ میں غالب کی یادگار نہ ہونا حیران کن: فاروق شیخ

آگرہ: مرزا غالب کی طرح ایک وراثت ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ اسے سنبھال کر رکھیں۔ یہ نصیحت معروف ادیب، دانشور اور فلم اداکار فاروق شیخ نے کی۔ وہ یہاں تاج لٹریچر فیسٹول کے آخری دن تاج محل کے عقب میں ایک ورکشاپ میں حصہ لے رہے تھے۔ انھوں نے آگرہ کو کوہِ نور ہیرا قرار دیتے ہوئے اسے مزید تراشتے رہنے پر زور دیا۔ سہ روزہ تاج لٹریچر فیسٹول کے آخری دن نوجوان قلم کاروں کے ایک سیشن کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کلاسک ادب پڑھنے پر زور دیا۔ فاروق شیخ نے حیرت ظاہر کی کہ آگرہ کے نامور شاعر مرزا غالب کی یہاں کوئی نشانی نہیں ہے جب کہ انگلینڈ میں شیکسپیئر کے مکان کو میوزیم کا درجہ دیا گیا ہے۔ دوسرے نے سیشن میں معروف کوی پدم شری گوپال داس نیرج نے کہا کہ وقت نہیں گزرتا وقت کی دھارا سے ہم لوگ گزرتے چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے آج کے مادہ پرست دور میں شعرا و ادبا پر دوہری ذمے داری بھی بتائی۔ تیسرے سیشن میں معروف صحافی صبا نقوی نے کہا کہ آج سوشل میڈیا ذریعہ اظہار کا نیا طریقہ بن گیا ہے۔ اس پر مثبت خیالات کی پیش کش کی ضرورت ہے۔ یو ایس اے میں ہندوستان کی سابق سفیر اور ادیبہ میرا شنکر، انڈیا ٹوڈے کے فوٹو ایڈیٹر رگھورائے، مورخ اندر جیت بدھوار اور فلم ساز مظفر علی نے پہلے دن فیسٹول کو رونق بخشی۔ روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 فروری 2013

روزگار سماچار اردو کا ای ورژن انٹرنیٹ پر

نئی دھلی: اطلاعات و نشریات کے مرکزی وزیر منیش تیواری نے یہاں ایک پروقار تقریب میں روزگار سماچار اردو کا ای ورژن لانچ کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں اور بیرونی ملکوں میں رہنے والے اردو داں افراد بھی اب سرکاری، نیم سرکاری اور پبلک کمپنیوں میں روزگار سے متعلق اطلاعات اور دیگر اہم معلومات گھر بیٹھے حاصل کرسکیں گے۔ انھوں نے روزگار سماچار کا ای ورژن شروع کرنے پر پبلی کیشنز ڈویژن کو مبارک باد دی اور کہا کہ اردو ورژن کے شروع ہونے سے اطلاعات کو آسانی سے پہنچانے میں مدد ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ اردو اس ملک کی مشترک ثقافت کا حصہ ہے اور حکومت اردو سمیت تمام زبانوں کے فروغ و اشاعت کے لیے اپنے عہد کی پابند ہے۔ یہاں عالمی کتاب میلے میں منعقدہ ایک تقریب میں ای ورژن لانچ کرتے ہوئے مرکزی وزیر نے کہا کہ حکومت لوگوں کو ملازمت کے مواقع فراہم کرنے کے لیے متعدد اقدامات کررہی ہے اور روزگار سماچار اردو کا ای ورژن اس سلسلے میں مزید معاون ثابت ہوگا۔ اس ای ورژن کو www.rozgarsamachar.gov.in پر پڑھا جاسکتا ہے۔ مسٹر تیواری نے اردو ای ورژن کو ایک میل کا پتھر قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ای ورژن کا اجرا اس بات کا ثبوت ہے کہ ٹکنالوجی تک عوام کی رسائی اسی زبان میں ہونی چاہیے جسے وہ سمجھتے ہیں۔ اس موقعے پر وزیر اعظم کے میڈیا مشیر پنکج پچوری نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ حکومت اگلے دس برسوں تک ہر سال ایک کروڑ روزگار پیدا کرنا چاہتی ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ معیشت بھی تیزی سے ترقی کرے۔ انھوں نے کہا کہ 2022 تک ہندوستان میں پندرہ سے 59 برس عمر کے 30 کروڑ سے زیادہ افراد کو روزگار کی ضرورت ہوگی۔ خیال رہے کہ ایمپلائمنٹ نیوز اور روزگار سماچار (ہندی اور اردو) گزشتہ 35 برسوں سے شائع ہورہا ہے۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 6 فروری 2013

شہزادی بھوٹان درگاہ سلیم چشتی میں

نئی دھلی: بھوٹان کی شہزادی نے آج حضرت شیخ سلیم چشتی علیہ الرحمہ کی درگاہ کی زیارت کی۔ سجادہ نشین پیرزادہ رئیس میاں چشتی کے صاحبزادے سیف فریدی نے ان کو درگاہ کی زیارت کرائی اور تبرک دیا۔ شہزادی نے وہاں قوالی بھی سنی اور مسجد و درگاہ کی نقاشی، بلند دروازہ آثار قدیمہ کی عمارتوں کا بھی نظارہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بہت امن وسکون کی جگہ ہے، میں بہت خوش ہوں اور خود کو خوش نصیب مانتی ہوں۔ واضح رہے کہ 1985 میں بھوٹان کے راجہ نے بھی درگاہ کی زیارت کی تھی۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 16 جنوری 2013

اردو مشترکہ تہذیب کی علامت: مہیش بھٹ

علی گڑھ: ممتاز فلم ساز اور سماجی کارکن جناب مہیش بھٹ

نے انڈیا نہ پرائڈ ہوٹل میں جامعہ اردو علی گڑھ کے سال 2013 کے کلینڈر کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے اور اگر اردو زبان کمزور ہوتی ہے تو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب بھی کمزور ہوگی۔ انھوں نے اردو زبان کے فروغ میں جامعہ اردو علی گڑھ کے رول کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے وقت ہندوستان میں جس طرح جامعہ اردو علی گڑھ نے اردو زبان کے توسط سے عام لوگوں کو تعلیمی خودمختاری بخشی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ انھوں نے کہا کہ مرکزی حکومت کو پارلیامنٹ میں بل لاکر جامعہ اردو علی گڑھ کو اوپن یونیورسٹی کا درجہ دینا چاہیے۔

روزنامہ'سیاسی تقدیر' دہلی، 22 جنوری 2013

دھلی: ——————

ہندوستان کی تہذیب ہے اردو: شیلا دیکشت

نئی دھلی: اردو وہ زبان ہے جس سے ہم بولنا سیکھتے ہیں۔ اردو کی تہذیب دہلی اور پورے ہندوستان کی تہذیب کہلائی جاتی

ہے۔ اسی روایت کو قائم رکھنے کا کام اردو اکادمی کرتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار دہلی کی وزیراعلیٰ شیلا دکشت نے دہلی اردو اکادمی کی جانب سے تاریخی لال قلعے کے سبزہ زار پر منعقد مشاعرہ جشن جمہوریت میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ مشاعرہ دہلی والوں کے لیے فخر کی بات ہے اور یہ ہمارے ملک کی تہذیب ہے جس کے لیے اردو زبان اور تہذیب کے راگ رنگ، مشاعرہ، صوفی قوالی، ڈراما اور دیگر تقریبات اردو اکادمی دہلی، ہندی اکادمی، میتھلی اکادمی، پنجابی اکادمی، سندھی اکادمی،

بھوجپوری اکادمی اور تمام اکادمیاں پورے سال مختلف مقامات پر منعقد کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کلاسیکل میوزک اور راگ رنگ کا سلسلہ بھی پورے سال جاری رہتا ہے۔ وزیراعلیٰ نے کہا کہ دہلی سرکار اور مرکزی سرکار کے تمام وزرا ہندوستانی تہذیب اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ مشاعرے کا آغاز وزیراعلیٰ شیلا دیکشت، وزیرتعلیم پروفیسر کرن والیہ، وزیر توانائی و خوراک و رسد ہارون یوسف، پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر جی آر کنول نے شمع روشن کر کے کیا۔ معروف فنکار سدھانشو بہوگنا اور ان کی ٹیم نے علی سردار جعفری کا ترانہ اور علامہ اقبال و رویندر ناتھ ٹیگور کا قومی ترانہ پیش کیا۔ مشاعرے کا باقاعدہ آغاز شبینہ ادیب نے قومی گیت سے کیا۔ تقریب میں ابتدائی نظامت اردو اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے کی جب کہ مشاعرہ کی نظامت واصف فاروقی نے انجام دی۔ اس موقعے پر ہارون یوسف، پروفیسر کرن والیہ، شعیب اقبال اور پروفیسر اختر الواسع نے شعرائے کرام کو پھولوں کی کلیاں پیش کیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ لال قلعے کا تاریخی مشاعرہ ہے جو مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے سے منعقد کیا جاتا رہا ہے۔ اس موقعے پر اسپیشل سکریٹری محکمہ فن وثقافت والسنہ سنتوش ویدیہ، ایڈیشنل سکریٹری وشوموہن، ڈپٹی سکریٹری، راجیش سچدیوا، سکریٹری پنجابی اکادمی ڈاکٹر رویل سنگھ، سکریٹری ہندی اکادمی، ڈاکٹر ہری سمن بشٹ، سکریٹری سندھی اکادمی سندھو مشرا، سکریٹری سنسکرت اکادمی ڈاکٹر دھرمیندر کمار، دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر پرویز میاں، سٹی زون کے چیئرمین آل احمد اقبال، ڈپٹی چیئرمین عمران حسین بطور خاص موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 19 جنوری 2013

اردو گھر میں جمیل الدین عالی کی سالگرہ

نئی دہلی: اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، شاعر، محقق اور انجمن ترقی اردو پاکستان کے معتمدِ اعزازی جناب جمیل الدین عالی (ولادت: 20 جنوری 1925، دہلی) کی انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر، نئی دہلی میں 88 ویں سالگرہ منائی گئی۔ تقریب کی صدارت انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے فرمائی۔ اس موقعے پر جمیل الدین عالی کے صاحب زادے جناب راجو جمیل جو پاکستان سے تشریف لائے ہوئے تھے، وہ اس تقریب میں بذاتِ خود شریک تھے۔ راجو جمیل نے اپنے والدِ محترم کی شخصیت و خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جمیل الدین عالی دہلی میں ہی پیدا ہوئے تھے اور تقسیم تک وہ دہلی کے گلی قاسم جان، بلی ماران میں قیام پذیر رہے۔ بعد میں وہ پاکستان ہجرت کر گئے جہاں وہ کئی علمی، ادبی اور سرکاری اداروں کے سربراہ رہے۔ اس وقت بھی وہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے معتمدِ اعزازی کے علاوہ کئی اداروں سے وابستہ ہیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے جمیل الدین عالی کے صاحب زادے راجو جمیل کی اردو گھر میں آمد پر ان کا خیر مقدم کیا اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی مختصر تاریخ بھی بیان کی۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے جمیل الدین عالی کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ عالی کا شمار اردو کے معروف اور مقبول شاعروں میں ہوتا ہے۔ نثر نگاری میں بھی انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ سید شریف الحسن نقوی نے جمیل الدین عالی کے علمی و ادبی کارناموں کو قابلِ قدر بتاتے ہوئے کہا کہ وہ ایک عظیم فن کار ہیں۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے جمیل الدین عالی کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ وہ جب کبھی بھی ہندوستان آتے تو انجمن کے دفتر میں بھی تشریف لاتے، ان سے کئی خوش گوار ملاقاتیں ہوئیں۔ راجو جمیل نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے مختلف شعبوں کا بھی معائنہ کیا، خاص طور سے انجمن کی شبلی لائبریری اور آرکائیوز میں گئے جہاں انھوں نے جمیل الدین عالی کی متعدد کتابوں اور خطوط کو دیکھ کر اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کیا۔ جناب راجو جمیل کے ساتھ اس ملاقات میں جو دیگر اراکین انجمن شامل تھے ان میں پروفیسر محمد ذاکر، ڈاکٹر فیروز دہلوی، دہلی پبلک اسکول متھرا روڈ کے پرنسپل محمد اقرار حسین اور ڈاکٹر عبدالرشید وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق'، دہلی، 22 جنوری 2013

پروفیسر نارنگ کے پاکستانی اعزاز سے ریاستی حکومت متفق

نئی دہلی: حکومت دہلی نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو پاکستان کے ذریعے دیے جانے والے تیسرے اعلیٰ ترین سول اعزاز 'ستارۂ امتیاز' پر اتفاق ظاہر کیا ہے۔ وزیراعلیٰ شیلا دکشت نے وزیر امور خارجہ سلمان خورشید سے کہا کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اعزاز حاصل کر سکتے ہیں۔ غور طلب ہے کہ وزارت نے حکومت دہلی کو اس معاملے پر اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے کہا تھا۔ وزارت امور خارجہ کے خط کے جواب میں دکشت نے اتفاق ظاہر کیا ہے کہ نارنگ نے اردو زبان وادب کی زبردست خدمت کی ہے نیز اردو زبان نارنگ کی ادبی کاوشوں سے مالا مال ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے سابق سربراہ پدم بھوشن نارنگ نے ذرائع ابلاغ سے کہا کہ وہ حکومت پاکستان اور عوام کے شکر گزار ہیں جنھوں نے ان کی ادبی خدمات کو تسلیم کیا ہے۔ واضح ہو کہ حکومت پاکستان نے پروفیسر نارنگ کو ستارۂ امتیاز سے نوازہ ہے جو 23 مارچ کو صدر پاکستان کے ہاتھوں اسلام آباد میں پیش کیا جاتا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق'، دہلی 9 فروری 2013

ڈرامہ 'غالب اِن نیو دہلی'

نئی دہلی: شری رام سنٹر میں مشہور شاعر اسداللہ خان غالب پر ماڈرن زمانے کے اعتبار سے ڈاکٹر سعید عالم کے ذریعے لکھے گئے ڈرامہ پر سوشل پرائڈ ویلفیئر آرگنائزیشن (این جی او) کے ذریعے ایک پلے کا پروگرام منعقد کیا گیا۔ یہ ڈرامہ ڈاکٹر سعید عالم نے خود ہی ڈائریکٹ کیا ہے۔ اس میں وہ خود اہم کردار بن کر ناظرین کے سامنے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر عالم کے فن کا کمال یہ ہے کہ شروع سے آخر تک کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ واقعی میں یہ غالب نہیں ہیں۔ انھوں نے غالب کا ہر وہ انداز ناظرین کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ اگر اس وقت غالب ہوتے تو وہ کس انداز میں شاعری کرتے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 فروری 2013

آندھرا پردیش

اردو ادب میں جدید رجحانات پر مذاکرہ

حیدرآباد: رجحان کا تعلق شاعری، ادب اور زندگی کے ساتھ گہرا ہے اور اقدار کی تبدیلی کے ساتھ فکر و خیال میں تبدیلی لازمی ہے۔ پروفیسر رزاق فاروقی سابق صدر شعبہ اردو/ فارسی گلبرگہ یونیورسٹی (کرناٹک) نے بزم جوہر کے ماہانہ مذاکرے 'اردو میں جدید رجحانات' کے زیر عنوان مسدوسی ہال مغل پورہ میں اپنے خصوصی خطاب کے دوران ان خیالات کا اظہار کیا۔ صادق نوید سابق صدر شعبہ اردو/ عربی سینٹ جارجس گرامر کالج نے کہا کہ انسانی رجحانات میں تبدیلی فطری امر ہے۔ مولانا نادر المسدوسی نے کہا کہ شاعری میں ترقی پسندی، جدیدیت اور پھر کلاسیکی کے تین ادوار بھی اپنی اپنی جگہ معیار و اعتبار رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر بشیر احمد محقق نے اردو شاعری میں میر تقی میر کو اہم شاعر قرار دیا ہے۔ اس موقعے پر خورشید احمد حاجی، اور اثر غوری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بعد میں مشاعرہ منعقد ہوا۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 14 جنوری 2013

اتر پردیش:

سر سید اور اسماعیل پانی پتی پر سیمینار

سنبھل: سر سید ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے اور انھوں نے مختلف محاذوں پر قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھا۔ سر سید کے تحریری سرمایے کو جمع کرنا شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کا عظیم کارنامہ ہے، ان خیالات کا اظہار ماہر اقتصادیات پروفیسر شاہ محمد وسیم نے مہاتما گاندھی میموریل پوسٹ گریجویٹ کالج سنبھل کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار بعنوان 'سر سید اور اسمٰعیل پانی پتی' کی افتتاحی تقریب میں کیا۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر ایس ایم جعفری نے کہا کہ تحریک سر سید کا فیض ہے کہ ملک اور قوم نے تعلیم کے شعبے میں ترقی کی ہے۔ ایم پی ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برق نے صدارتی خطبہ پیش کیا۔ اس موقعے پر اے کے گوئل، حماد احمد ایڈووکیٹ، ڈاکٹر اسما پروین، ضیاء الرحمٰن برقی، گیان پرکاش گپتا، ہما فاطمہ، ڈاکٹر محمد عمران، دلدادولہا، حسین افسر، محمد نسیم، عبدالرحمٰن ایڈووکیٹ، ارون کمار گپتا، رضاء الرحمٰن عاکف، ڈاکٹر آر این پاٹھک، لئیق رضوی اور ڈاکٹر ڈی این شرما، ڈاکٹر کشور زیدی، ڈاکٹر ارشد رضوی وغیرہ موجود تھے۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 فروری 2013

علی گڑھ نمائش میں اردو جلسہ

علی گڑھ: ریاستی زرعی و صنعتی نمائش کے مکت آکاش منچ پر کل ہند اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے 12 ویں اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے صوبائی وزیر شاہد منظور نے کہا کہ اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے تھانوں میں مترجم رکھے گئے لیکن اردو زبان میں تھانوں میں درخواستیں ہی نہیں آتیں۔ اردو زبان کے مسئلے کا حل تب ہوگا جب ہم خود اپنے بچوں میں اردو زبان کا ذوق پیدا کریں گے اور سرکاری محکموں میں اردو زبان کا استعمال کریں گے۔ اردو زبان میں درخواستیں آنے سے ہی سرکاری محکموں میں پتا چلے گا کہ اردو زبان کے کتنے لوگ صوبے میں موجودہ ہیں۔ جب عوام میں اردو زبان کا شوق بڑھے گا تو حکومت بھی اردو زبان کے فروغ کے لیے سنجیدہ ہوگی۔ میرٹھ کے دھولانہ اسمبلی حلقے سے اسمبلی ممبر دھرمیش سنگھ تومر نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو زبان آج بھی ہندوستانیوں کی رگوں میں رچی بسی ہے۔ علی گڑھ کے ڈی آئی جی پرکاش ڈی نے کہا کہ اردو ادب اور تہذیب کی زبان ہے۔ پولس محکمہ میں آج بھی اردو زبان کے الفاظ کا استعمال

دسویں اردو تعلیم کانفرنس

علی گڑھ: اتر پردیش اُردو ٹیچرس ایسوسی ایشن علی گڑھ ریجن کے زیر اہتمام دسویں اُردو تعلیم کانفرنس بموضوع 'اردو اساتذہ کی اردو زبان کے فروغ میں ذمہ داریاں' کا انعقاد علی گڑھ نمائش کے مکت آکاش ہال میں کیا گیا جس کی

صدارت نواب ابن سعید خاں آف چھتاری نے کی۔ معروف صحافی ڈاکٹر ایم یو خاں نے اپنے خطاب میں کہا کہ گھروں میں اردو کا رواج نہ کے برابر ہوگیا ہے۔ محبانِ اردو کو اس کے فروغ کے لیے آگے آنا ہوگا، جس کے لیے سب سے پہلے گھروں میں اردو اخبارات اور رسائل کی خرید کو یقینی بنانا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم اب بھی بیدار نہ ہوئے تو اردو تہذیب و ادب کے ساتھ مذہبی عقائد کو بھی خطرہ لاحق ہوگا۔ سماجوادی پارٹی کے صوبائی سکریٹری مجاہد قدوائی نے کہا کہ سماجوادی پارٹی اُردو زبان اور اس کی ترقی کے لیے کوشاں ہے اور مسلسل اقدام کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان اور اساتذہ کے جو بھی مسائل ہوں گے انھیں حل کرایا جائے گا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکریٹری اور ایم ایل سی وویک بنسل، سماجوادی پارٹی کے ضلع صدر ڈاکٹر رکش پال سنگھ اور دیگر مقررین نے بھی موضوع کی مناسبت سے خطاب کیا۔ جلسے کے کنوینز کنور نسیم شاہد نے نظامت کی۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 29 جنوری 2013

کیا جاتا ہے۔ کل ہند کانگریس کمیٹی کی ممبر پرتیما سنگھ، کل ہند اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے قومی صدر مبین خان نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 فروری 2013

عہدِ مابعد جدیدیت میں سر سید کی معنویت

علی گڑھ: سر سید اویرنیس فورم کے زیر اہتمام سرکاری صنعتی و زراعتی نمائش کے مکت آکاش منچ پر 'سر سید احمد کی معنویت عہد مابعد جدیدیت میں' موضوع پر سیمینار ہوا جس سے خطاب کرتے ہوئے بطور مہمان خصوصی سابق ایڈووکیٹ جنرل، یو پی ایس ایم اے کاظمی نے کہا کہ اب کبھی بھی کوئی سر سید پیدا نہیں ہوسکتا کیونکہ نہ وہ اب حالات برپا ہوسکتے ہیں اور نہ ہی وہ فکر آسکتی ہے۔ پروگرام کے کنوینز اور فورم کے صدر ڈاکٹر شکیل احمد صمدانی نے کہا کہ سر سید نے ہمیشہ تعلیم کے ساتھ تربیت کا ذکر کیا کیونکہ بغیر تربیت کے تعلیم فضول اور بلا فائدہ ہے۔ اے سی ایم پورن سنگھ رانا نے کہا کہ سر سید پر کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے جیسا ہے، ہم صرف ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں یہی ان کو خراجِ عقیدت ہوگا۔ سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر این اے کے درانی نے کہا کہ سر سید نے قوم اور ملک کی ترقی کے لیے تعلیم کو اپنا ہتھیار بنایا۔ اے سی این گروپ آف انسٹی ٹیوشنس کے

ڈائرکٹر ڈاکٹر سید جاوید اختر، یو پی رابطہ کمیٹی کے سکریٹری عبیداللہ اقبال عاصمی، روبینہ خانم، اے ایم یو اسٹوڈنس یونین کے نائب صدر توصیف عالم وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 فروری 2013

فہمیدہ ریاض سے ادبی ملاقات

لکھنؤ: "میری تحریریں میرے ہنگامہ خیز اور پرآشوب مسائل کی آئینہ دار ہیں۔ میں نے ان انسانی اور سماجی اقدار کی ترجمانی کی ہے جن کا تحفظ ہم سب پر واجب ہے۔ میں نے اظہار کی آزادی کو اوّلین ترجیح دی ہے اور اس عہد کی ستم دیدہ اور مظلوم عورت میری نظموں کا مرکزی موضوع ہے۔" ان خیالات کا اظہار پاکستان کی معروف ادیب اور شاعرہ فہمیدہ ریاض نے کیا۔ اپنے ادبی سفر پر تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ظلم کے خلاف احتجاج اور مزاحمت میری زندگی کا بنیادی اصول ہے اور میں ہمیشہ اسی اصول پر عمل پیرا رہی ہوں۔ اسی اصول کی پیروی کی پاداش میں مجھے دوبار اپنے ملک سے جلاوطن ہونا پڑا، اور طرح طرح کی صعوبتیں اٹھانا پڑیں۔ فہمیدہ ریاض نے کہا کہ میری نظمیں دراصل ایک رجز ہیں جنھیں پڑھتی ہوئی میں اپنے مقتل سے گزرتی ہوں، اس لیے میری پوری شاعری ایک طرح کا رزمیہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے شعری اور نثری ادب میں عورت کے

مسائل پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن موجودہ عہد میں اس کے مسائل کی نوعیت بدل گئی ہے۔ میں نے جس عورت کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے وہ اپنے روحانی اور جسمانی مسائل سے نبردآزما ہے۔ میں اپنی شاعری کے ذریعے اس عورت کی حرمت اور سالمیت کی جنگ لڑرہی ہوں۔ فہمیدہ ریاض نے اپنے مختلف مجموعوں سے اپنے خاص انداز میں بہت سی نظمیں سنائیں اور ان نظموں پر کیے جانے والے اعتراضات سے بھی سامعین کو آگاہ کیا۔ فہمیدہ ریاض کی نظم خوانی کے بعد سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ سامعین کے مختلف سوالوں کے جواب میں فہمیدہ ریاض نے کہا کہ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں ملکوں کے رشتے استوار کیے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ دونوں ملک کے ہوش مند عوام امن چاہتے ہیں۔ ہمارے معاشی وسماجی مسائل ایک سے ہیں ہم جتنی ہم آہنگی اور یگانگت کے ساتھ رہیں گے اسی قدر ہم ان مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 فروری 2013

اردو میں ٹریننگ ماڈیول کے لیے ورکشاپ

پٹنہ: ایس سی ای آر ٹی کے وسیع ہال میں ماہرین تعلیم، معروف ادیبوں اور نمائندہ معلموں کی شمولیت سے ایک ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا جس میں شعبے کے صدر ڈاکٹر قاسم خورشید نے بتایا کہ ہم ڈائرکٹر حسن وارث کی سرپرستی میں تعلیم کے معیار کو اور وسعت دینے، ساتھ ہی نئی نسل کو خاص دھارے سے جوڑنے کے لیے اہم اقدامات کررہے ہیں۔

مہمان خصوصی اور سابق وائس چانسلر و ماہر نفسیات پروفیسر شمشاد حسین نے کہا کہ جو ماحول بنایا گیا ہے وہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ہم کسی بھی بڑے مقصد کی تکمیل کے لیے مکمل طور پر اہل ہیں۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ بچوں کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے خود کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ جب تک ہم اپنی پہچان نہیں کریں گے تب تک ہم اسے اوروں میں اور خصوصی طور پر طالب علموں میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے استعمال نہیں کرسکتے۔ اس موقعے پر سابق صدر شعبہ اردو مگدھ یونیورسٹی اور مشہور ماہر تعلیم پروفیسر علیم اللہ حالی نے کہا کہ اردو میں بچوں کے لیے ٹریننگ ماڈیول بنانے کا کام پہلی بار کیا جارہا ہے اور اب ہمارے اساتذہ اس ماڈیول کے ذریعے اور بھی بہتر تعلیمی ماحول فراہم کرواسکیں گے۔ ہندی کے نامور ادیب بھگوتی پرساد دویدی نے کہا کہ اس ورک شاپ میں، یہ احساس جاگا ہے کہ ہم جو بچوں کے لیے لکھتے ہیں اسے کس طرح بچوں تک پہنچانے میں بھی اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ انھوں نے ایس سی ای آر ٹی کو مبارک باد پیش کی کہ بیک وقت اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اتنا اہم کام کیا جارہا ہے۔ ماہر تعلیم کے کے ٹھاکر نے کہا کہ بنیادی سطح پر اگر ہم بچوں کی تعلیم کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو پھر آگے کے لیے راہیں ہموار ہوجاتی ہیں۔

پریس ریلیز، قاسم خورشید، پٹنہ 10 فروری 2013

اردو کے لیے موثر اقدامات کا مطالبہ

ٹانڈہ: انجمن ترقی اردو اترپردیش کی ایک میٹنگ قصبہ کے محلہ بھبل پوری میں واقع انجمن کے صوبائی کیمپ آفس پر منعقد ہوئی جس میں سرکار سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق اردو کی ترقی کے لیے ٹھوس اقدامات کرے اور سابقہ ملائم حکومت کی طرز پر تمام سرکاری دفاتر میں اردو مترجم اور پرائمری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کرے علاوہ ازیں گزشتہ سترہ سال سے بے روزگاری کی مار جھیل رہے اردو معلمین کی تقرری براہِ راست ترجیح کی بنیاد پر کی جائے۔ میٹنگ سے انجمن کے صدر زاہد ٹانڈوی نے خطاب کیا اور کہا کہ اردو کی جڑوں میں ہم لوگ خود تیزاب ڈال رہے ہیں ہمیں اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ ہم خود اردو کے لیے کیا کررہے ہیں۔

پریس ریلیز انجمن ترقی اردو اترپردیش، ٹانڈہ، 10 فروری 2013

بہار:

مونگیر میں یومِ اردو

مونگیر: ضلع جمعیت الراعین مونگیر کے زیراہتمام صدر انجینئر نشاط انور راعین کی صدارت میں راعین پنچایت ہال مونگیر میں 10 جنوری کو یومِ اردو کا انعقاد ہوا، الحاج عمر آزاد راعین نے شمع روشن کرکے پروگرام کا آغاز کیا، نظامت شرف الدین راعین نے کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں انجینئر نشاط راعین نے شیر بہار الحاج غلام سرور کی حیات اور عوامی خدمات پر روشنی ڈالی۔ ترجمان شاہد راعین گڈو نے کہا ہے کہ اب مرکزی اور بہار سرکار اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی حتی الامکان کوشش کررہی ہے۔ لہٰذا ہم نئی نسل کو اردو پڑھنے کے لیے شوق دلائیں، اردو کا ماحول بنانے کے لیے بچوں کا اردو رسالہ خرید کر ان کو دیں۔

روزنامہ 'قومی تنظیم' پٹنہ، 12 جنوری 2013

جھارکھنڈ:

ہائی اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری

رانچی: ریاست کے ہائی اسکولوں میں اب اردو اساتذہ کی بھی تقرری ہوگی۔ محکمہ فروغ انسانی وسائل نے قومی ثانوی تعلیمی مہم کے تحت 894 ہائی اسکولوں میں دیگر علاقائی زبانوں کے علاوہ اردو اساتذہ کی تقرری کی تجویز تیار کی ہے۔ اس کے تحت ضرورت کے مطابق ہائی اسکولوں میں اردو اساتذہ کی ایک ایک عہدے پر تقرری کی جائے گی۔ تقرری کے لیے تیار ہورہی شرط دستورالعمل کو گزشتہ دنوں محکمہ قانون نے اپنی منظوری دے دی۔ اب اسے پرسنل ڈپارٹمنٹ کے پاس منظوری کے لیے بھیجا گیا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ 338 ریزروہائی اسکولوں میں 134 اردو اساتذہ کی تقرری کی کارروائی پہلے ہی کی گئی تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 جنوری 2013

کرناٹک:

گلبرگہ میں اردو اساتذہ کی تقریب

گلبرگہ: مسلم گورنمنٹ ایمپلائز اسوسی ایشن محکمہ تعلیمات ضلع گلبرگہ کی جانب سے مغل گارڈن فنکشن ہال میں ضلعی بیسٹ ٹیچر ایوارڈ پروگرام کا انعقاد عمل میں آیا، صدارت ایم ایل اے قمرالاسلام نے کی، اور افتتاح ایم پی و سابق وزیراعلیٰ کرناٹک این دھرم سنگھ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے سابق ایم پی اقبال احمد سرڈگی، سید عبدالرب، علاقائی کمشنر محکمہ تعلیمات گلبرگہ متین پٹیل، چیئرمین وقف مشاورتی کمیٹی گلبرگہ و زیڈ پی ممبر ٹی جے راموڈی ڈی پی آئی گلبرگہ، محترمہ مہرالنسا بیگم

پرنسپل ڈائٹ کملاپور چن بسپا مدھول ڈی وائی پی سی ایس ایس اے گلبرگہ، پیورزاق پٹیل اے آر پی گروپ افضل پور وغیرہ موجود تھے۔ مہمان خاص این دھرم سنگھ نے کہا کہ اردو زبان میں جو شیرینی ہے وہ کسی زبان میں نہیں، مجھے بڑی خوشی ہورہی ہے کہ ایک عرصے کے بعد اتنی کثیر تعداد میں ٹیچرس برادری جمع ہے۔

روزنامہ 'سیاست' بنگلور 9 جنوری 2013

چنتامنی میں اردو کے حالات پر اظہارِ تشویش

چنتامنی: یہاں کے شانتی نگروارڈ کے ایم کے بی اسکول کے دوسرے سالانہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے بی ای او کے جی رنگیا نے کہا کہ اردو زبان بہت ہی پیاری زبان ہے اس زبان کو نقصان اگر ہورہا تو وہ اردو اساتذہ سے ہی ہورہا ہے۔ آج خود اردو اساتذہ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دینا پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ آج اردو اساتذہ کی لاپرواہیوں سے اردو اسکول میں طلبا کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے ان کی لاپروائیوں سے ہی اردو اسکول میں طلبا کی تعداد گھٹتی جارہی ہے۔ کیوار اسکول کے میر معلم ہنمنتپا نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم کے بغیر کوئی ملک ترقی نہیں کرسکتا تعلیم کا حاصل کرنا ہر ایک کے لیے بہت ہی ضروری ہے۔ اس موقعے پر کنڑا کے شاعر کے ایس نوراللہ نے بھی جلسے کو خطاب کیا اور آخر میں اسکول کے طلبا نے کئی ڈرامے پیش کیے میر معلّمہ محبوب جان نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا، رسول خان، ضلع اردو سنگھا کے صدر عبدالخالق، معلم و کنڑا شاعر رحیم خان، ایڈوکیٹ انور، محمد اسلم، کونسلر رجنا، اکبر شاہ آمری، قادر باشاہ، سی آر پی محمد کلیم اللہ، اور کئی اساتذہ اور طلبا کے والدین موجود تھے۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 20 جنوری 2013

ہبلی کے اردو اسکول میں کمپیوٹر لیب

ہبلی: انجمن اسلام ہبلی کے تحت چلنے والا ادارہ انجمن اردو ہائی اسکول عیدگاہ میدان اولڈ ہبلی میں کمپیوٹر لیب کا افتتاحی پروگرام بڑے ہی تزک واحتشام کے ساتھ اسکول کے ہیڈ ماسٹر شبیر بیگ مرزا کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ سابق وزیر، صدر انجمن اسلام ہبلی جبار خان ہونلی بحیثیت مہمان خصوصی تشریف لائے۔ عہدیداران وممبران انجمن اسلام ہبلی میں محمد عارف مجاور، شرف علی، بابا جان چودھری، اے ڈی مڈکی، سلیم سنڈ کے اعزازی مہمانان کے طور پر شریک ہوئے۔ مہمان خصوصی جبار خان نے کمپیوٹر چلا کر افتتاح کرنے کے بعد طالبات کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج کل ساری دنیا میں کمپیوٹر کا انقلاب آیا ہے۔ دور جدید سائنس کی ایجادات اور کرشمات کا دور ہے۔ لہٰذا ہر مرد وعورت کو کمپیوٹر کا سیکھنا ضروری ہے۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور 20 جنوری 2013

مہاراشٹر:

خلدآباد کے کالج میں سمپوزیم

خلدآباد: کوہ نور کالج آف آرٹس کامرس و سائنس خلدآباد میں تمام زبانوں کی جانب سے پرنسپل کوہ نور کالج پروفیسر ڈاکٹر بیگ اختر مرزا کی صدارت میں سمپوزیم منعقد ہوا۔ بشر نواز مہمانِ خصوصی تھے۔ تمام لینگویجز کے پروفیسر جن میں پروفیسر گائیکواڑ پر پروفیسر دیگاؤنگر (شعبۂ مراٹھی)، پروفیسر جیتے ایس ایس، پروفیسر لہانے (شعبۂ ہندی) پروفیسر ڈاکٹر خلیل احمد ندوی (شعبۂ عربی)، پروفیسر سید عرفان، پروفیسر شیخ لئیق (شعبۂ انگریزی) پروفیسر ڈاکٹر قمرالنسا پروفیسر مجاہد انصاری (شعبۂ اردو) شامل ہیں۔ مذکورہ بحث میں حصہ لیا۔ مہمان خصوصی فخر مراٹھواڑہ بشر نواز نے اپنے خطاب میں کہا کہ ٹی وی اور دیگر ذرائع ابلاغ سماج ومعاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے میڈیا ذرائع ابلاغ کے گرتے معیار پر افسوس کا اظہار کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر بیگ اختر مرزا نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ٹی وی میڈیا ایک ہے جو سماج و معاشرے پر مثبت اور منفی دونوں اثر کرتے ہیں۔ پروگرام کی نظامت پروفیسر ڈاکٹر پردھان نے کی جب کہ اظہار تشکر پروفیسر خضر سعید نے کیا۔

روزنامہ 'اورنگ آباد ٹائمز' اورنگ آباد، مہاراشٹر 17 جنوری 2013

اعزاز و اکرام:

سالک لکھنوی، ندا فاضلی اور اختر الواسع کو پدم شری

نئی دھلی: مشہور سائنس داں پروفیسر یشپال ملک کے میزائل پروگرام کے اہم ستون ڈاکٹر وی کے سارسوت، ماہر اسلامیات پروفیسر اختر الواسع، مشہور شاعر ندا فاضلی

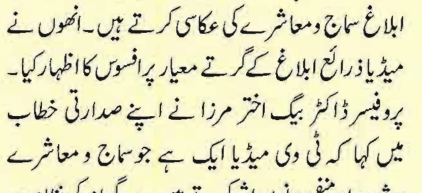

اور آنجہانی فلم سپر اسٹار راجیش کھنہ، کرکٹر راہل دراوڑ اور صنعت کار آدی گودریج سمیت 108 مشہور اور ممتاز شخصیتوں کو آج 64 ویں یوم جمہوریہ کے موقعے پر پدم اعزازات سے سرفراز کرنے کا اعلان کیا گیا۔ پروفیسر یشپال کے علاوہ مجسمہ ساز رگھوناتھ مہاپاتر، مصور ایس حیدر رضا اور سائنس داں پروفیسر آر نرسمہا کو ملک کے دوسرے سب سے بڑے شہری اعزاز پدم وی بھوشن کے لیے منتخب کیا گیا۔ سب سے بڑا شہری اعزاز بھارت رتن اس سال بھی کسی کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ کل 24 شخصیات کو پدم بھوشن، 80 کو پدم شری سے سرفراز کرنے کا اعلان کیا گیا جن میں 24 خواتین اور 11 این آر آئی بھی شامل ہیں۔ 108 ایوارڈ یافتگان میں 8 مسلم بھی شامل ہیں۔ ان میں ایس حیدر رضا (دہلی) کو پدم وی بھوشن سے سرفراز کیا جائے گا جب کہ استاد راشد خان (مغربی بنگال) کو پدم بھوشن ایوارڈ دیا جائے گا۔ پروفیسر اختر الواسع (دہلی)، شاعر ندا فاضلی (مہاراشٹر)، مرحوم سالک لکھنوی (مغربی بنگال)، پروفیسر ڈاکٹر محمد شرف عالم (بہار)، غلام محمد شاہنواز (جموں وکشمیر) اور ماہ رخ تاراپوری کو پدم شری ایوارڈ سے سرفراز کیا جائے گا۔ ہندی فلمی دنیا کے سدا بہار اسٹار رہے راجیش کھنہ کے علاوہ اداکارہ شرمیلا ٹیگور، مزاحیہ اداکار آنجہانی جسپال بھٹی، میزائل سائنس داں وی کے سارسوت اور 'دی وال' کے نام سے مشہور کرکٹر راہل دراوڑ پدم بھوشن کے لیے منتخب کی جانے والی شخصیات میں شامل ہیں جب کہ بالی ووڈ کی مشہور اداکارہ شری دیوی کو پدم شری دیا جائے گا۔ جنوبی ہند کی مشہور پلے بیک گلوکارہ ایس جانکی کو بھی پدم بھوشن اور سگم سنگیت کی فنکارہ سدھا ملہوترہ کو پدم شری سے نوازہ جائے گا۔ اپنی مزاحیہ نظموں سے سامعین کو ہنسانے والے سریندر شرما اور پدم شری کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ صدر جمہوریہ مارچ اپریل میں منعقد ہونے والی تقریبات میں یہ انعامات تقسیم کریں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جنوری 2013

انجم جمالی ایوارڈ پروگرام

میرٹھ: ڈاکٹر انجم جمالی میموریل فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ترقی پسند شاعر افسانہ نگار اور صحافی ڈاکٹر انجم جمالی کی یاد میں جمالی ایوارڈ ادب اور صحافت کے شعبوں میں نمایاں کارکردگی انجام دینے والوں کو دیے گئے ڈاکٹر انجم جمالی ایوارڈ پروگرام کے تحت مہمانِ خصوصی وزیر شاہد منظور، ایم ڈی اے کے نایاب تنویر ظفر علی نے شاعری کے حلقے میں اضر انقوی میں، الیکٹرونک میڈیا سہارا سے کے برجیش چودھری پرنٹ میڈیا کے حلقے میں شکیل حسن شمسی کو ڈاکٹر انجم جمالی ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ ڈاکٹر خالد حسین کو بھی اعجاز سے نوازہ گیا۔ پروگرام کی صدارت سو بھارتی

یونیورسٹی وی سی پروفیسر منظور احمد نے کی۔ فاؤنڈیشن کے سکریٹری انجینئر رفعت جمالی نے اپنے والد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مہمانوں کا استقبال کیا۔ پروگرام میں شہر قاضی زین الراشدین، شاعر اعجاز پاپولر، نظیر میرٹھی، محترمہ کامنی، نازش، دانش، عبدالاحد، رخشی، ثنا، بطور خاص موجود رہے۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 17 جنوری 2013

مغربی بنگال اردو اکادمی ایوارڈ

کولکاتا: مغربی بنگال اردو اکادمی نے ڈاکٹر جاوید نہال مرحوم 2010 اور شہود عالم آفاقی مرحوم کو قابل لحاظ ادبی خدمات کے اعتراف میں اکادمی ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے جو اکیاون ہزار روپے شال، توصیفی سند اور مومنٹو پر مشتمل ہے۔ صحافت کا مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ برائے 2009، معصوم مراد آبادی اور برائے 2010 مولانا اسرارالحق قاسمی کو دیا گیا ہے جو مبلغ بیس ہزار روپے، شال، توصیفی سند اور مومنٹو پر مشتمل ہے۔ پرویز شاہدی ایوارڈ برائے 2008 ڈاکٹر اقبال جاوید کو برائے 2009، ڈاکٹر مشتاق اعظمی کو اور برائے 2010 بازغ بہاری مرحوم کو دیا جائے گا یہ ایوارڈ بھی مبلغ بیس ہزار روپے، ایک شال، توصیفی سند اور مومنٹو پر مشتمل ہے۔ علامہ رضا علی وحشت ایوارڈ (مطبوعہ کتابوں پر انعامات) ریاست مغربی بنگال میں مختلف موضوعات، اصناف و فنون پر چھپنے والی کتابوں پر دیے جانے والے انعامات کو علامہ رضا علی وحشت ایوارڈ سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس ایوارڈ کے لیے سات مختلف زمروں کے تحت انعامات رکھے ہیں۔ 2008، 2009 اور 2010 کے لیے موصولہ کتابوں کو انعامات کے زمرے میں رکھتے ہوئے انعامات کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔

پریس ریلیز محمد شاہد سکریٹری، مغربی بنگال اردو اکادمی، 9 جنوری 2013

عبدالمنان طرزی اور ایس پی سنگھ کو اعزازیہ

دربھنگہ: ڈان باسکو اسکول بی بی پاکر دربھنگہ کے

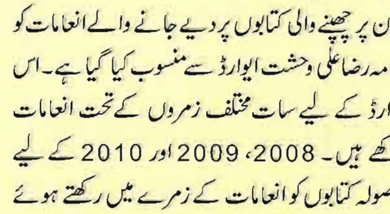

کانفرنس ہال میں سابق مرکزی وزیر محمد علی اشرف فاطمی کی صدارت اور پروفیسر شمیم احمد باروی کی نظامت میں رضا کار تنظیم 'المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ' دربھنگہ کی جانب سے اعزازیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں صدر جمہوریہ ہند سے ایوارڈ یافتہ اردو فارسی کے معروف شاعر پروفیسر عبدالمنان طرزی اور للت نرائن متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایس پی سنگھ کو سپاس نامہ، شال اور مومنٹو کے ساتھ اعزاز سے نوازہ گیا۔ خطبہ استقبالیہ صحافی مولانا عبدالمتین قاسمی نے پیش کیا۔ ڈاکٹر طرزی اور ڈاکٹر ایس پی سنگھ کو علی اشرف فاطمی کے ہاتھوں اور مسٹر فاطمی کو وائس چانسلر کے ہاتھوں اعزاز بخشا گیا۔ اس موقع پر صدارتی کلمات میں مسٹر فاطمی نے کہا کہ میرا ماننا ہے کہ جب تک اردو کو روزگار سے نہ جوڑا جائے اسے سمٹنے سے کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ اعزازیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر ڈاکٹر ایس پی سنگھ نے عزت افزائی پر شکریہ ادا کیا اور اعلان کیا کہ متھلا یونیورسٹی سے وابستہ عظیم شخصیت کو نوازنا قابل تعریف قدم ہے۔ ملت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مشتاق احمد نے اپنے تاثرات میں کہا کہ وہ قوم زندہ رہتی ہے جو اپنے اسلاف کو یاد کرتی ہے، المنصور ٹرسٹ نے اپنے اسلاف اور ہم عصروں کی خدمات کا اعتراف کر کے اچھی روایت شروع کی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 جنوری 2013

عرشی کلیری کو امیر خسرو ایوارڈ

سرزمین اولیا پیران کلیر شریف سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر جناب عرشی کلیری کو پروفیسر وسیم بریلوی، افضل منگلوری اور گورنر اتراکھنڈ عزیز قریشی کے ہاتھوں امیر خسرو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ حضرت صابر کلیری کے مشاعرے میں امیر خسرو ہندی اردو اکادمی اتراکھنڈ کی جانب سے عطا کیا گیا ہے۔ عرشی کلیری اتراکھنڈ کے مشہور ادیب و شاعر ہیں، خصوصاً مدحیہ شاعری میں انھیں امتیازی مقام حاصل ہے ان کے مضامین و اشعار ملک کے مؤقر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انٹرنیشنل شاعر پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ عرشی کلیری جیسے لوگوں سے اردو ادب کا مستقبل وابستہ ہے ہم ان کی علمی ترقی اور درازی عمر کے لیے دعا گو ہیں۔

پریس ریلیز، پرویز علی 2 فروری 2013

غضنفر اقبال اور رؤف خوشتر کو اعزازیہ

بیجاپور: غضنفر اقبال اور پروفیسر رؤف خوشتر کے اعزاز میں بزم اردو کا جلسہ منعقد ہوا اس میں تہنیت قبول کرتے ہوئے حال ہی میں ساہتیہ اکادمی یووا ایوارڈ سے سرفراز ڈاکٹر غضنفر اقبال سہروردی نے اردو کی موجودہ صورت حال پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ اردو کی اس قدر زبوں حالی کے لیے اردو داں ہی ذمے دار ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے مرکزی حکومت کی بے شمار اسکیمیں موجود ہیں اور این سی پی یو ایل خصوصی طور پر اردو زبان و ادب کے فروغ کے میدان میں سرگرم عمل ہے۔ طنز و مزاح نگار خوشتر رؤف نے کہا کہ کسی بھی میدان میں غیر معمولی مہارت محنت، دلچسپی لگن اور مطالعے سے ممکن ہے اس لیے نوجوانوں کو چاہیے کہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں بھی غیر معمولی مہارت کے مذکورہ پیمانے کو اپناتے ہوئے اردو کو پروان چڑھائیں۔ صدر جلسہ و سابق ضلع جج جناب بشیر احمد سندگی نے اردو کے قلمکاروں کو آواز دی کہ اپنی تخلیقات، کلام، شاعری، افسانہ نگاری وغیرہ کو انٹرنیٹ بالخصوص سوشل سائٹ پر ڈال کر اردو کے میدان کو وسیع کریں مہمان مقرر پروفیسر دولت کوٹی اور ڈاکٹر منظور احمد انعامدار نے ڈاکٹر غضنفر اقبال اور پروفیسر رؤف خوشتر کی ادبی خدمات کو سراہا۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 20 جنوری 2013

کم سن طالب علم کو خوش نویسی کا انعام

گلبرگہ: شہر گلبرگہ کے ہیومن ایج گلشن اطفال اسکول کے جماعت ششم میں زیر تعلیم ایک کم سن طالب علم منہاج الدین پرواز نے خوش نویسی کی مشق کو جاری رکھتے ہوئے اس فن میں حسب استطاعت مہارت حاصل کی ہے۔

دسمبر ماہ کے اوائل میں محفلِ نسا بنگلور شاخ گلبرگہ کے زیر اہتمام اردو کے مختلف مقابلہ جات کا صحافت کے ذریعے اعلان ہوا تو منہاج الدین پرواز نے خوش نویسی کے مقابلے میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ منہاج الدین پرواز کی شخصی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے منتظمین نے بطور خاص اس مقابلے میں خصوصی شرکت کی اجازت دی اور 8 فروری کے مقابلے میں منہاج الدین نے اپنے فن خوش نویسی کا بھرپور مظاہرہ کیا جس کے لیے وہ خصوصی انعام کے حقدار قرار دیے گئے۔

پریس ریلیز، چاند اکبر گلبرگہ، 8 فروری 2013

امام اعظم کی مرتبہ کتاب کو 'قرطاس وقلم' ایوارڈ

کولکاتہ: ادارہ 'اخبارِ مشرق' کی جانب سے لگائے جانے والے اسٹال میں ہر سال مختلف ادبی، تعلیمی و ثقافتی سرگرمیوں کا انعقاد ہوتا ہے جن میں کتابوں کی فروخت کے ساتھ ساتھ طالب علموں کے لیے کوئز، مصوری، مضمون نویسی وغیرہ مقابلے کرائے جاتے ہیں وہیں دوسری جانب اردو شعر و ادب کی خدمت کرنے والے اداروں اور شعرا و ادبا کو ایوارڈ سے سرفراز کرنے کا سلسلہ بھی گزشتہ کئی برسوں سے جاری ہے۔ اس ضمن میں اس سال معروف شاعر، ادیب اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم، ریجنل ڈائریکٹر، مانو کولکاتا ریجنل سینٹر کی مرتبہ کتاب 'ہندوستانی فلمیں اور اردو' کو 'قرطاس وقلم' ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ یہ ایوارڈ ریاستی وزیر برائے ترقیات اور منصوبہ بندی شری راج پال سنگھ اور انجمن ترقی اردو ہند کی ریاستی شاخ کے سکریٹری ایم اے قاسم (علیگ) کے ہاتھوں دیا گیا۔ امام اعظم نے بتایا کہ یہ کتاب 12 مارچ 2011 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے منعقدہ سیمینار کے تحقیقی مقالوں کا مجموعہ ہے۔

پریس ریلیز، امام اعظم دربھنگہ، 8 فروری 2013

اشرف استھانوی

پٹنہ: معروف صحافی اشرف استھانوی کو ان کی گرانقدر صحافتی خدمات کے اعتراف میں غلام سرور صحافتی ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ سالارِ اردو اور شیر بہار الحاج غلام سرور کے 89 ویں یوم ولادت کے موقع پر مقامی بھارتیہ نرتیہ کلا مندر میں منعقدہ ایک باوقار تقریب میں سابق وزیر اعلیٰ بہار لالو پرساد نے اشرف استھانوی کو بیتاب صدیقی ایوارڈ 2012 سے نوازہ۔ مومنٹو نقد اور شال پیش کر کے لالو پرساد نے ان کی عزت افزائی کی۔ اس موقعے پر لالو پرساد نے کہا کہ اشرف استھانوی نے تقریباً 3 دہائیوں سے بہار کے مسلمانوں اور اردو کے مسائل کو متعدد ریاستی ملکی اور عالمی اخبارات ورسائل کے ذریعے بیباکی سے اٹھاتے رہے ہیں۔

پریس ریلیز، اشرف استھانوی، 10 فروری 2013

رسم اجرا:

سالانہ میگزین 'بزمِ ادب'

علی گڑھ: علی گڑھ کی ممتاز ادبی بزم 'بزم ادب خواتین' کے زیر اہتمام جنت مکانی خلیل الرحمن اعظمی کی رہائش گاہ 'اردو باغ' پر منعقدہ عظیم الشان تقریب میں بزم ادب خواتین کی سالانہ میگزین 'بزم ادب' کا اجرا اولڈ گرلس ایسوسی ایشن کی صدر بیگم ساجدہ نبی کے دستِ مبارک سے عمل میں آیا۔ اس سالانہ میگزین کا مذکورہ شمارہ 'خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر' کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی 8 فروری 2013

کاغذ کی کشتیاں

حیدرآباد: اردو ہال حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے زیر اہتمام دنیائے مغرب کے ممتاز شاعر مصطفیٰ شہاب کی تازہ شعری تخلیق 'کاغذ کی کشتیاں' کا رسم اجرا پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس ادبی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب (لندن) نے کی۔ جلسے کا آغاز جناب غلام یزدانی سینئر ایڈووکیٹ و صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ ممتاز ادیب اور اردو ادب کے مشہور و معروف اسکالر پدما بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا ''میں نے مصطفیٰ شہاب کی نظموں کو پڑھا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ حیرت ہوئی کہ یہ پہلے کہاں، چھپے بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بہت کم استعارے، تشبیہات اور محاورے استعمال کیے ہیں اور مشکل الفاظ کا استعمال نہیں کیا ہے بلکہ آسان اور سہل لفظوں کی مدد سے اپنی بات کہتے چلے جاتے ہیں جو ذہن و دل پر اثر کرتی ہیں۔ ان کی شاعری میں کبیر کے دوہوں کی خوشبو اور ملاحت کا احساس ہوتا ہے۔ پروفیسر نارنگ کے علاوہ مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین، سید امتیاز الدین معروف ترقی پسند شاعر راشد آزر نے بھی تقریب سے خطاب کیا۔ صدارتی خطبے میں ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب نے کہا کہ مصطفیٰ شہاب کے وہ ممنون و شکر گزار ہیں کہ وہ ان کے کہنے پر اپنی تازہ ترین شعری تخلیق 'کاغذ کی کشتیاں' کی رسم اجرا کے لیے تیار ہوئے۔ ممتاز براڈ کاسٹر ڈاکٹر شجاعت علی راشد (ڈپٹی ڈائرکٹر مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی) نے اجلاس کی کارروائی بڑے خوب صورت انداز میں چلائی اور حاضرین اجلاس کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، سید جاوید محی الدین، حیدرآباد، 22 جنوری 2013

اردو کاویہ شاستر

پونے: اسلم چشتی فرینڈس سرکل (ACFC) کے زیر اہتمام نئے سال کے پہلے ہفتے 4 جنوری کو ڈاکٹر منیب حنفی کے اعزاز میں بزرگ و مشہور شاعر رفیق جعفر کی صدارت میں شعری نشست منعقد ہوئی۔ درس و تدریس سے تعلق رکھنے والی مشہور شخصیات شیخ فیاض الدین (جالنہ) اور یوسف جمیل (امراوتی) مہمانِ خصوصی تھے۔ اسلم چشتی نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ اس کے ساتھ ہی پونے کے بزرگ وصاحب عروض شاعر سید آصف کی فنِ عروض پر لکھی ہوئی کتاب 'اردو کاویہ شاستر' کی رسمِ اجرا رفیق جعفر کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کتاب کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کرتے ہوئے رفیق جعفر نے کہا کہ یہ کتاب ہندی میں شائع ہوئی ہے لیکن اس میں اردو عروض کے قواعد پر بات کی گئی ہے۔ آسانی سے بحر، اوزان اور تقطیع کے اصول سمجھائے گئے ہیں۔ ہندی میں جو لوگ غزل لکھ رہے ہیں یہ کتاب ان کی رہبری کرے گی اور یہ اُردو میں شائع ہو تو مبتدی شعرا اس سے فیضیاب ہوں گے۔ سید آصف نے (ACFC) کا شکریہ ادا کیا اور اعلان کیا کہ اسے اردو رسم الخط میں بھی عنقریب شائع کیا جائے گا۔

پریس ریلیز، اسلم چشتی، پونے 10 جنوری 2013

رانچی میں دو کتابوں اور بلیٹن کا اجرا

رانچی: مشہور افسانہ نگار اور نقاد ڈاکٹر ش اختر کی دو کتابوں 'شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی تنقید' اور 'جھارکھنڈ میں اردو تنقید' اور 15 روزہ نیوز بلیٹن 'کہاں ہم لوگ' کا اجرا

مورخہ 21 جنوری 2013 کو سنگم گارڈن، مورابادی میں ہوا۔ اس موقعے پر سابق نائب وزیر اعلیٰ جناب سدیش کمار مہتو نے کہا کہ ''ادب اور سیاست کا گہرا رشتہ ہونا چاہیے۔ ادیب رہنما ہوتا ہے۔ ادب رہے گا تبھی سیاست بچے گی۔'' رانچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ایل این بھگت

نے کہا کہ ''آج عجیب حالات بنے ہوئے ہیں۔ انھیں مین اسٹریم سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے فرائض کو صحیح طریقے سے انجام دینے کی ضرورت ہے اور یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ کہاں ہیں ہم لوگ۔ تبھی سماج بہتر بن سکے گا۔ جناب آنند بھوشن نے کہا کہ ''سماج کو نئی طاقت کی ضرورت ہے'' ڈاکٹر ش اختر نے کہا کہ ''اب تمام دانشور ایک ہوجائیں تبھی ملک وقوم کی ترقی ممکن ہے۔ تقریب کی صدارت جناب شرون کمار گوسوامی نے اور نظامت ڈاکٹر ریتا شکل نے کیا۔ رسم شکریہ ڈاکٹر سرور ساجد نے ادا کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر بی کے چاند، بہادر سنگھ، دیوشرن بھگت، بین چوبے، ڈاکٹر صدیق محبی، ڈاکٹر احمد سجاد، ڈاکٹر ابوذر عثمانی، ڈاکٹر یوسف اختر، ڈاکٹر منظر حسین، ڈاکٹر ظفر آغا، ڈاکٹر حسن مثنیٰ، ڈاکٹر جمشید قمر، ایم زیڈ خان، عالمگیر ساحل وغیرہ موجود تھے۔

پریس ریلیز، عالم گیر ساحل، رانچی، 24 جنوری 2013

جھارکھنڈ کا اردو پورٹل عالمی پرواز

جمشید پور: ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے یہاں ایک سفید کبوتر اڑا کر عالمی پرواز پورٹل کا افتتاح کیا جس کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ جھارکھنڈ میں اردو کا پہلا اور واحد پورٹل ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ (یوپی) نے افتتاح کرتے ہوئے کہا ''عالمی پرواز، جھارکھنڈ سے شروع ہونے والا اردو کا واحد پورٹل ہے۔ یہ جمشید پور اور جھارکھنڈ کے لوگوں کے لیے بہترین پلیٹ فارم ہے۔'' انھوں نے پورٹل کی اہمیت اور اس کی جامع افادیت پر بھی روشنی ڈالی، دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو کا اپنا ایک انفرادی پورٹل کو وقت کی اہم ضرورت بتایا۔ مہمانِ ذی وقار اسلم بدر نے بھی اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔ نظامت کے فرائض جمشید پور کے مشہور شاعر جناب گوہر عزیز نے انجام دیے۔ مہتاب عالم پرویز (بانی 'عالمی پرواز') اور نغمہ ناز مکتومی (ایڈیٹر 'عالمی پرواز') نے گھونسلے اور سفید کبوتر کی شبیہ پیش کرکے جہاں ایک طرف پورٹل کو معنویت عطا کی وہیں سامعین حضرات کو حیرت میں ڈال دیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، 4 فروری 2013

پہلا قدم

لکھنؤ: ریاست کے وزیر صحت وکنبہ بہبود احمد حسن نے یہاں کہا ہے کہ محمد علی ساحل کی شاعری میں ایمانداری کی جھلک ملتی ہے اور یہ پولیس محکمہ کے لوگوں کے لیے ایک مثال ہے۔ وزیر صحت جناب حسن لکھنؤ میں ڈی آئی جی رینج کے پی ایس محمد ساحل کے شعری مجموعہ کلام 'پہلا قدم' کی رونمائی کررہے تھے۔ آل مائٹی مانٹیسری اسکول کے زیراہتمام بھارتیہ ناٹیہ اکادمی گومتی نگر لکھنؤ میں منعقد شعری مجموعے 'پہلا قدم' کا اجرا کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ محمد علی ساحل کا تعلق پولیس محکمہ سے ہے لیکن ان کے اندر کی ایمانداری ان کی شاعری سے ظاہر ہوتی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 جنوری 2013

جامعہ اردو کی میگزین 'ادیب'

علی گڑھ: جامعہ اردو علی گڑھ کی تاریخی میگزین سہ ماہی 'ادیب' کا اجرا ممتاز ادیب فیروز بخت جامعہ اردو کیمپس میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ اردو علی گڑھ کی سنہری تاریخ ہے اور اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں جونمایاں رول ادا کیا ہے وہ اردو زبان کی تاریخ کا روشن باب ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اردو ادب کے ہر شائق کو سہ ماہی ادیب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے او ایس ڈی مسٹر فرحت علی خاں نے حاضرین کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ سہ ماہی ادیب ایک مدت سے اپنی اشاعت سے محروم تھا جسے جامعہ اردو علی گڑھ کی موجودہ انتظامیہ نے ازسرنو شروع کیا ہے اور توقع ہے کہ مستقبل میں یہ میگزین معیار کی نئی منازل طے کرے گا۔ حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جامعہ اردو علی گڑھ کے ڈائرکٹر جسیم محمد نے کہا کہ سہ ماہی ادیب کی ترتیب میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ میگزین میں ایسا مواد شامل کیا جائے جو نہ صرف طلبا کی معتبر رہنمائی کرسکے بلکہ دیگر قارئین کے لیے بھی سودمند ثابت ہو۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 30 جنوری 2013

آتش رفتہ کا سراغ

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے سربراہ ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے یہاں عالمی کتاب میلے میں مشرف عالم ذوقی کی تازہ تخلیق 'آتش رفتہ کا سراغ' کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ ذوقی نے اپنے غور وفکر کا دائرہ وسیع

کرتے ہوئے اپنے ٹارگٹ قاری کو جس طرح شامل معاملات کیا ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ مشرف عالم ذوقی کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ قنوطیت کے ماحول میں بھی رجائیت کا پہلو نکال لیتے ہیں اور وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آتش رفتہ کا سراغ بھی اس روایت کو آگے بڑھائے گا۔ اس موقعے پر روزنامہ جدید خبر کے مدیر معصوم مرادآبادی، شاعر نعمان شوق اور انجم عثمانی نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 6 فروری 2013

سمیعہ نسیم کے دو شعری مجموعے جاری

پٹنہ: عوامی اردو نفاذ کمیٹی بہار کے زیراہتمام اردو بھون میں بہار کی معروف شاعرہ سمیعہ نسیم کے دو شعری مجموعوں 'حرف دل' اور 'خوشبوئے وفا' کی رسم اجرا مشہور شاعر پدم شری ڈاکٹر کلیم احمد عاجز کے ہاتھوں انجام پائی۔ مہمان خصوصی پٹنہ ہائی کورٹ کے سینئر جج سید شاہ نیر حسین نے کہا کہ سمیعہ نسیم کی شاعری دل کو چھونے والی ہے۔ بہار کے معروف صحافی اشرف استھانوی نے محبان اردو سے اپیل کی کہ وہ محترمہ سمیعہ نسیم سے سبق لیں اور اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم ضرور دیں، گھروں میں اردو کا ماحول قائم کریں، ایک اردو روزنامہ، ایک ہفتہ وار اور ایک ماہنامہ اردو کا رسالہ ضرور خریدیں۔ اردو میں گفتگو کریں اور گھریلو تقاریب میں اردو کو ضرور شامل کریں۔ اس لیے کہ اردو میں ہی ہماری تہذیب، ہمارا تمدن اور ہمارا مذہبی سرمایہ محفوظ ہے۔ مہمان ذی وقار پروفیسر علیم اللہ حالی نے بھی اظہار خیال کیا۔

پریس ریلیز، اشرف استھانوی، 10 فروری 2013

خواب نگر

حیدرآباد: سردار سلیم ایک ایسی مقناطیسی کشش رکھنے والا شاعر ہے جسے ہر مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ پسندیدگی اور محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس خیال کا اظہار سکریٹری اردو اکادمی آندھرا پردیش پروفیسر ایس اے شکور نے ممتاز نوجوان شاعر، ادیب، صحافی اور تنقید نگار سردار سلیم کی چوتھی شعری تصنیف 'خواب نگر' کی اردو گھر مغلپورہ میں منعقدہ رسم اجرا تقریب میں کیا۔ جلسے کی صدارت ممتاز بزرگ شاعر مضطر مجاز نے کی۔ پروفیسر وہاب قیصر اور پروفیسر خالد سعید نے سردار سلیم کے ہمہ جہت تخلیقی افکار کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ ڈاکٹر فاروق شکیل نے اپنے مضمون میں کہا کہ سردار سلیم تلمیذ الرحمٰن ہے جس کی اعلیٰ علمی وادبی صلاحیتوں کا ایک زمانہ قائل ہے۔ مضطر مجاز نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ سردار سلیم کی شاعری میں جذبوں کی فراوانی ہے۔ ممتاز افسانہ نگار مظہر الزماں خان کا لکھا ہوا مضمون سیپ میں سمندر ناظم جلسہ اسد ثنائی نے پڑھ کر سنایا۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 17 جنوری 2013

'نوادرات'

حیدرآباد: نذیر نادر کی شاعری میں مذہبی نور اور عصری شعور کا سحر انگیز امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان تاثرات کا اظہار مولانا محمد عبدالعلیم کوثر القاسمی سینئر صدر الجنۃ العلما اے پی نے اقلیم ادب حیدر آباد کے زیر اہتمام منعقدہ نذیر نادر کی تصنیف 'نوادرات' کی تقریب رسم اجرا سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ رحمٰن جامی نے اپنے خطاب میں کہا کہ نذیر نادر میں بلا کی زود گوئی ہے۔ مسعود جاوید ہاشمی نے کہا کہ شاعری کی اصل نظم ہے اور نذیر نادر ایک بہترین نظم گو شاعر ہیں اس کے باوجود انھوں نے کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ شفیع اقبال مدیر ماہنامہ پروانہ دکن نے کہا کہ نذیر نادر کی شاعری 'لب ورخسار' کی شاعری نہیں بلکہ بامقصد شاعری ہے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 17 جنوری 2013

غزالانِ حرم

کولکاتہ: کولکاتہ کتاب میلے میں اخبار مشرق کے بک اسٹال پر مشتاق دربھنگوی کی کتاب 'غزالانِ حرم' کی رسم اجرا ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا کے ہاتھوں ہوئی۔ اپنی مختصر سی تقریر میں ڈاکٹر حنا نے کہا کہ مشتاق دربھنگوی ایک جنون کا نام ہے۔ ان کی جگہ دوسرا شخص ہوتا تو ایسی نادر کتاب شاید منظر عام پر نہ آتی۔ کتاب اور صاحب کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر عقیل احمد عقیل نے کہا کہ یہ ان کی 12 ویں کتاب ہے۔ گزشتہ سال انھوں نے 'جانِ غزل' کے نام سے شاعرات کی غزلوں کا انتخاب پیش کیا تھا جس میں ملک و بیرون ملک کی 232 شاعرات کی غزلیں شامل تھیں جسے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ آج جس کتاب کا اجرا ہوا ہے وہ شاعرات کا حمدیہ انتخاب ہے۔

پریس ریلیز مشتاق دربھنگوی، 11 فروری 2013

وفیات:

پروفیسر سید امین اشرف

پٹنہ: مظہر امام، شہریار، شفیق فاطمہ شعریٰ اور مغنی تبسم کے بعد جدید اردو شاعری کی پہلی صف کے نمائندہ شاعر سید امین اشرف کا 7 فروری کو علی گڑھ میں دل کا دورہ پڑنے سے تقریباً ڈیڑھ بجے دن میں انتقال ہوا۔ علی گڑھ سے جیسے ہی سید امین اشرف کی وفات کی خبر عظیم آباد پہنچی، شعرا و ادبا کے بیچ صفِ ماتم بچھ گئی۔ یہ اتفاق ہے کہ بہار کے درجنوں اہل قلم سے ان کے براہ راست تعلقات تھے۔ اس وجہ سے سب نے ان کی موت کو اپنا ذاتی غم تصور کیا۔ کالج آف کامرس، پٹنہ کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر صفدر امام قادری نے اپنے تعزیتی پیغام میں سید امین اشرف سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کتنے خلیق، محبت دار اور عزیزوں کے لیے سایۂ شفقت بچھانے والے فن کار تھے۔ انگریزی کے استاد تھے اور طویل مدت تک علی گڑھ مسلم یونی ورسیٹی میں انھوں نے انگریزی زبان وادب کی درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ علی گڑھ میں نئے لکھنے والوں کا وہ مرکز تھے۔ ان کا تخلیقی سلسلہ ہنوز جاری تھا اور ان کا نیا کلام جگہ جگہ دیکھنے کو مل جاتا تھا ڈاکٹر قادری نے بتایا کہ علی گڑھ میں ان دنوں نمائش کی گہما گہمی ہے۔ 7 فروری کو دوپہر کے کھانے پر انھوں نے ایک ہوٹل میں علی گڑھ کے چار پانچ ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کر رکھا تھا۔ گھر سے وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ ہوٹل کے لیے نکلے۔ راشد انور راشد سے شعبۂ اردو سے براہ راست ہوٹل پہنچ کر دعوت میں شریک ہونے کی گزارش کی۔ ہوٹل پہنچتے ہی طبیعت مضمحل ہوئی اور گاڑی میں واپس بٹھائے گئے۔ عارضۂ قلب نے آخری حملہ کیا تھا۔ اسپتال پہنچے لیکن تب تک خدا نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ فون پر طارق چھتاری نے بتایا کہ خاموش دل کا دورہ تھا اور ایک لمحے میں ہی اردو کا یہ کلاسیکی جدید شاعر اور خانقاہِ اشرفیہ کا صوفی مزاج بزرگ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا۔

پریس ریلیز، صفدر امام قادری، پٹنہ، 7 فروری 2013

ممبئی: اردو ٹائمز ممبئی کے ادبی مدیر ندیم صدیقی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق پروفیسر امین اشرف 10 جولائی 1930 کو پیدا ہوئے تھے۔ وہ کچھوچھہ شریف کے مشہور صوفی خاندان کی ایک ممتاز شخصیت سید حبیب اشرف کے فرزند ارجمند تھے۔ پروفیسر سید امین اشرف نے ابتدائی تعلیم کچھوچھہ کے ایک مدرسے میں حاصل کی اور پھر انھیں لکھنؤ کی مشہور درس گاہ 'فرنگی محل' میں داخل کیا گیا۔ جہاں وہ اپنے والد کی ناگہانی رحلت کے سبب اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ عملی زندگی ایک لائبریرین کی حیثیت سے شروع کی اور جدید تعلیم سے بھی خود کو آراستہ کیا۔ انھوں نے گریجویشن کرنے کے بعد ایم اے ہی نہیں بلکہ انگریزی لٹریچر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی لی اور پھر اپنی اسی مادرِ علمی اور دانش گاہ میں انھوں نے پڑھایا بھی۔ ان کی پی ایچ ڈی کے مقالے کا بنیادی موضوع 'سروجنی نائیڈو کی شاعری' تھا۔ پروفیسر سید امین اشرف کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جادہ شب (2000)، بہار ایجاد (2007)، قفس رنگ (2011)، ان کے مضامین کا بھی ایک مجموعہ 'برگ و بار' کے نام سے (2012) چھپ چکا ہے اور ان کے فکر وفن پر بھی ایک کتاب 'میزانِ حرف' منظر عام پر آچکی ہے۔ سید امین اشرف نظم اور غزل کے اعلیٰ درجے کے تجزیہ نگار بھی تھے۔ پروفیسر سید امین اشرف کو اترپردیش اردو اکادمی سے 2007 اور پھر 2010 میں ان کے شعری مجموعوں کے حوالے سے انعام بھی دیا گیا۔ علی گڑھ کی میکش اکادمی نے بھی انھیں 'میکش ایوارڈ' سے سرفراز کیا۔ نیز 2011 میں مرحوم کو غالب ایوارڈ (دہلی) بھی تفویض کیا گیا۔ مرحوم کی اہلیہ اُم ہانی اشرف عبداللہ ویمنز کالج (مسلم یونیورسٹی) کے شعبۂ اردو میں استانی اور ایک اچھی ادیبہ اور کئی کتابوں کی مصنفہ بھی ہیں۔ مرحوم سید امین اشرف کو اللہ نے اولاد کی نعمت میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں دیں۔ رضائے الٰہی سے ایک بیٹا سید حمید اشرف 1993 میں ایک سڑک حادثے کے نتیجے میں انتقال کرگیا۔ مرحوم کی ایک حالیہ غزل کا یہ شعر ذہن کے اسکرین پر نمودار ہوا اور ہمیں مزید افسردہ کرگیا:

غبارِ شام سے پھوٹی تھی روشنی، لیکن
فضا میں ڈوب گئی، ڈوبتی صدا کی طرح

پروفیسر سید امین اشرف کا جسد خاکی علی گڑھ سے کچھوچھہ شریف لے جایا گیا جہاں جمعہ 8 فروری کو بعد نماز عصر سپرد لحد کیا گیا۔ اس موقعے پر خاصی تعداد میں سوگواران موجود تھے۔

ڈی آر گوئل

نئی دہلی: "ڈی آر گوئل سیکولر ہندوستان کی علامتوں میں سے ایک تھے۔ ان کا سانحہ ارتحال ان تمام ہندوستانیوں کے لیے ایک بڑا خسارہ ہے جو اس ملک میں سیکولر اقدار کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ انھوں نے اپنی زبان وتحریر دونوں کو فرقہ واریت کے خلاف جدوجہد کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ پر ان کا کام انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ انھیں اردو، انگریزی، ہندی اور پنجابی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ وہ ایک اچھے استاد اور کامیاب صحافی تھے۔" ان خیالات کا اظہار پروفیسر اختر الواسع، ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور وائس چیئرمین دہلی اردو اکادمی نے ایک تعزیتی بیان میں کیا۔ ڈی آر گوئل کا انتقال 3 فروری کی شام کو مختصر علالت کے بعد لودھی روڈ پر واقع ان کی رہائش گاہ پر ہوگیا۔ 4 فروری کی صبح ان کی آخری رسوم ادا کی گئی۔ جناب ڈی آر گوئل کی پیدائش 1929 میں موگا، پنجاب میں ہوئی تھی۔ وہ پیشے سے صحافی تھے اور صحافت میں داخلے سے قبل کئی برس تک کروڑی مل کالج میں انگریزی ادب کے استاد رہے۔ ان کے مضامین

ٹائمس آف انڈیا اور ہندوستان ٹائمس جیسے اہم انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو سے ان کی بے شمار تقریریں نشر ہوئیں۔ انھوں نے مین اسٹریم اور سیکولر ڈیموکریسی جیسے موقر جرائد کی ادارت کی جو اردو میں بھی شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے اردو سمیت مختلف زبانوں میں درجنوں کتابیں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ کشمیر، انڈین ورژن آف فاشزم اور راشٹریہ سویم سنگھ انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ ڈی آر گوئل آر ایس ایس میں باقاعدہ شامل رہ چکے تھے مگر بعد میں انھوں نے اس سے علاحدگی اختیار کر لی اور مشہور مجاہد آزادی مسز سبھدرا جوشی کے ساتھ مل کر انھوں نے سامپردایکتا ورودھی مورچہ کے نام سے سیکولر تحریک چلائی۔

پریس ریلیز، ذہین اختر ندوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 7 فروری 2013

پروفیسر شمس تبریز

لکھنؤ: فارسی و اردو ادب کے معروف اسکالر اور شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر شمس تبریز کا سنیچر کو اچانک انتقال ہوگیا۔ انھیں دل کا دورہ پڑا تھا، مرحوم کی عمر تقریباً 62 سال تھی۔

مرحوم دیوبند کے فاضل تھے اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلما میں ریسرچ فیلو کی حیثیت سے کئی سال کام کیا جہاں انھوں نے کئی اہم کتابیں لکھیں اور کتابوں کے ترجمے بھی کیے جس میں تاریخ ندوہ اور نقوش اقبال (ترجمہ روائع اقبال) خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ پروفیسر شمس تبریز 1987 میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی سے وابستہ ہوئے تھے۔ عربی زبان وادب کی تدریس کے ساتھ انھوں نے تحقیق وتصنیف کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ مرحوم کا آبائی وطن بھوجپور (بہار) ہے۔ علمی حلقہ ان کی صلاحیتوں کا قائل تھا۔ انھیں عربی ادب کی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ 4 بیٹے اور 4 بیٹیاں شامل ہیں۔ شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کے سابق و موجودہ اساتذہ نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی اچانک موت پر شدید رنج وغم کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 جنوری 2013

پروفیسر ولی الحق انصاری

لکھنؤ: عالمی شہرت یافتہ ادیب ومحقق ڈاکٹر ولی الحق انصاری کا 28 جنوری کو پیر کی دوپہر یہاں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 88 سال تھی۔ دن میں تقریباً پونے دو بجے اپنے آبائی مکان دارالامان فرنگی محل میں انھوں نے آخری سانس لی۔ پروفیسر ولی الحق انصاری لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے تھے۔ فارسی، اردو اور انگریزی میں ڈیڑھ درجن سے زائد ان کی تصنیفات ہیں۔ ان کی مشہور کتاب 'کلیات عرفی' ہے جسے تہران یونیورسٹی نے تین جلدوں میں شائع کیا۔ دیگر کتابوں میں شاہدان معانی، شعلۂ ادراک، غزالان خیال، فروغ شعلۂ دل، نقوش زیبا، کہکشاں، خرمن گل اور شب چراغ شامل ہیں۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ فارسی زبان کی خدمات کے لیے انھیں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ اس کے علاوہ ایرانی حکومت نے انھیں شادی ایوارڈ سے نوازہ جب کہ یوپی اردو اکادمی نے اردو زبان کی خدمات کے لیے ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 جنوری 2013

سعید الحسن نقوی

کانپور: کانپور کے مشہور صحافی و ماہر معاشیات سعید الحسن نقوی نے منگل کی دوپہر گیارہ بجے طویل علالت کے بعد 79 سال کی عمر میں دارفانی کو الوداع کہتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم اردو، ہندی اور انگریزی زبان کے مشہور صحافی ہونے کے ساتھ تقریباً 15 سالوں تک کانپور پریس کلب میں صدر کے عہدے پر فائز رہے۔ شہر کی معاشی صورت حال کو صحافت کے ذریعے عوام الناس کے سامنے لانے کا آغاز جہاں آپ نے اپنی قلم سے کیا وہیں آپ شہر وملک کے مشہور اخبارات قومی آواز، جاگرن، سیاست، پیٹریٹ، بلٹس اور دینک آج وغیرہ اپنی بیباک صحافت کے ذریعے سماج کو آئینہ دکھانے کا کام کیا۔ اس کے علاوہ بی بی سی لندن، آل انڈیا ریڈیو وغیرہ سے بھی آپ کے نصیحت آمیز خطاب نشر کیے گئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جنوری 2013

قومی اردو کونسل کے نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحی کو صدمہ

نئی دہلی: نہایت افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ قومی اردو کونسل کے رسالے 'اردو دنیا' اور 'فکر وتحقیق' کے نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحی کے والد کا 22 جنوری، 2013 کو شام 5:40 منٹ پر انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ساٹھ سال تھی۔ انھیں گزشتہ 16 جنوری کو برین ہیمرج کے بعد انسٹی ٹیوٹ آف نیوروسائنسیز، کولکاتا میں داخل کیا گیا تھا، ان کی تدفین 23 جنوری 2013 کو بعد نماز ظہر ان کے آبائی وطن بھدریہ، سولیباٹا، گیا (بہار) میں عمل میں آئی۔

12 جون 1952 کو پیدا ہوئے مرحوم گزشتہ برس مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے عہدے کی ذمے داری سے سبکدوش ہوئے تھے، انھیں ریاستی حکومت نے بہترین ٹیچر کے اعزاز (ایوارڈ) سے نوازہ تھا۔ حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ہی انھوں نے BUMS کی سند بھی حاصل کی تھی اور طبی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ مسلسل کئی سال رمضان میں قرآن بھی سنایا۔ مرحوم نے سنسکرت میں ایم اے کیا تھا، اردو زبان و ادب سے خاصا لگاؤ تھا، انھوں نے مختلف موضوعات پر اردو، ہندی اور انگریزی کی کتابوں پر مشتمل ایک ذاتی لائبریری بھی قائم کر رکھی تھی۔ اللہ پسماندگان کو صبر جمیل اور مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین۔

پریس ریلیز 'ادارہ' 23 جنوری 2013

خراج عقیدت:

کلام حیدری کی برسی

پٹنہ: اردو کے ممتاز افسانہ نگار، صحافی اور ناقد کلام حیدری کے 20ویں یوم وفات (3 فروری 2013) کے موقع پر ان کی حیات وخدمات پر شایانِ شان مذاکرے کا اہتمام اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے ذریعے کیا گیا۔ سابق صدر شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی پروفیسر علیم اللہ حالی نے کلام حیدر کی افسانہ نگاری کی فکر، فن اور فلسفے پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک سے جڑی کلام حیدر کی فکر اور اس کے فنی اظہار کے حوالے سے کہا کہ کلام حیدری صرف افسانہ نگار ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے صحافت کے ذریعے بھی قوم وملت کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ڈاکٹر قاسم خورشید اور پروفیسر منظر اعجاز نے بھی خراج عقیدت پیش کیا۔ پروگرام کا آغاز ڈائرکٹر راج بھاشا جناب راگھویندر جھا نے شمع روشن کر کے کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ہماری کوشش تبھی کامیاب ہوسکتی ہے جب اردو سے محبت کرنے والے ہماری خاطر خواہ معاونت کریں۔ انھوں نے بتایا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام شائع ہونے والا سہ ماہی مجلّہ 'بھاشا سنگم' پابندی سے اردو داں طبقے تک پہنچے اس کے لیے ہم پوری طرح کوشاں ہیں۔

پریس ریلیز قاسم خورشید پٹنہ، 5 فروری 2012

□

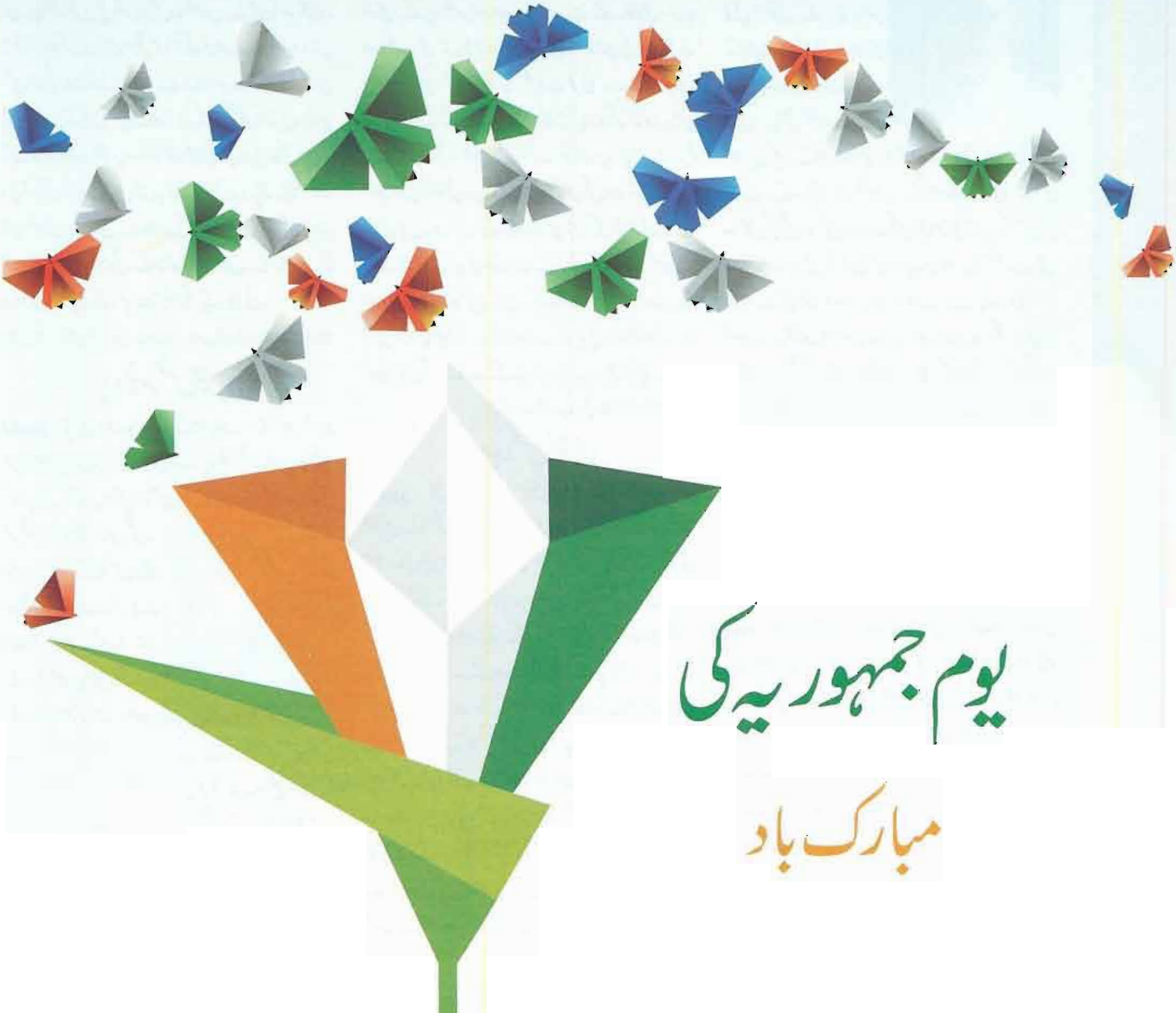

یوم جمہوریہ کی

مبارک باد

محترمہ شیلا دیکشت
وزیر اعلیٰ، دہلی

شعبہ اطلاعات ونشریات
— قومی راجدھانی خطہ، حکومت دہلی —

DIP/1970/2012-13